میوات کا سفر

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

Mewat Ka Safar
by Maulana Wahiduddin Khan

First published 1988
Reprinted 2014
This book is copyright free.

Goodword Books
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013
Tel. +9111-4182-7083, Mob. +91-8588822672
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Goodword Books, Chennai
324, Triplicane High Road,
Triplicane, Chennai-600005
Tel. +9144-4352-4599
Mob. +91-9790853944, 9600105558
email: chennaigoodword@gmail.com

Goodword Books, Hyderabad
2-48/182, Plot No. 182, Street No. 22
Telecom Nagar Colony, Gachi Bawli, Hyderabad-500032
Mob. 9448651644
email: hyd.goodword@gmail.com

Printed in India

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست

تمہید	صفحہ ۵
پہلا سفر	۹
دوسرا سفر	۲۷
تیسرا سفر	۴۴
چوتھا سفر	۵۲
پانچواں سفر ۔ ۱	۷۵
پانچواں سفر ۔ ۲	۹۰
چھٹا سفر	۱۱۴
ساتواں سفر	۱۱۸
آٹھواں سفر	۱۲۷
نواں سفر	۱۳۱
دسواں سفر	۱۳۹
گیارہواں سفر	۱۴۹
بارہواں سفر	۱۶۱
تیرہوں سفر	۱۶۹
چودھواں سفر	۱۸۱
پندرھواں سفر	۱۸۸
سولہواں سفر	۱۹۵
سترہواں سفر	۲۰۶

تمہید

دہلی کے جنوب میں کوہ اروِلی اور شوالک پہاڑیوں کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں جن کی سب سے زیادہ اونچائی ۲۵۴۲ فٹ تک ہے۔ یہ پہاڑی سلسلے الور، بھرت پور، گوڑگاؤں اور متھرا کو ملا کر ایک الگ جغرافیہ بناتے ہیں۔ اسی جغرافی ٹکڑے کا نام میوات ہے۔ اور یہیں وہ قوم بستی ہے جس کو میو کہتے ہیں۔ ۱۹۰۱ کی مردم شماری کے مطابق قدیم راجپوتانہ کی اٹھارہ ریاستوں میں سے تیرہ میں میو قوم آباد تھی اور اس کی آبادی تقریبًا چھ لاکھ تھی۔ آزادی کے بعد ۱۹۶۱ کی مردم شماری کے مطابق میو قوم کی آبادی ہریانہ میں تقریبًا دو لاکھ اور راجستھان میں تین لاکھ (= ۵ لاکھ) ہے۔ اس کے علاوہ میو قوم یوپی کے بعض اضلاع اور گوالیار، بھوپال اور مالوہ میں بھی آباد ہے۔

میو قوم اس علاقہ میں تقریبًا دو ہزار برس سے آباد چلی آرہی ہے۔ یہاں اسلام کی تبلیغ کا کام صدر اول ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ چودھری محمد اشرف خاں صاحب کی تحقیق کے مطابق ۱۰۰۲ میں محمود غزنوی کے عزیز سالار سید محمود غازی نے اس علاقہ کی طرف خصوصی توجہ کی۔ ان کی اور ان کے خلفاء کی کوششوں سے اس قوم کا بڑا حصہ مسلمان ہو گیا۔

میو قوم اپنی بدوی زندگی کی وجہ سے ہمیشہ سے ایک نہایت بہادر اور محنتی قوم رہی ہے۔ اخلاقی اوصاف میں بھی وہ بہت بلند تھی۔ جس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کے ہیجانی زمانہ میں جب کہ میو قوم کو انتہائی وحشیانہ سلوک کا سامنا کرنا پڑا، اس نے دوسری قوم کی عورتوں کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ حالانکہ ان کے ساتھ ایسے بہت سے واقعات پیش آئے۔

آزادی کے بعد ۱۹ دسمبر ۱۹۴۷ کو مہاتما گاندھی میوات (گھاسیڑہ) گئے تھے۔ وہاں انہوں نے کہا:

> "میو ایک لڑاکا قوم ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ میو ایک جرائم پیشہ قبیلہ سے ملتے جلتے ہیں۔ اگر یہ الزام صحیح بھی ہو تو پھر بھی گورنمنٹ ان کو ملک سے نہیں نکال سکتی ہے۔ ان حالات میں ٹھیک طریقہ یہ ہوگا کہ ان کی اصلاح کی جائے اور انہیں اچھا شہری بننے کی ترغیب دی جائے۔"
>
> میو قوم اور میوات۔ ۱۶۱

یہ بات جو گاندھی جی نے ۱۹۴۷ء میں کہی، یہی پچھلے ہزار برس سے میو قوم کے بارہ میں سب سے زیادہ صحیح بات تھی۔ مگر بدقسمتی سے اس راز کو جانا نہ جاسکا۔ خود میو اپنی جہالت اور بے شعوری کی وجہ سے یہ سمجھتے رہے کہ اپنے آپ کو آزاد کہلانا اور شاہانِ دہلی کی حکومت کو تسلیم نہ کرنا ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ دوسری طرف دہلی کے سلاطین نے یہ غلطی کی کہ میو قوم کا جو رویہ محض ان کی جہالت اور تہذیب سے دوری کی بنا پر تھا، اس کو انہوں نے "بغاوت" پر محمول کیا۔ مسلم سلاطین اگر میو قوم کو جہالت کا مسئلہ سمجھتے تو وہ سوچتے کہ اس بہادر قوم کی تمدنی، اقتصادی اور ذہنی حالت میں تبدیلی کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ وہ ملک کا ایک مفید عنصر بن سکے۔ اس کے برعکس سلاطین نے میو قوم کو بغاوت کا مسئلہ سمجھا۔ اس لیے یہ قوم ان کے لیے صرف سرکوبی کا موضوع بنی رہی۔

ناصر الدین محمود اور غیاث الدین بلبن نے اس قوم کا قتل عام کیا۔ فیروز شاہ تغلق نے فیروزپور جھرکہ میں اس پر قابو پانے کے لیے ایک فوجی چھاؤنی قائم کی۔ ۱۴۱۳ سے ۱۴۴۷ تک خاندان سادات کے بادشاہوں نے میوات پر بار بار حملے کیے۔ ۱۴۵۸ میں بہلول لودی نے میوات پر حملہ کیا۔ بابر نے فتح پور سیکری کی لڑائی سے پہلے میوات میں لوٹ مار کرائی۔ سلیم شاہ سوری کے زمانہ میں فیروزپور جھرکہ کے مقام پر لڑائیاں ہوئیں۔ اکبر نے علاقہ میوات پر حملے کرکے اس "آزاد علاقہ" کو فتح کیا۔ شاہجہاں نے میو قوم کی سرکوبی کے لیے کیسری سنگھ ولد جے سنگھ کو مقرر کیا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے ۷۲-۱۶۷۱ میں میوات میں باغی میوؤں کی سرکوبی کے لیے اقدامات کیے۔

اس طرح میو قوم اور دہلی کے بادشاہوں کے درمیان مسلسل جنگ جاری رہی۔ یہاں تک کہ وہ زمانہ آیا جب مسلمانوں کی حکومت ختم ہوگئی۔ اور وہ میو قوم جو اپنے آپ کو آزاد ثابت کرنے کے لیے دہلی کی سلطنت سے سیکڑوں برس تک جنگ چھیڑے ہوئے تھی، اب نئے جمہوری حالات کے نتیجہ میں مقہوریت کے اس مقام پر پہونچ گئی کہ اپنے ہنستے پڑوسیوں کے مقابلے میں بھی عزت اور خودداری کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔

مغل سلطنت کے خاتمہ کے بعد میوات میں مختلف افراد اور تحریکیں سرگرم عمل رہی ہیں۔ اور بلاشبہ انہوں نے اس علاقہ میں قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس قوم کے بعض بنیادی مسائل کے بارہ میں اب بھی اسی طرح غفلت ہورہی ہے جس طرح

سلاطین دہلی کے زمانہ میں ہو رہی تھی۔

الجمعیۃ ویکلی کی ادارت (۱۹۶۷ - ۷۴) کے زمانہ میں مجھے میوات جانے اور وہاں کے حالات کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ ان اسفار کی مفصل روداد یں الجمعیۃ میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ زیر نظر مجموعہ انھیں مضامین پر مشتمل ہے۔ ان مضامین اور رودادوں کی حیثیت اگرچہ اب زیادہ تر تاریخی ہو چکی ہے۔ تاہم اب بھی کئی اعتبار سے ان میں افادیت کے پہلو موجود ہیں۔ اس لیے ان کو موجودہ مجموعہ کی صورت میں شائع کیا جارہا ہے۔

میوات کے سفروں میں جو چیزیں میں نے دیکھیں، ان میں شاید سب سے عجیب چیز یہ تھی کہ دو گروہ ایک ہی جغرافیہ میں ایک دوسرے کے پڑوسی بن کر رہتے ہیں، مگر دونوں کا مزاج ایک دوسرے سے بالکل الگ ہے۔ یہ دو گروہ ہیں —— میو اور جاٹ۔

میوؤں کے مزاج میں عدم اطاعت ہے۔ وہ صدیوں سے ہر طاقت سے لڑتے رہے ہیں۔ کسی طاقت کی ماتحتی قبول کرنا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ان کے اسی مزاج کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۵۷ میں انگریزوں کے خلاف بغاوت ہوئی تو میو لوگ جوش و خروش کے ساتھ اس میں شریک ہو گیے۔ ایک میواتی مبصر کے الفاظ میں "میوؤں نے نہایت سختی سے مقابلہ کیا۔ اگر انگریزی فوج کے پاس آرٹیلری بندوقیں نہ ہوتیں تو اس کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا .... میو بہادری سے لڑے مگر کامیابی انگریزوں کو ہوئی۔ کیوں کہ ان کے پاس نئے اور بہتر قسم کے ہتھیار تھے اور میوؤں کے پاس صرف پرانے قسم کے ہتھیار تھے" میو قوم اور میوات، صفحہ ۱۴۳

میوؤں کا یہی مزاج ان کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ رہا ہے۔ وہ مسلم بادشاہوں سے لڑتے رہے۔ اس لیے مسلم بادشاہوں نے بار بار ان کی سرکوبی کے لیے سخت اقدامات کیے۔ انھوں نے انگریزوں سے لڑائی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مسلسل انگریزی عتاب کا شکار رہے۔ ان کے حصہ میں ہر دور کا نقصان آیا، کسی دور کا فائدہ ان کے حصہ میں نہ آسکا۔

صدیوں تک میوؤں کی ان ناکام لڑائیوں نے میوؤں کو اتنا کمزور کر دیا ہے کہ اب ان کے اندر کسی سے لڑنے کی طاقت نہیں۔ اب ان کی لڑائی کا مزاج صرف اپنوں کے خلاف ظاہر ہوتا ہے۔ دوسروں سے لڑنے کے لیے آدمی خواہ کتنا ہی کمزور ہو جائے مگر اپنوں سے لڑنے کے لیے وہ ہمیشہ طاقتور

رہنا ہے۔ نئے ہندستان میں میو اب اسی دوسرے معنی میں طاقت ور ہیں، اس کے سوا کسی اور معنی میں وہ طاقت ور نہیں۔

جاٹوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ جاٹ انھیں میووں کے پڑوس میں رہتے ہیں۔ مگر میوؤں کے برعکس، ان کے اندر ہم آہنگی اور حقیقت پسندی کا مزاج پایا جاتا ہے۔ ایک میو شاعر نے جاٹ کی نفسیات کو طنزیہ طور پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

جاٹ کہے سن جاٹنی یا ئی گاؤں میں رہنا　اونٹ بلیا لے گئی، ہاں جی ہاں جی کہنا

یعنی جاٹ نے اپنی بیوی سے کہا کہ ہم کو اسی گاؤں میں رہنا ہے　اس لیے ہم کو موافقت کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اگر گاؤں کا کوئی آدمی کہے کہ اونٹ کو بلی اٹھالے گئی تو اس سے بھی اختلاف نہ کرو، بلکہ کہو کہ ہاں صاحب ٹھیک ہے۔

میو شاعر نے یہ بات اگرچہ بطور طنز کہی ہے، مگر جاٹ اور میو کے مزاجی فرق کو بتانے کے لیے یہ بالکل درست ہے۔ اور اسی مزاجی فرق کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک گروہ کو نیا زمانہ ترقی کی طرف لے جا رہا ہے اور دوسرے فریق کو نئے زمانہ نے بربادی کے سوا کچھ اور نہیں دیا۔

وحیدالدین

۱۹ ستمبر ۱۹۸۷

پہلا سفر

میں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا کچھ لکھنے پڑھنے میں مشغول تھا کہ ایک جانا پہچانا چہرہ اندر داخل ہوا۔ رنگین تہمد کے اوپر سفید کرتا، ہاتھ میں جھولا، سر پر دوپلیا ٹوپی، چہرے پر سنجیدگی کی حد تک اخلاص نمایاں۔ یہ مولانا عبدالرحیم میواتی تھے جو ضلع گوڑگانوں کی جمعیۃ علماء کے ناظم اعلیٰ ہیں۔

ایک مخلص مسلمان سے ملاقات کسی بھی شخص کے لیے ہمیشہ خوشی کا باعث ہوتی ہے۔ مگر میں ان کو دیکھ کر قدرے گھبرا اٹھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ حسب معمول مجھ سے میوات چلنے کا تقاضا کریں گے۔ اور میں اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے ایسے کسی سفر کا وقت نہیں نکال سکتا تھا۔

" مجھے اس وقت دہلی میں کوئی کام نہیں تھا" مولانا عبدالرحیم صاحب نے سلام اور مصافحہ کے بعد کہنا شروع کیا " اصل میں میں گوڑگاوں آیا تھا۔ یہاں اس لیے آگیا کہ اگر آپ چلنے کے لیے آمادہ ہوجائیں تو اپنے ساتھ آپ کو میوات لے چلوں"۔

میں نے حسب معمول معذرت شروع کردی۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ میرا دل میری زبان کا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ میں جانتا تھا کہ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مگر یہ احساس دل پر چوٹ بن کر لگ رہا تھا کہ " تم ایک مخلصانہ دعوت کو کب تک ٹھکراتے رہوگے"۔ بالآخر اندرونی خلش غالب آئی اور میں نے میوات کے سفر کا ارادہ کرلیا۔ اب جب کہ سفر کی تکمیل کے بعد میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ یہ سفر گوناگوں وجوہ سے بے حد ضروری تھا۔ اور اس ضروری سفر کو جس چیز نے ممکن بنایا وہ صرف مولانا عبدالرحیم میواتی کا مخلصانہ اصرار ہے۔

۲ اپریل ۱۹۶۹ء کی صبح کو حسب قرارداد ٹھیک ۵ ½ بجے مولانا عبدالرحیم صاحب میرے کمرے میں موجود تھے۔ ان کے ساتھ مولانا نور محمد چندینی بھی آگئے تھے۔ فجر کی نماز سے فارغ ہوکر تین آدمیوں کا یہ قافلہ بذریعہ بس میوات کے لیے روانہ ہوگیا۔

ہماری پہلی منزل نوح تھی۔ نوح ضلع گوڑگاوں (ہریانہ) کا ایک قصبہ ہے، یہاں مولانا نیاز محمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ موصوف مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں اور مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پرانے ساتھیوں میں ہیں۔ ۱۳۶۲ھ میں دیوبند سے

فراغت کے بعد پانچ سال نظام الدین میں رہے۔ بعد کو مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مشورہ سے نوح میں آکر قیام فرمایا۔

"مولانا الیاس صاحب کی دعوت کے بارے میں کچھ بتائیے" میں نے سوال کیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے بتایا کہ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ مجھے دو چیزوں کو زندہ کرنا ہے:

۱۔ اول ترتیب قائم کرنا۔ **الاھم فالاھم** کے اصول پر دین میں جو چیزیں جس درجہ میں مطلوب ہیں اس کے لحاظ سے انہیں رواج دینا۔ مولانا یہ بھی فرماتے تھے کہ یہ ترتیب چھوٹی ہوئی چیزوں کے لحاظ سے قائم ہوگی۔

۲۔ دوسری چیز ہے طرز کو زندہ کرنا۔ مولانا کے نزدیک اس کا مطلب یہ تھا کہ صحابہ کے زمانے میں دین کو سیکھنے سکھانے کا جو طریقہ تھا، اس کو رائج کرنا، چونکہ صحابہ کرام چل پھر کر تبلیغی کام کرتے تھے اس لیے آپ نے بھی نقل وحرکت پر زور دیا۔

"غیر مسلموں میں تبلیغی کام کے سلسلے میں مولانا کا تصور کیا تھا" میں نے دریافت کیا۔ مولانا نیاز محمد صاحب نے بتایا کہ موجودہ تبلیغی کام کو وہ غیر مسلموں میں دعوت دین کے کام کی تمہید سمجھتے تھے۔ مسلمان اس وقت اغیار کو دعوت دینے کے اہل نہیں ہیں۔ موجودہ تبلیغی کام سے ان میں استعداد پیدا ہوگی۔

نوح میں "بنگلہ والی مسجد" آزادی سے پہلے قصبہ کی سب سے زیادہ آباد مسجد تھی۔ یہ پورا محلہ مسلمانوں کا تھا۔ مگر تقسیم کے بعد تمام مسلمان یہاں سے چلے گئے۔ مسجد گدھوں اور بندروں کا اڈہ بن گئی۔ مولانا نیاز محمد صاحب جو جمعیۃ علماء ضلع گوڑگاؤں کے صدر بھی ہیں، انہوں نے یہاں آکر قیام کیا۔ مسجد کی صفائی کرائی، اس کی مرمت کی، اس سے ملحق زمین اس کے لیے حاصل کی اور مسجد کو آباد کیا۔ ۱۹۶۵ء سے یہاں ایک مدرسہ قائم کرکے دینی خدمات انجام دے رہے ہیں اس مدرسہ میں بچوں کی ابتدائی تعلیم اور درس نظامیہ کی تعلیم کا پورا انتظام ہے۔

نوح میں مسلمانوں کا ایک اسکول ہے جو برین میو ہائی اسکول کے نام سے مشہور ہے (برین اس علاقہ کا ایک انگریز افسر مال تھا) یہ اسکول ۱۹۲۳ء میں قائم ہوا۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ ۴۵ برس کا طویل عرصہ گزارنے کے باوجود اب تک وہ ہائی اسکول ہی پڑا ہوا ہے، ابھی تک وہ کالج کی سطح کو نہ پہونچ سکا جب کہ اسی مدت میں اس علاقہ کی جاٹ برادری نے میوؤں کی سی حالت سے آغاز

کر کے غیر معمولی تعلیمی ترقی حاصل کی ہے، اسی مدت میں ان کے یہاں کتنے نئے اسکول اور کالج بنے، اور کتنے اسکول کالج کے مقام کو پہونچ گئے۔" اس کی وجہ کیا ہے؟" میں نے میو اسکول کے ایک استاد سے پوچھا۔

"رہنما کا نہ ہونا" یہ ان کا مختصر جواب تھا۔ مزید افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس واحد مسلم اسکول میں بھی، جہاں ساڑھے پانچ سو طالب علم تعلیم حاصل کر رہے ہیں، غیر مسلم طلبہ کی تعداد ۶۵ فی صد اور مسلم طلبہ کی ۳۵ فی صد ہے، جب کہ مسلم طلبہ کے لیے یہاں کثرت سے رعایتیں فراہم کی گئی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ مسلمان طلبہ کثرت سے یا تو تھرڈ ڈویژن لاتے ہیں یا فیل ہو جاتے ہیں اس کے برعکس غیر مسلم طلبہ فرسٹ اور سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہوتے ہیں

یہ اس اسکول کا حال ہے جو ۵ لاکھ میواتیوں کے درمیان غالباً واحد مسلم اسکول ہے۔

قصبہ نوح کی بلندی پر کھڑے ہو کر مغرب کی سمت نظر ڈالیں تو دور پہاڑی کے دامن میں ایک سفید عمارت نظر آئے گی۔ یہ خواجہ شیخ محمد موسیٰ (م ۷۳۳ھ) کی درگاہ ہے۔ موصوف ساتویں صدی ہجری کے آخر اور آٹھویں صدی کے آغاز میں اس علاقہ کے مشہور مصلح گزرے ہیں۔ کہتے ہیں کہ خواجہ صاحب کا تعلق شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی سے ہے۔ یہاں عرصہ تک سالانہ عرس بڑے تزک و احتشام سے ہوتا رہا۔

یہ درگاہ عرصہ سے غیر آباد تھی۔ مجھے لوگوں نے بتایا کہ ۱۹۶۷ء میں گور درشن سنگھ نامی ڈی۔ ایم نوح میں آیا جو اب روپڑ میں ڈپٹی کمشنر ہے۔ اس نے دیکھا کہ درگاہ کی شکل میں ایک عظیم الشان عمارت ہے جو خالی پڑی ہوئی ہے اور جس کا واحد مصرف اب یہ رہ گیا ہے کہ جانور اس میں غلاظت کرتے رہیں۔

گور درشن سنگھ نے مسلمانوں کو غیرت دلائی کہ تمہارا ایک پوتر استھان اس طرح برباد ہو رہا ہے اور تم لوگ اس کو آباد نہیں کرتے۔ اس نے مزید کہا کہ اگر تم لوگوں نے اسے آباد نہ کیا تو ہم اس میں کوئی سرکاری دفتر قائم کر دیں گے۔ یہ تنبیہ کارگر ہوئی۔ مولانا نیاز محمد صاحب اور دوسرے لوگوں نے اس کی ذمہ داری قبول کر لی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ درگاہ جو جنگلی جانوروں کا مسکن بن چکی تھی۔ اب دوبارہ انسانی آبادی میں تبدیل ہو گئی ہے۔

اس درگاہ کو دیکھنا ضروری تھا، چنانچہ نور محمد صاحب جندینی کے ساتھ سائیکل پر روانہ ہوا

ہم ہوڈل مدیواڑی روڈ (زیر تعمیر) پر مغرب کی طرف بڑھ رہے تھے، ہمارے پیچھے حد نظر تک پھیلے ہوئے اونچے نیچے میدان تھے، جن پر جگہ جگہ کیکر کے درخت اپنی ہری ہری شاخوں سے سایہ کیے ہوئے نظر آتے تھے، اور سامنے ارولی پہاڑوں کا خاموش سلسلہ تھا، جو شمال سے جنوب تک اس طرح پھیلا ہوا تھا جیسے تاریخ کی کوئی ابھری ہوئی لکیر ہے جس پر امتداد زمانہ سے گرد پڑگئی ہے۔ اس پہاڑی میں اس قدیم سڑک کے خم دار نشانات نظر آرہے ہیں جس کے متعلق مشہور ہے کہ شیر شاہ سوری نے اسے بنوایا تھا۔ اسی پہاڑ کے دامن میں وہ درگاہ بھی اپنی بلند اور وسیع عمارت کے ساتھ نظر آرہی ہے جس کے سفید گنبد پہاڑ کی بھوری دیواروں کے پس منظر میں اس طرح نمایاں ہیں جیسے تاریک دنیا میں روشنی کا کوئی مینار جگمگا رہا ہو۔

خواجہ شیخ محمد موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ درگاہ وسیع اور عظیم عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے جو آج بھی اسلام کی عظمت رفتہ کو یاد دلاتی ہے اور اسی کے ساتھ حال میں اس کے امکانات کو بھی۔ یہاں شیخ صاحب موصوف کی قبر بھی ہے جس پر فارسی میں ایک قطعہ تاریخ درج ہے جس کا دوسرا شعر یہ ہے:

تاریخ وفات او خرد گفت

کو صاحب سلسلہ ولایت

(۷۴۳ھ)

مزار میں دوسری جگہ سنگ مرمر پر "بجنّت رسید" لکھا ہے۔ اس فقرہ سے بھی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ اس مزار کی تعمیر، جیسا کہ اس پر کندہ ہے، ۱۱۴۲ھ میں ہوئی تھی۔

مولانا نیاز محمد صاحب وغیرہ نے ۱۳۵۷ھ میں اس خانقاہ میں مدرسہ قائم کیا۔ شروع میں اپنوں کی طرف سے سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا "دیوبندی ملّا خانقاہ پر قبضہ کر لیں گے"، "دادا شیخ موسیٰ کا میلا (عرس) بند کر دیں گے" وغیرہ وغیرہ۔ مگر مخالفتیں کامیاب نہیں ہوئیں۔ آج یہاں باقاعدہ مدرسہ قائم ہے۔ جہاں دو استاد اور دو درجن مقیم اور اتنے ہی غیر مقیم طلبہ تعلیم پا رہے ہیں۔

غریب مسلم خاندانوں کے یہ بے زبان بچے جن کا حال یہ ہے کہ وہ نو وارد سے سلام کرنے کے بعد دونوں ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھاتے ہیں اور اس کے بعد خاموشی سے ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں، جن کے مسکین چہرے بتا رہے ہیں کہ وہ حال اور مستقبل سے بالکل بے خبر ہیں، ان بے زبان بچوں سے ملنا خود ایک بڑا عبرتناک تجربہ ہے۔ میں ان بچوں کو دیکھ رہا تھا اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں ملّتِ اسلامیہ

ہند کی تمثیل دیکھ رہا ہوں جو قیادت و سرپرستی سے محروم ہو کر ایک قسم کی یتیمی کی حالت میں اس جغرافیہ کے اندر پڑی ہوئی ہے۔

مجھے بتایا گیا کہ یہاں کثرت سے سانپ اور بچھو پائے جاتے ہیں۔ نو نو ہاتھ کے کالے ناگ مارے گئے ہیں مگر کاٹنے کا کوئی واقعہ پچھلے دس برس میں کبھی نہیں ہوا۔ حالانکہ عالم یہ ہے کہ طالب علم نے چابی نکالنے کی لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو ہاتھ میں چھٹانک بھر کا بچھو آ گیا۔ بستر اور تہ بند میں سانپ لپٹے ہوئے پائے گئے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بزرگوں کی کرامتوں کا اثر ہے۔ یہ بھی بزرگی کا عجیب و غریب تصور ہے کہ ہم مستقبل میں پیدا ہونے والے انسانی سانپوں اور بچھوؤں سے بچنے کی تدابیر کا اہتمام تو نہ کر سکے البتہ ایسے بزرگوں کے تصرفات پر فخر کر رہے ہیں جنہوں نے دائمی طور پر ہماری نسلوں کو جنگلی سانپوں اور بچھوؤں کے زہر سے محفوظ کر دیا ہے۔

درگاہ خواجہ موسیٰ جس پہاڑی کے دامن میں واقع ہے اس کی چوٹی پر ایک ٹوٹا پھوٹا کھنڈر دکھائی دیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ کسی قدیم راجہ کا قلعہ تھا جو اس علاقہ میں "راجہ کی حویلی" کے نام سے مشہور ہے۔ ہم اس کو دیکھنے کے لیے اوپر چڑھے۔

یہ پہاڑی قلعہ سات آٹھ منزلہ ہے اس کا طرز تعمیر یہ ہے کہ نیچے سے اوپر تک ہر منزل سیڑھیوں کی شکل میں ہے۔ (ملاحظہ ہو تصویر ذیل)

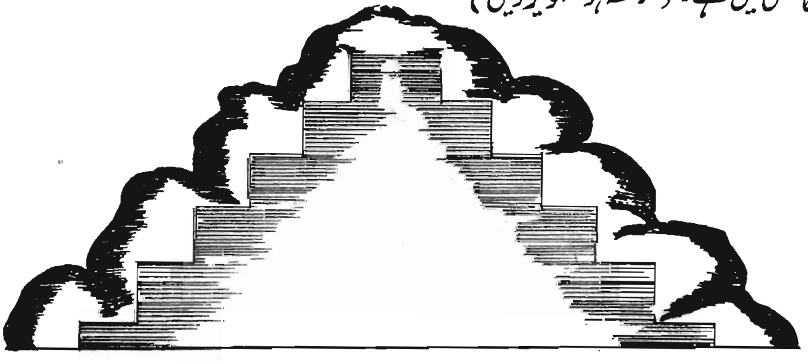

اس طرح سطح زمین سے لے کر پہاڑی کی چوٹی تک ایک کے بعد ایک منزلیں تعمیر ہوتی چلی گئی ہیں۔

ہم اس قلعہ کے اوپر اس کی آخری منزل پر کھڑے ہوئے تو نیچے وہ بستی دکھائی دے رہی تھی جو "پلہ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ہریانہ کے ضلع گوڑگاؤں میں واقع ہے۔ نیچے پتھر کے بنے ہوئے درجنوں مکانات

اس طرح برباد پڑے ہوئے ہیں جیسے کسی نے اوپر سے بمباری کرکے انہیں تباہ کر دیا ہو۔ یہ چھت کے بغیر ٹوٹی ہوئی دیواروں کا وسیع محلّہ اس وقت کی یادگار ہے جب تقسیم سے قبل یہاں "شیوخ" کی آبادی تھی۔ خانقاہ کے آس پاس کی تمام زمینیں خانقاہ پر وقف تھیں اور یہ شیوخ ان کے متولی تھے۔ شیوخ کی بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ اور وہ بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر تھے۔ مگر ان لوگوں نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا تھا۔ تقسیم کے بعد انہیں محسوس ہوا کہ ہندستان میں ان کا مستقبل تاریک ہے۔ اس لیے سب کے سب پاکستان چلے گیے۔ ان کے جانے کے بعد ان کی بڑی بڑی زمینداریاں متروکہ جائداد قرار دے دی گئیں جو اب غیر مسلموں کے قبضہ میں ہیں۔

کوہ اردلی کی بلندی پر کھڑے ہو کر آپ نیچے مشرق کی طرف نظر دوڑائیں تو ایک طرف خواجہ موسیٰ کی خانقاہ ہے جس میں مسلم خاندانوں کے بچے حال اور مستقبل سے بے خبر پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے جسم کے میلے اور پھٹے ہوئے کپڑے ان کی معاشی حالت کا بہ زبانِ خاموش اعلان کر رہے ہیں۔ انہیں میں ایک وہ طالب علم بھی ہے جو دونوں پیروں سے معذور ہے اور ہاتھ کے بل گھسٹ کر چلتا ہے۔ دوسری طرف اسی خانقاہ کے سامنے دور تک پھیلی ہوئی زمین ہے، پہلے یہاں کی زراعت کا تمام تر انحصار بارش پر تھا۔ مگر اب یہاں حکومت نے بجلی پہونچا دی ہے اور جگہ جگہ ٹیوب ویل کے ساتھ ہری بھری فصلیں کھڑی نظر آتی ہیں۔ میں نے اس پورے سفر میں محسوس کیا کہ حکومت اس علاقہ میں کثرت سے سڑکیں نکال رہی ہے اور بجلی کے تار پھیلا رہی ہے۔ مگر ان کا فائدہ زیادہ تر غیر مسلموں کے حصہ میں آیا ہے۔ اس علاقے کے مسلمان تجارت کو حقیر چیز سمجھتے تھے۔ چنانچہ ساری تجارت غیر مسلموں کے قبضہ میں چلی گئی، یہی وجہ ہے کہ آج سڑکوں کے اقتصادی فائدے کے وہ تنہا مالک ہیں۔ البتہ زمینیں زیادہ تر مسلمانوں کے قبضہ میں تھیں، اور اب بھی وہ کافی زمینوں کے مالک ہیں، مگر یہاں تعلیم سے دوری ان کے لیے رکاوٹ بن گئی ہے۔ اس علاقہ میں آپ کو بے شمار ٹیوب ویل نظر آئیں گے مگر وہ زیادہ تر غیر مسلموں کے ہیں۔ مسلمانوں میں مشکل سے کوئی ملے گا جو ٹیوب ویل اور ٹریکٹر سے کھیتی کر رہا ہو، وہ ابھی تک قدیم روایتی طرز کی کھیتی سے چمٹے ہوئے ہیں۔ اسلام اس علاقہ میں بوسیدہ مکانات اور ٹوٹی ہوئی مسجدوں اور خانقاہوں میں پناہ گزیں ہے اور غیر مسلم جدید امکانات سے فائدہ اٹھا کر زمین کے اوپر مادی قبضہ کر رہے ہیں۔

کانگریس کے طرز پر جو لوگ سوچتے تھے وہ تقسیم کے بعد بھی ملک میں جمے رہے۔

اس میں شک نہیں کہ تقسیم کے فوراً بعد مسلمانوں کے سامنے بہت سے شدید مسائل آئے جن کا سلسلہ بعد کو بھی جاری رہا۔ مگر مجموعی طور پر دیکھئے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ وقتی طوفان تھا جو بعض تاریخی حماقتوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا تھا اور زندگی جیسے جیسے تھمتی گئی لوگوں کے اس احساس میں اضافہ ہوتا چلا گیا کہ یہاں بھی مسلمانوں کے لیے زندگی ممکن ہے۔ جن مقامات سے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اگر وہ وہاں جمے ہوتے، یا پاکستان جانے کے بجائے عارضی نقل مقام سے اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کی ہوتی تو آج نسبتاً اعتدال پیدا ہونے کے بعد کتنے مقامات دوبارہ اسی طرح مسلم مراکز بن چکے ہوتے جس طرح وہ تقسیم سے پہلے مسلم مرکز بنے ہوئے تھے۔ موضع سونکھ کا چودھری امید خاں نمبردار جو ان چند لوگوں میں سے ہے جو دوبارہ اپنے وطن واپس آکر اپنے مکان اور زمین کے مالک بن چکے ہیں وہ اس بات کی علامت ہے کہ یہی امکان پوری مسلم آبادی کے لیے موجود تھا بشرطیکہ وہ بھگدڑ کا شکار ہو کر مستقل ترکِ وطن نہ کر گئے ہوتے۔

چودھری امید خاں پندرہ ایکڑ زمین کا مالک ہے۔ مگر جب کہ اس کے پڑوس میں صرف ایک پنجابی غیر مسلم نو ٹیوب ویل لگوا رہا ہے۔ وہ ایک ٹیوب ویل بھی نہ لگوا سکا۔ "آپ کیوں نہیں ٹیوب ویل لگواتے؟" میں نے نمبردار سے پوچھا۔ "ابھی ذرا سوچ رہے ہیں کہ اس میں کتنا فائدہ ہے" اس نے جواب دیا۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ جدید زراعتی شعور میں مسلمان کسان کتنا پیچھے ہے، اس کی سمجھ میں ابھی یہی بات نہیں آئی کہ ٹیوب ویل لگوانے میں فائدہ ہے یا نقصان۔ وہ صرف اس وقت سمجھے گا جب دوسروں کے ٹیوب ویل کام کرکے ان کی زمینیں دوگنی چوگنی پیداوار اگلنے لگیں گی۔ مگر اس وقت کا سمجھنا زیادہ کار آمد نہیں ہوگا۔ کیونکہ ایک تو وہ غیر مسلم کسانوں سے پچھڑ چکے ہوں گے۔ دوسرے اس وقت بجلی ملنا بھی اتنا آسان نہ ہوگا جتنا آسان آج ابتدائی مرحلے میں حکومت نے اسے بنا رکھا ہے۔

قصبہ نوح میں مجھے ایک کپڑے کی دوکان پر لے جایا گیا۔ اس کے مالک ایک باریش مسلمان ہیں۔ جن کا نام مولانا جمیل احمد صاحب (گوالدہ) ہے۔ انھوں نے عربی درسگاہ سے فراغت کے بعد سلائی کا کام شروع کیا۔ شروع میں بچوں کی معمولی ٹوپیاں بناتے تھے، اس سے چند سو روپے

جمع کرکے چھوٹی سی کپڑے کی دوکان کھول لی۔ شروع میں سخت مصائب کا سامنا ہوا۔ اب چار سال سے ان کی اچھی خاصی کپڑے کی دوکان بن چکی ہے۔

"ان کی کامیابی کا راز معاملات کی صفائی ہے" ہمارے ایک ساتھی نے کہا۔ "انھوں نے لین دین میں سچائی برتی۔ آڑھت والے کپڑا ادھار دینے لگے۔ اس طرح کسی خاص سرمایہ کے بغیر دوکان چل گئی۔ یہی دوکان ان کی معاش کا ذریعہ ہے۔ مگر ان کے اندر علمی ذوق بھی ہے، مقامی مدرسہ میں ایک گھنٹہ مقامات حریری کا درس دیتے ہیں جس کی کوئی تنخواہ نہیں لیتے، مجھے بتایا گیا کہ اس علاقہ میں یہ واحد شخص ہیں جو اس قسم کی ایک کپڑے کی دوکان کھول کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ سن کر مجھے سخت حیرت ہوئی کیونکہ یہ ایک چھوٹی سی دوکان تھی۔ اگر اس علاقہ کے مسلمان کاروبار میں اتنے پیچھے ہیں کہ ایسی دوکانیں بھی ان کے پاس نہیں تو سخت حیرت ہے۔ یہ علاقہ طویل مدت سے مختلف قسم کی دینی وسیاسی تحریکوں کا آماجگاہ رہا ہے مگر حیرت ہے کہ کسی نے مسلمانوں کی اس کمزوری کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔

مولانا جمیل احمد صاحب کا وطن گوالدہ (راجستھان) ہے۔ ۱۹۴۷ء کے فساد میں وہ وطن چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ تقریباً دو سال باہر رہے اس کے بعد "پھر بساؤ" تحریک کے تحت دوبارہ جاکر آباد ہوئے۔ زمین بھی دوبارہ قبضہ میں آگئی۔ وہ کاروبار کے ساتھ انگریزی بھی پڑھ رہے ہیں اور میٹرک کا امتحان دینے والے ہیں۔

نوح سے ہم قصبہ نگر (ضلع بھرت پور، راجستھان) کے لیے روانہ ہوئے۔ یہاں بس کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ میری سیٹ پر ایک باریش میواتی مسلمان بیٹھا ہوا تھا۔ کنڈکٹر نے اس سے کرایہ مانگا تو اس نے ایک روپیہ کا نوٹ نکالا۔ "یہ ٹھیک نہیں ہے دوسرا لاؤ" کنڈکٹر نے یہ کہہ کر نوٹ واپس کر دیا۔ اس کے بعد دیر تک بحث ہوتی رہی۔ کنڈکٹر کا کہنا تھا کہ نوٹ کا نمبر تک پھٹ گیا ہے اس لیے وہ اس کو نہیں لے سکتا۔ اگر نمبر محفوظ ہوتے تو وہ لے سکتا تھا۔ دوسری طرف باریش میواتی بار بار کہے جارہا تھا کہ اس کے پاس اور نہیں ہے۔ کنڈکٹر نے کہا تمہارے پاس اور پیسے نہیں ہیں تو میں کیا کروں میں یہ سب نہیں جانتا۔ یا تو کرایہ کے پیسے لاؤ۔ ورنہ بس روک کر تمہیں اتار دوں گا۔ آخر جب کنڈکٹر نے نوٹ لینے سے قطعی انکار کر دیا تو باریش میواتی نے اپنے جیب میں دوبارہ ہاتھ ڈالا۔ جب اس

نے جیب سے ہاتھ نکالا تو اس کے ہاتھ میں ایک تسبیح اور کچھ پیسے تھے اس پورے عمل
غور سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر مطلق شرمندگی کے آثار نہیں تھے۔ اس نے نہا
سے تسبیح اٹھاکر دوبارہ جیب میں ڈالی اور پیسے کنڈکٹر کے حوالے کر دیے۔

نوح سے فیروز پور جھرکہ ہم بس سے آئے۔ اور یہاں سے قصبہ نگر (ضلع بھرت پور
کے لیے سائیکل سے روانہ ہوئے۔ یہ سڑک پہاڑوں کو کاٹ کر ابھی نئی بنی ہے۔ اور شر
تک نہایت عمدہ ہے۔ راستہ میں بعض مسلمانوں سے ملاقات ہوئی جو اپنی روایتی بیس
ساتھ گویا زندگی کی شاہراہ پر گھسٹ رہے تھے۔ ان کا پورا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ زمانہ سے
پچھڑ گئے ہیں۔ ہماری سائیکل چکنی تارکول سڑک پر تیزی سے پھسل رہی تھی اور دوسری
پر میواتی مسلمان کا چھکڑا بھی کہیں کہیں گھسٹتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے سوچا۔ " زما
ترقی کے بے پناہ مواقع آج کے انسان کے لیے کھول دیئے ہیں۔ مگر سڑک خواہ کتنی ہی عمدہ
سفر تیز رفتار سواری کے بغیر ممکن نہیں "

ہماری آخری منزل الور تھی۔ یہاں مجھے خصوصیت سے مولانا محمد ابراہیم صاحب
جو کسی وقت اس علاقہ کے سب سے سرگرم مسلمان لیڈر تھے مگر اب دو سال سے مفلوج ہو کر پڑ

مولانا میوات کے علاقہ میں بے حد مقبول ہیں۔ وہ مارچ ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے تع
کے بعد سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۱ء میں کانگرس میں شامل ہوئے۔ مگر آزادی کے بعد کا
کے تحت جو حالات پیدا ہوئے اس سے متاثر ہو کر اب کانگریس سے مستعفی ہو چکے ہیں
انگریزی جیل گئے۔ ایک بار ریاست الور کی فوج کی گولی سے زخمی ہوئے۔ جب کہ انہوں
مال گزاری نہ دینے کی تحریک چلا رکھی تھی۔ ۱۹۷۰ میں مولانا محمد ابراہیم صاحب کا انتقال

مولانا ابراہیم صاحب کے معتقدوں میں غیر مسلموں کی بڑی تعداد ہے کیونکہ وہ ہر
ایک نظر سے دیکھتے تھے اور سب کی خدمت کرتے تھے۔ الور میں ماسٹر امر سنگھ بی۔اے (جاد
میری ملاقات ہوئی۔ " میں مولوی ابراہیم کو بچپن سے جانتا ہوں" انہوں نے کہا "کانگر
شور مچایا کہ دیش کو آزاد ہونا چاہیے تو مولوی صاحب پہلے آدمی تھے جنہوں نے کانگریس
ان کا کچھ نہیں بگڑا۔ مولوی صاحب کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ خود جیتی روٹی کھائی، چھپر میں ز

اور ان کے بل پر دوسروں کی کوٹھیاں بن گئیں۔ ۱۹۴۷ء میں جب میووں پر آفت آئی تو ان کے اجڑے ہوئے باغ کو پھر سے لگایا۔"

"مولوی ابراہیم کانگریس میں تھے مگر کبھی دب کر نہیں رہے" ماسٹر امر سنگھ نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا "۱۹۵۲ میں جب وہ کانگریس کے ٹکٹ پر ایم۔ایل۔اے ہو کر راجستھان اسمبلی میں پہونچے تو میں بھی اس وقت اسمبلی میں موجود تھا۔ پالی وال چیف منسٹر تھے۔ اپوزیشن لیڈر گوپال یادو نے کانگریس پر تنقید کرتے ہوئے کہا ____ "کانگریس گورنمنٹ اورنگ زیب سے بھی زیادہ ظالم ہے" مولوی ابراہیم نے فوراً کھڑے ہو کر کہا:

> "کہاں شہنشاہ عالم گیر اور کہاں یہ ظالم سرکار۔ اس نے تو مرتے وقت وصیت کی کہ میری تجہیز و تکفین اس ۹۰ روپے سے ہو جو میں نے ٹوپی بنا کر کمائے ہیں سرکاری خزانہ سے کچھ نہ لیا جائے اور اس سرکار کا حال تو یہ ہے کہ وہ ہڈی پسلی سب چبا جائے۔"

ماسٹر امر سنگھ نے کہا کہ مولوی صاحب کی خدمات کی وجہ سے "راجپوت ان کو سنٹ پرسنٹ چاہتے ہیں۔"

الور وہ مقام ہے جو اس بات کا نمونہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کے نام و نشان تک کو مٹا دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر اسی الور میں آپ کو ایسے غیر مسلم بھی ملیں گے جو مسلمانوں سے محبت کرتے ہیں اور مسلم تہذیب کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں۔

ٹھاکر امر سنگھ (جاولی بھون۔ الور) نے ۲ اپریل ۱۹۶۹ کی ملاقات میں مجھ سے کہا "آپ تفصیلی موقع نکالیں اور پورے میوات کا دورہ کریں۔ ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔ سرپنچوں سے کہہ کر گاؤں گاؤں میں آپ کا اخبار الجمعیۃ جاری کرائیں گے۔ ہندوؤں کو بھی خریدار بنائیں گے۔ اخبار کو چلانے کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے آپ کے لیے مالی امداد بھی کرائیں گے۔"

ٹھاکر امر سنگھ خود بھی اردو فارسی جانتے ہیں۔ میں نے ان سے ایک کاغذ پر اپنا پتہ لکھنے کے لیے کہا۔ میں نے انگریزی میں لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ مگر انہوں نے بالقصد اردو رسم الخط میں اپنا پتہ لکھ کر مجھے دیا۔

مولانا ابراہیم نے بتایا کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں الور اور بھرت پور کے اضلاع میں تقریباً بیس ہزار مسلمان قتل کر دیئے گئے تھے۔ اس علاقہ میں جمعیۃ علماء نے ریلیف کا جو کام کیا وہ تمام تر مولانا ابراہیم کی قیادت میں انجام پایا۔ تقریباً ایک لاکھ روپیہ نقد تقسیم کیا گیا۔ لحاف کمبل اور کھانے کے سامان دیئے گیے۔ کم وبیش ۵۰ مدرسے کھلوائے جن کو چار پانچ سال تک جمعیۃ علماء کی طرف سے چارسو روپے ماہوار دیئے جاتے رہے۔ جوں جوں مدارس خود کفیل ہوتے گیے امداد بند کی جاتی رہی۔ اب بھی بعض مدارس کو جمعیۃ کی طرف سے رقم دی جارہی ہے۔

"پھر بساؤ" مہم کے تحت تقریباً تین لاکھ افراد کو دوبارہ لاکر بسایا گیا جو اپنا وطن چھوڑ کر گوڑگاؤں اور یوپی کے علاقوں میں بھاگ گئے تھے۔ ان کی زمینیں اور مکانات واپس دلائے گئے۔ یہ ایک طویل مہم تھی جس میں تحصیل دار اور کلکٹر سے کاغذی لڑائی لڑکر یہ ثابت کرنا ہوتا تھا کہ فلاں جائداد فلاں شخص کی ہے۔ اس کے بعد پولیس کے زور سے قبضہ دلانا ہوتا تھا۔ ایک لاکھ افراد کو ان کی اپنی زمینیں ملیں اور دو لاکھ کو تبادلہ میں زمینیں دی گئیں۔ اگرچہ یہ تبادلہ اصل ملکیت کے مقابلہ میں بہت کم تھا۔

۱۹۴۷ء کے فسادات میں پورے مشرقی پنجاب کی طرح الور اور بھرت پور بھی مسلمانوں سے خالی ہوگیا۔ مسجدیں مسمار کر دی گئیں۔ زمینوں پر ناجائز قبضہ کر لیا گیا۔ پورا علاقہ مسلمانوں کے لیے قبرستان بن چکا تھا۔ اس وقت مولانا ابراہیم واحد شخص تھے جنہوں نے مسلمانوں کو دوبارہ سہارا دیا۔ انہوں نے جمعیۃ علماء اور کانگریس کے لیڈروں کا تعاون حاصل کیا۔ مہاتما گاندھی گولی کا نشانہ بن چکے تھے۔ غیر مسلموں میں ونوبا بھاوے نے خصوصیت سے ان کا ساتھ دیا۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں وہ ونوباجی کو دہلی سے بلا کر لے گئے۔ پورے علاقہ میں ان کا دورہ کرایا۔ مسلمانوں کے سامنے ان کی تقریریں کرائیں۔ ایک سال کے دوران میں انہوں نے ونوبا بھاوے کو تقریباً دس بار اس علاقہ میں بلایا۔

ان کوششوں کے نتیجہ میں حالات اعتدال پر آئے۔ مسلمانوں کی ڈھارس بندھی، الور اور بھرت پور کے اضلاع میں تقریباً چار ہزار مسجدیں مسمار کر دی گئی تھیں۔ بہت سی مسجدوں پر شرنارتھیوں کا قبضہ تھا۔ ۸۰۰ مسجدیں کھلوائی گئیں، تقریباً دو سو مسجدیں دوبارہ تعمیر کی گئیں۔

خوف وہراس کا عالم یہ تھا کہ ضلع الور میں ۱۷ ہزار مسلمان شدھی ہوگیے تھے ۔ ۳ ہزار نے ضلع بھرت پور میں اسلام کو چھوڑ کر ہندو مذہب کو اختیار کر لیا تھا اور چوٹیاں رکھ لی تھیں۔ مولانا ابراہیم اس معاملہ میں جان پر کھیل گیے۔ ونوبا بھاوے سنیم بھائی، مولانا حفظ الرحمٰن وغیرہ کا دورہ کرایا۔ خالی مسجدوں میں جا جا کر اذانیں دیں تاکہ مسلمانوں کا خوف وہراس دور ہو۔ ان کی چوٹیاں کٹوائیں اور سب کو دوبارہ اسلام میں داخل کیا۔ دھولی دوب، چاندولی (ضلع الور) وغیرہ مقامات پر یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ نکاح کے بجائے پھیرے کا ہندوانہ طریقہ رائج ہو گیا تھا۔ وہاں جاکر اسلامی نکاح کا طریقہ دوبارہ رائج کیا۔

اس کام میں مولانا ابراہیم کو سخت ترین مخالفتیں پیش آئیں۔ آریہ سماج کے لوگوں نے صدر جمہوریہ کو سیکڑوں تار دیئے جن میں کہا گیا تھا کہ یہ لوگ زبردستی ہندوؤں کو مسلمان بنا رہے ہیں۔ مگر مولانا ابراہیم ساری رکاوٹوں سے لڑتے رہے۔ بالآخر ایک ایک کر کے سارے منحرف لوگوں کو دوبارہ مسلمان بنا ڈالا۔

شہر الور میں ننگلی کے چوراہہ پر آپ کھڑے ہوں تو ایک اسکوائر پارک کے درمیان نو تعمیر اشوک کی لاٹ کھڑی ہوئی نظر آئے گی۔ یہاں تقسیم سے قبل الور کی جامع مسجد تھی۔ فساد کے زمانہ میں اسے منہدم کر دیا گیا۔ اس کے بعد جب حکومت نے اسے موجودہ شکل میں تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا تو یہاں ایک "دیوانہ" سرکار کی راہ میں آکر کھڑا ہو گیا۔ یہ مولانا ابراہیم تھے۔ حکومت ہر ایک سے نمٹ سکتی تھی مگر مولانا ابراہیم کو نظر انداز کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔

۱۹۶۳ء کا واقعہ ہے وہ اس سلسلے میں دلی گیے تاکہ مرکزی سیاستدانوں کو آمادہ کریں کہ وہ مقامی حکام کو ان کے ارادے سے باز رکھیں۔ مگر مولانا ابراہیم کی الور سے غیر حاضری مقامی حکام کے لیے سنہری موقع بن گئی۔ انہوں نے درجنوں پٹرومیکس جلا کر اور سیکڑوں مزدور لگا کر صرف ایک رات میں مسجد کی جگہ پر اسکوائر تعمیر کر ڈالا اور لاٹ بنا کر کھڑی کر دی۔

یہی الور کی تمام مسجدوں کا حال ہوا ہے۔ پٹواری کی رپورٹ کے مطابق الور میں ۱۱۱ مسجدیں تھیں۔ ساری مسجدیں مسمار کر دی گئیں اور ان پر نئی تعمیرات کھڑی کر دی گئیں۔ ٹاؤن ہال کے سامنے چوک پر جو خریداروں سے بھری ہوئی دکانیں نظر آتی ہیں، ان میں ایک طرف کی ناکہ کی دکانیں وہ

ہیں جو قدیم مسجد کے بیرونی حصہ میں تعمیر ہوئی ہیں۔
ہم نے دو کانوں کے پیچھے جاکر دیکھا تو اندر اب بھی اسپینی طرز کے محراب نما دروازے مسجد کی

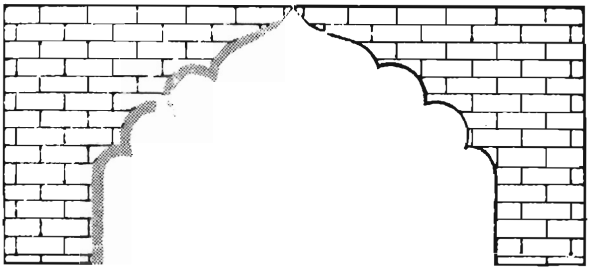

باقیات کے طور پر موجود تھے۔

دلّی سے الور جانے والی ٹرین جب اسٹیشن کے حدود میں داخل ہوتی ہے تو مسافر کو اسٹیشن سے ایک فرلانگ کے فاصلہ پر عین لائن کے کنارے پتھر کی نصف تعمیر شدہ دیواریں نظر آتی ہیں۔ یہ داؤد پور والی مسجد کے نشانات ہیں جو الور کی پہلی مسجد ہے جو ۱۹۴۷ کے ہنگامہ کے بعد دوبارہ تعمیر کی گئی۔ یہ مسجد بہترین مرکزی جگہ پر واقع ہے۔ دیگر مساجد کی طرح اس کو بھی برباد کر دیا گیا تھا۔ مگر مولانا ابراہیم وہاں اپنا "کھونٹا گاڑ کر" بیٹھ گئے اور اس کو دوبارہ تعمیر کر ڈالا۔

اس مسجد کے ساتھ ایک بزرگ حضرت رکن الدین کا مزار اور درگاہ بھی ہے جو اس علاقہ میں "الور کے پیر" کے نام سے مشہور ہیں۔ اس درگاہ کو توڑ کر اس کی قبر تک ظالموں نے کھود ڈالی تھی مسجد مکمل طور پر منہدم کر دی تھی۔ مزار کی عمارت تعمیر ہوگئی ہے اور مسجد کی بنیاد پڑ چکی ہے۔ دیواریں بھی کچھ اوپر آگئی ہیں۔ مگر سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے کام رک گیا ہے۔ اس مسجد کے ساتھ کافی زمین بھی ہے۔ اگر پوری زمین کی حد بندی ہو جائے، مسجد تعمیر ہو جائے، اس کے ساتھ ایک مدرسہ بن جائے تو یہ جگہ الور میں ایک قسم کا اسلامی مرکز بن سکتی ہے، جہاں اسلام کا لٹا ہوا قافلہ دوبارہ اپنے کو منظم کر کے سفر شروع کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔

اللہ کی یہ مصلحت بھی عجیب ہے کہ مولانا ابراہیم جو اس علاقہ میں واحد شخص تھے جو اس قسم کے کاموں کو جرأت اور اعتماد کے ساتھ کر سکیں۔ وہ دو سال سے مفلوج ہو گئے ہیں اور صرف اس قابل ہیں کہ داؤد پور کی اس مسجد کے پاس کرسی بچھا کر صبح سے شام تک بیٹھے رہیں اور مسجد کے شکستہ در و دیوار

کو اس حسرت کے ساتھ دیکھتے رہیں کہ کاش آج میں چلنے پھرنے کے قابل ہوتا تو اب تک اس مسجد کو دوبارہ بنا کر کھڑی کر چکا ہوتا۔ مگر افسوس کہ میں کہیں جانے کے قابل بھی نہیں۔

حال ہی میں خبر آئی تھی کہ گجرات کے ایک مسلمان مسٹر حسن بھائی کالا بھائی نے ایک مندر اور ایک پرائمری اسکول کے لیے تین لاکھ روپے کا عطیہ دیا ہے۔ مسلمانوں کی خرچ کرنے کی یہ صلاحیت اگر ملّی کاموں میں ظاہر ہو تو نہ صرف الور کی مسجد اور مدرسہ تعمیر ہو جائے۔ بلکہ ملّت کی پوری عمارت دنوں اور ہفتوں میں بن کر کھڑی ہو جائے۔ (یہاں اب الحمدللہ مسجد اور مدرسہ تعمیر ہو چکا ہے)

الور کے قریب اروَلی پہاڑ کے اوپر راجہ حسن خاں میواتی کا قلعہ نظر آتا ہے جو پہاڑی کے اوپر اوپر ۴۲ میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ اس راجہ کے خاندان نے دو سو برس تک میوات کے علاقہ پر حکومت کی تھی۔ اس ریاست کا خاتمہ راجہ حسن خاں میواتی پر ہوا جو پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں بابر کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔

الور میں آج بھی سب سے بلندی پر جو تعمیر نظر آتی ہے وہ اسی مسلمان راجہ (حسن خاں میواتی) کا قلعہ ہے۔ مگر اس عظیم الشان قلعہ کی ساری اہمیت گزرے ہوئے ماضی کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ طویل موقع ملنے کے باوجود مسلمان وہ "قلعہ" نہ بنا سکے جو مستقبل کے حالات میں کام دینے والا ہو۔

مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا انجام دیکھ کر ہم جھنجلا اٹھتے ہیں۔ مگر سوچنے کی بات ہے کہ یہ وہی علاقہ تو ہے جہاں ماضی میں ہمارا رعب و دبدبہ قائم تھا۔ پھر کیوں نہ ہم وہ حالات پیدا کر سکے جب کہ مستقبل میں بھی فیصلہ کا سرا ہمارے ہاتھ میں رہتا۔ یہ دراصل خود اپنی کوتاہی کا مسئلہ ہے نہ کہ دوسرے کے ظلم و ستم کا مسئلہ۔

اس قلعے کے نیچے اروَلی پہاڑ کے دامن میں ایک نیا الور ابھر رہا ہے۔ جدید طرز کی شاندار عمارتوں کے درمیان عین سڑک کے کنارے ایک وسیع احاطہ ہے جس کے اندر ایک قدیم وضع کی عمارت یتیم کی سی حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ اس عمارت کے ۲۸ کمرے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ۵ بیگہ زمین ہے۔ جدید طرز کی بالکل سیدھی سڑک سے گزرتے ہوئے جب آپ اس عمارت کے گیٹ پر پہونچیں تو وہاں ایک لٹکتا ہوا بورڈ آپ کو بتائے گا کہ یہ "میو بورڈنگ" ہے۔

۱۹۴۲ کا واقعہ ہے۔ دیہاتوں کے میو کاشتکاروں نے الور کے راجہ تیج سنگھ سے درخواست

کی کہ ہم اپنی ضروریات کے لیے اور اپنی پیداوار فروخت کرنے کے لیے شہر آتے ہیں۔ مگر یہاں ہمارے ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں جس کی وجہ سے ہم کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔ مہاراجہ الور نے اپنی طرف سے ایک زمین دی اور سارے الور کے میو کاشتکاروں پر ان کی مال گزاری کے اوپر ایک آنہ فی روپیہ لگایا۔ اور رحیم خاں (کیتھوڑا) کو ذمہ دار بنایا کہ اس طرح جو رقم حاصل ہو اس کے ذریعہ سے وہ میوؤں کے لیے شہر میں ایک قیام گاہ تعمیر کریں۔

آج اگر آپ اس عمارت کو دیکھیں تو شاندار بلڈنگوں کے درمیان یہ قدیم وضع کی عمارت مخمل میں ٹاٹ کے پیوند کی طرح کھڑی ہوئی نظر آئے گی۔ ۲۸ کمروں کی اس عمارت میں میو طلبہ کو مفت رہائش کی سہولت دی جاتی ہے۔ مگر میو بورڈنگ ہاوس کو پانچ لاکھ کی میو قوم میں سے صرف چند تعلیم کے شائق نوجوان ملے ہیں۔ جو اس کے ایک گوشہ میں رہتے ہیں۔ میو کاشتکار اناج بیچنے کے بعد اپنی قدیم وضع کی بیل گاڑیاں یہاں لاکر کھڑی کر دیتے ہیں۔ ان کے بیل بورڈنگ ہاؤس کے وسیع صحن میں بول و براز پھیلانے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اور میو کاشتکار حقہ پیتے ہیں۔ میں نے دیکھا تو ۵ بیگہ کی اس غیر ہموار زمین میں بیل گاڑی کا بھوسہ اڑ اڑ کر اس طرح پھیلا ہوا تھا جیسے یہ شہر کا ٹکڑا نہیں بلکہ کسی دیہات کا حصہ ہے۔ ایک ایسی جگہ جہاں غیر مسلم ایک ایک انچ زمین کا بہترین استعمال کر رہے ہیں۔ میو بورڈنگ اپنے وسیع رقبۂ زمین کے ساتھ صرف بیکاری اور گندگی کی تصویر پیش کر رہا ہے۔ ایسی قوم سے اگر اس کا اثاثہ چھینا جائے اور اس کو حقیر سمجھا جائے تو اس کو دوسروں سے شکایت کرنے کے بجائے خود اپنے آپ سے شکایت کرنی چاہیے۔

جب مجھے معلوم ہوا کہ الور ہندستان کا وہ بد قسمت شہر ہے جہاں ۱۱۱ مسجدیں مسمار کر دی گئیں تو مجھے جاننے کی خواہش ہوئی کہ فسادیوں نے یہ کام کس ذریعہ سے انجام دیا۔ اس علاقہ میں پتھر کی فراوانی ہے۔ اس لیے عام طور پر عمارتیں پتھر کی بنتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ فسادی بل ڈوزر لے کر نہیں آئے۔ پھر انہوں نے کس طرح ۱۱۱ مسجدیں ایک دم سے ڈھا کر رکھ دیں۔

میں نے الور کے مسلمانوں سے بار بار یہ جاننے کی کوشش کی، مگر وہ اس کا التزام تو شدت سے کرتے تھے کہ "مسجدیں ڈھا دی گئیں" کے بجائے "شہید" کر دی گئیں کا لفظ استعمال کریں۔ مگر وہ مجھ کو یہ بتانے میں کامیاب نہیں ہوئے کہ یہ پتھریلی شہادت کس آلہ کے ذریعے وجود میں آئی ہے۔

کئی گھنٹہ کی جدوجہد کے بعد بالآخر میں یہ جاننے میں کامیاب ہوا کہ اصل بات یہ ہے کہ اس علاقہ سے مسلمان تمام کے تمام چلے گیے تھے۔ یہ کیفیت تقریباً دو سال تک رہی اس دوران مسجدیں لاوارث مال کی طرح برباد کی جاتی رہیں۔ مسجدوں کے سامان ان کے پتھر وغیرہ لوگ نکال نکال کرلے جاتے رہے مسجدوں کے پتھراب بھی شہر کے بعض مقامات پر لگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس طرح مہینوں کے لمبے عمل کے درمیان مسجدیں برباد ہو گئیں۔

اسی طرح ننگلی والے چوراہے پر جہاں مسجد کی جگہ راتوں رات اشوک کی لاٹ کھڑی کر دی گئی ہے۔ مجھے ایسے مسلمان ملے جنھوں نے کہا کہ ہم نے اپنی آنکھ سے وہ رات دیکھی ہے جب کہ سیکڑوں کاریگر درجنوں پٹرومیکس کی روشنی میں یہ کام کر رہے تھے۔ مگر کافی کوشش کے باوجود وہ یہ نہ بتاسکے کہ وہ خاص تاریخ کیا تھی جس تاریخ کو ایک رات میں یہ واقعہ عمل میں آیا۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ واقعہ مشتبہ ہے۔ اس واقعہ کا ثبوت کاغذات سے دیا جاسکتا ہے۔ آج بھی الور میں ایسے انصاف پسند ہندو موجود ہیں جو اپنی زبان سے اس کی تصدیق کرتے ہیں (مثال کے طور پر ماسٹر امر سنگھ۔ الور) مگر جدید تعلیم میں مسلمانوں کے پیچھے ہونے کے جو نقصانات ہوئے ہیں ان میں سے ایک نقصان یہ بھی ہے کہ ہم کو جدید انداز میں بات کہنے کا سلیقہ نہیں آیا۔ ہمارے قدیم روایتی طریقہ میں خطابت اور لفاظی کی سب سے زیادہ اہمیت تھی۔ ماضی میں ہماری کئی اعلیٰ ترین صلاحیتیں خطیبانہ لفاظی کی نذر ہو گئیں۔ مگر اب سائنس نے جو ذوق پیدا کیا ہے اس کے بعد یہ طریقہ سطحی سمجھا جانے لگا ہے۔ جدید معیار کے مطابق واقعات کو اس طرح بیان کرنا چاہیے کہ اس میں تمام منطقی کڑیاں موجود ہوں۔ اعداد و شمار کی زبان میں اس کو مدلل کیا گیا ہو، وقت مقام، تاریخ، افراد ہر چیز متعین شکل میں موجود ہو۔ بلکہ اشکال کا فوٹو اور آوازوں کا ٹیپ بھی موجود ہو۔ مگر ہمارے یہاں اب بھی قدیم خطیبانہ چیخ پکار کا طریقہ جاری ہے۔ حکومت کے خلاف ہم کو ہزاروں شکایات ہیں۔ مگر مشکل سے کوئی ایسی شکایت ہوگی جس کو جدید استدلالی انداز میں مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ ہنگامی کاموں کے لیے مسلمان اپنی جیبیں خالی کر سکتے ہیں۔ مگر ٹھوس اور سنجیدہ کاموں کے لیے ان کے پاس کچھ نہیں۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ایسی قوموں کے لیے زمانہ نے جو جگہ ریزرو کی ہے وہ صرف سماجی قبرستان ہے۔ عملی زندگی میں زمانہ انھیں کوئی زندہ مقام دینے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔

دوسرا سفر

۲۶ مئی ۱۹۶۹ کی شام کو ۴ بجے ہم مولانا عبدالرحیم کے ساتھ روانہ ہوئے۔ یہ میرا میوات کا دوسرا سفر تھا۔ دلّی کی فیشن ایبل عمارتوں سے گزر کر جب ہماری گاڑی ہریانہ کے علاقہ میں داخل ہوئی تو یہاں دوسرا منظر تھا۔ وسیع سڑک کے دونوں طرف جدید طرز کے فارم اور باغات کھڑے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں چٹانوں کی باقیات اور کیکر اور مدارسے ڈھکے ہوئے میدان اب بھی موجود تھے جو بتا رہے تھے کہ کس قسم کی زمینوں پر محنت کر کے یہ شاندار نتائج حاصل کیے گیے ہیں۔

۶ ½ بجے شام کو ہم قصبہ نوح پہونچے۔ میوایتوں کے اس قصبہ میں بستی کے کنارے مدرسہ قاسم العلوم رات بھر کے لیے ہماری جائے قیام تھا۔ چھوٹی سی قدیم وضع کی مسجد اور اس سے بھی چھوٹی چھپر پڑی ہوئی درس گاہ کے ماحول میں دین دار اور معصوم چہرے ہر اس شخص کی توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں جس کی آنکھیں دینی مناظر سے لطف اندوز ہونے کا ذوق رکھتی ہوں۔ مغرب کی نماز کے بعد حفظ کے طلبہ قطار باندھ کر مسجد کے صحن میں بیٹھ گئے اور جھوم جھوم کر قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔

یہ مناظر دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ یہ دینی مدارس جو ہمارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں گویا دین کے قلعے ہیں جہاں نسل در نسل دین کو محفوظ کیا جا رہا ہے۔ یہ لوگ جو ان مدارس میں دین کی تعلیم پاکر نکلتے ہیں یہی لوگ دین کی توسیع و ترقی کے نقیب بھی بن سکتے تھے۔ مگر ہم ان کو ان ذرایع و وسائل سے مسلح نہ کر سکے جو اقدام اور توسیع کی مہم کے لیے ضروری ہیں۔ ہماری بدقسمتی نے انہیں بس "آثار قدیمہ کا محافظ" بنا کر رکھ دیا ہے۔

نوح میں معین الاسلام میوات کا سب سے بڑا دینی مدرسہ ہے۔ طلبا کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو ہے۔ یہاں بھی کچھ وقت گزرا۔ اس کے ناظم جناب حافظ محمد عیسٰی صاحب بہت خوبیوں کے آدمی ہیں۔ چودھری اشرف صاحب سے بھی یہیں ملاقات ہوئی اور میوات کے مسائل پر دیر تک گفتگو رہی۔ نوح میں میوات کا واحد مسلم اسکول ہے جس کا نام ہے برین میو ہائی اسکول (Brayne Meo High School) یہاں تقریباً دو گھنٹے گزرے اور ہیڈ ماسٹر اور دوسرے ٹیچر صاحبان سے ملاقات ہوئی۔

برین نامی ایک افسر مال کو خیال ہوا کہ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ایک اسکول کا انتظام ہونا چاہیے چنانچہ اس نے علاقہ کے میو کاشتکاروں پر لگان کے ساتھ ایک رقم عائد کر دی جو تحصیل داروں کی معرفت موصول ہو کر اسکول کو ملی۔ یہ رقم اس وقت دو لاکھ تھی، جو آج کے لحاظ سے پچاس لاکھ کے برابر ہے۔

۵۲ بیگہ کا وسیع رقبہ لیے ہوئے یہ ادارہ ۷۵ سال سے صرف ہائی اسکول کے درجہ پر پڑا ہوا ہے آج تک وہ کالج نہ ہو سکا۔ اس میں طلبہ کی تعداد ساڑھے پانچ سو ہے۔ تقریباً ۳۵ فیصد مسلمان ہیں۔ اساتذہ کی تعداد ۲۱ ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب ایک با صلاحیت اور حساس آدمی ہیں۔ وہ اسکول کے رقبہ کے گرد باؤنڈری وال بنوا رہے ہیں۔ ان کا ارادہ ہے کہ اس وسیع زمین کو زراعت کے لیے استعمال کریں۔

"یہ ادارہ عبرت اور عظمت کا مرقع ہے" ایک ٹیچر نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا اور ارولی پہاڑ کے دامن میں چھوٹے اسکول کی دور تک پھیلی ہوئی زمین اس کی تصدیق کر رہی تھی۔ میں نے سوچا یہی حال ہماری پوری ملت کا ہے۔ وہ اپنے وسائل اور آبادی کے لحاظ سے عظیم امکانات کی حامل ہونے کے باوجود عبرت وحسرت کا ایک نشان بن کر رہ گئی ہے۔

میو قوم کے تعلیم میں پیچھے ہونے کی وجہ بتلاتے ہوئے ایک استاد نے کہا: "ہمارے یہاں آٹھویں نویں کلاس کا تقریباً ہر طالب علم شادی شدہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ میو رواج کے مطابق داڑھی مونچھ نکلنے سے پہلے شادی ہو جانا ضروری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ آگے تعلیم جاری نہیں رکھ سکتا۔ بچپن کی عمر میں شادی میو قوم کی ترقی کے لیے زبردست رکاوٹ بن گئی ہے۔"

رات نوح میں گزار کر، ۲ مئی کو ہم ساڑھے گیارہ بجے بھادس پہونچے۔ یہاں مولانا جمیل احمد صاحب (خلیفہ مجاز مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ) سے ملاقات ہوئی۔ آپ یہاں پندرہ سال سے مقیم ہیں اور ایک ابتدائی مدرسہ چلا رہے ہیں۔ تقریباً ۷۰ طلبہ کو تنہا پڑھاتے ہیں۔ اردو، قرآن اور دینی تعلیم کا انتظام ہے۔

مولانا جمیل احمد گھاسیڑہ (میوات) کے رہنے والے ہیں۔ مدرسہ امینیہ دہلی سے فراغت کے بعد پندرہ سال تک تبلیغ سے وابستہ رہے "تعلیم کے بعد میری پوری جوانی اسی راہ میں خرچ ہوئی" انہوں نے اپنا حال بیان کرتے ہوئے کہا۔ اس سلسلے میں پاکستان اور حجاز کے بھی طویل دورے کیے۔ پچھلے

پندرہ سال سے مدرسہ مدنیہ (بھادس) میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

مولانا کو یہاں کے مدرسہ کی طرف سے اب اضافے کے بعد ۵۰ روپے اور دو من غلہ ماہانہ ملتا ہے۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ مدارس کے ذریعہ جو لوگ دینی خدمت کر رہے ہیں وہ کتنے ایثار و قربانی کے ساتھ یہ کام انجام دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ محض اس سے خرچ پورا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ گھر سے لے کر کام چلتا ہے۔ اس حالت میں محنت کا یہ عالم ہے کہ صبح سے شام تک طلبہ کے ریوڑ سے نمٹتے رہتے ہیں اور اس ساری جد و جہد کے پیچھے خدا کے انعام کے سوا اور کچھ نہیں۔

اگر صرف دینی مدارس کی مثال کو سامنے رکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم دنیا کے سب سے بڑے ایثار پیشہ افراد کا عظیم ترین دستہ اپنے پاس رکھتے ہیں۔ مگر اس ایثار و قربانی کو وسیع معنوں میں مفید اور موثر بنانے کے لیے کچھ اور چیزوں کی بھی ضرورت ہے اور افسوس کہ وہی ہم کو حاصل نہیں۔

"اصل چیز یہ ہے کہ میں نے اپنے آپ کو اس مدرسہ کا ملازم نہیں سمجھا" مولانا جمیل احمد صاحب نے سادگی کے ساتھ فرمایا جس میں نہ کوئی نمائش تھی نہ اظہار فخر اور مدرسہ اور مسجد کا پورا ماحول ان سیدھے سادے الفاظ کی تصدیق کر رہا تھا۔

بھادس سے ہمیں نگینہ (ضلع گوڑگاؤں) جانا تھا۔ نگینہ کے قریب ہم ایک چوراہہ پر پہونچے جہاں سڑک کے کنارے ایک بہت بڑی نو تعمیر بلڈنگ کھڑی ہوئی تھی "یہاں دن کو بھی لوٹ مار ہوتی تھی" ایک شخص نے بتایا "مگر جب سے لالہ جی نے یہ بلڈنگ اور کنواں بنوایا ہے، یہاں چھوٹا سا بازار بن گیا ہے۔ ہر وقت چہل پہل رہتی ہے۔ اب بے خوف و خطر لوگ دن رات یہاں سے گزرتے ہیں" کہنے والا کہہ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا —— "اقتصادیات کو لوگ صرف مالیات کے ہم معنیٰ سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقۃً اس کا تعلق زندگی کے بے شمار معاملات سے ہے۔ اس چوراہہ پر کسی اور طریقے سے امن و امان قائم کرنے کی کوشش کی جاتی تو کتنی مشکل پیش آتی۔ مگر ایک سرمایہ دار نے وہاں ایک بڑی بلڈنگ کھڑی کر دی۔ اس کے بعد وہاں دکانیں اور ہوٹل بن گئے اور لوٹ مار کا مقام انسانی سرگرمیوں کا مقام بن گیا"

اس جگہ کا نام برکلی ہے۔

مزید مجھے بتایا گیا کہ جس لالہ نے یہ بازار بنوایا ہے، اس کے باپ کا یہ حال تھا کہ اس کو آٹھ آنے کی چیز بھی دکاندار ادھار نہیں دیتا تھا، مگر آج اس کا کاروبار کئی اضلاع میں پھیلا ہوا ہے۔ ایک طرف میو قوم تمام زمینوں کی مالک ہوتے ہوئے تیزی سے بدحالی کی طرف جا رہی ہے اور دوسری طرف انہیں کے وطنی بھائی مسلسل علمی اور اقتصادی ترقی کر رہے ہیں۔ ایک طرف جزر اور دوسری طرف مد کا یہ غیر معمولی تناسب بے حد خطرناک ہے۔ اگر یہ عمل اسی طرح جاری رہا تو مستقبل میں میو قوم کا وہی حال ہوگا جو اس ملک میں اچھوتوں کا ہو چکا ہے۔

نگینہ میں مدرسہ اسلامیہ عربیہ دارالعلوم میں کچھ وقت گزرا۔ یہاں مشکوٰۃ اور جلالین تک تعلیم ہوتی ہے۔ اس کے صدر مدرس مولانا ظفرالدین صاحب ہیں۔

نگینہ تقریباً نوے میل چوڑے اور ۵۰ میل لمبے علاقہ میوات کے درمیان واقع ہے۔ جائے وقوع کے اعتبار سے یہ مدرسہ اس علاقہ میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ مدرسہ کے لیے زمین حاجی چاند خاں صاحب نے دی ہے۔

نگینہ سے باہر چھپروں سے ڈھکی ہوئی چند عمارتیں اپنی دو ایکڑ زمین میں تقریباً سوا سو طلبہ اور چار اساتذہ کو بسائے ہوئے ہیں۔ نگینہ کے بازار کے باہر یہ سادہ بستی اپنی سادہ تر زندگی کے ساتھ پناہ گزینوں کا کیمپ معلوم ہوتی ہے۔ یہ شاید موجودہ زمانہ میں دینی حالت کی تمثیل ہے۔ کیونکہ آج دین کی حالت یہی ہے کہ وہ زندگی کی سرگرمیوں سے نکال دیا گیا ہے اور دور افتادہ مقامات پر پناہ گزین کی شکل میں پڑا ہوا ہے۔

میں قصبہ میں بھی گیا اور "فتح محمد، نذر محمد صاحبان سے ملا۔ نگینہ میں تقریباً آٹھ سو خاندان آباد ہیں جن میں دو سو خاندان مسلمان ہیں۔ میں نے پوچھا یہاں کتنی دکانیں مسلمانوں کی ہوں گی ؟

"ایک بھی نہیں"

یہ جواب سن کر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ ابھی میں بولنے ہی والا تھا کہ دوسرے شخص نے کہا :

"کیوں نہیں — وہ جما کی دوکان ہے نا سیکل کی مرمت کی"

"وہ بھی کوئی دکان میں دکان ہے" پہلے شخص نے کہا۔

میں نے جا کر دیکھا تو وہ معمولی لکڑی کا کھوکھا تھا۔ جس کو واقعی دکان کہنا مشکل ہے۔ یہاں کے

مسلمان یا تو کھیتی کرتے ہیں یا مزدوری۔ نگینہ کے اطراف میں ۸۵ گاؤں آباد ہیں اور نگینہ ان سب کا مشترک بازار ہے۔ ان دیہاتوں میں ۹۵ فی صد مسلمان آباد ہیں۔ مگر نگینہ میں کوئی مسلمان دکان دار نہیں۔ مسلمان صرف غلّہ پیدا کرتے ہیں۔ باقی ساری ضروریات دوسروں سے خریدتے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ یہاں کی زراعت کا بیشتر انحصار بارش پر ہے۔ بارش نہیں ہوئی یا کم ہوئی تو میوؤں کے کھیت غلّہ نہیں اگاتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ انہیں غلّہ خریدنا پڑتا ہے بیل یا بھینس مرجائے تو اس کی خریداری کے لیے پیسے نہیں ہوتے۔ کپڑا اور دوسری ضرریات کے لیے بھی قرض لینا پڑتا ہے۔ یہ قرض دوبارہ وہی مہاجن دیتا ہے جو پہلے سے تمام ذرائع معاش کا مالک بنا ہوا ہے۔ یہاں آکر میو سودی قرضوں کے جال میں پھنس جاتا ہے جس سے پھر کبھی نکلنا نصیب نہیں ہوتا۔

"کتنے مسلمان سودی قرضوں سے بچتے ہوں گے" میں نے فتح محمد سے پوچھا۔

"یہی جی سو میں کوئی پانچ بچتے ہوں گے" اس کا جواب تھا۔

پوناہانا (ضلع گوڑگاؤں) میں عصر کی نماز پڑھی۔ یہاں مولانا محمد سلیمان صاحب، شودان صاحب عبدالسلام صاحب اور یٰسین خاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ قصبہ پوناہانا کی آبادی تقریباً سات ہزار ہے جس میں مسلمان دو ہزار ہوں گے۔ مسلمانوں کا ذریعہ معاش اس علاقہ کے دوسرے مقامات کی طرح زراعت یا مزدوری ہے۔ دو تین مسلمان معمولی تجارت کرتے ہیں۔ ساری تجارت غیر مسلموں کے قبضہ میں ہے، حتیٰ کہ وہ تجارتیں بھی جن کا تعلق تمام تر مسلمانوں سے ہے۔ مثلاً اردو کی مذہبی کتابیں، مدارس اسلامیہ کے نصاب، سیپارے اور قرآن مجید وغیرہ کے خریدار صرف مسلمان ہوتے ہیں۔ مگر یہاں اس کو بیچنے والا صرف ایک غیر مسلم ہے۔ میں نے خود بازار میں جاکر "یہ پستک بھنڈار" دیکھی۔ قرآن کی جلدیں الماری کے سب سے اوپر کے خانہ میں نظر آرہی تھیں۔ الجمعیۃ بک ڈپو کا مطبوعہ اردو نصاب بھی یہاں رکھا ہوا تھا۔ مسلمانوں کے لیے اپنی مذہبی کتابیں اور تعلیمی نصاب خریدنے کے لیے یہاں اس دکان کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں۔

پوناہانا سے ہمیں بڈیڈ جانا تھا جو میرے رفیق سفر مولانا عبدالرحیم صاحب کا وطن ہے۔ یہاں سڑک نہیں ہے۔ ۷-۸ میل کا یہ راستہ ہمیں سائیکل سے طے کرنا تھا۔ اونچی نیچی پگڈنڈیاں جن کو

بیل گاڑیوں کی آمد و رفت نے پامال کر رکھا تھا ہماری سائیکل کی واحد گزر گاہ تھی۔ پھیلے ہوئے کھیتوں کے درمیان جگہ جگہ ابھری ہوئی پہاڑیوں پر بستیاں آباد تھیں۔ پہلے زمانہ میں شاید حفاظت کے خیال سے بلندیوں پر مکان بنانا پسند کرتے تھے۔ ایک گاؤں جس کا نام مجھے سہری بتایا گیا عجیب منظر کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ یہ موروں کے جھنڈ تھے۔ لمبی چمک دار دُم لیے ہوئے مور اس طرح گھوم رہے تھے جیسے وہ قدرت کے اس عظیم عطیہ سے بوجھل ہو رہے ہوں۔ ایک گاؤں سے ہم لوگ گزرے جہاں کچھ چھوٹے بچے کھیل رہے تھے "کہیں جلسو ہے" (کہیں جلسہ ہے) ایک نے دوسرے سے کہا۔ داڑھی اور مذہبی حلیہ میں چند لوگوں کا سفر اس علاقہ میں یہ معنی رکھتا ہے کہ یہ قافلہ کسی تبلیغی جلسہ میں جا رہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تبلیغی جماعت کا یہاں کس قدر کام ہوا ہے اور اس کا یہاں کتنا زیادہ اثر ہے۔

مسلم عورتیں (جن کو یہاں میونی کہتے ہیں) عام طور پر باہر پھرتی ہوئی نظر آئیں۔ شاید یہاں پردہ کا کوئی رواج نہیں ہے۔ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ مکان کی نیچی سی چھت پر ایک خاتون کسی پردہ کے بغیر برسرِ عام نماز ادا کر رہی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے علی گڑھ کا ایک واقعہ یاد آیا۔ وہاں میں ایک دکان پر بیٹھا ہوا تھا دو بے پردہ عورتیں آئیں۔ انہوں نے پانی مانگا۔ پانی لے کر انہوں نے وضو کیا اور وہیں سائبان میں نماز کے لیے کھڑی ہوگئیں۔ یہ منظر علی گڑھ کی فضا میں بھی عجیب تھا۔ مگر میوات میں تو وہ عجیب تر معلوم ہوا۔

بڈیڈ میں مولانا عبدالرحیم صاحب کے والد جناب میاں جی عبدالغفور صاحب سے ملاقات میرے لیے بڑی خوشی کا باعث تھی۔ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا ہے اور ان کے ساتھ عرصے تک کام کیا ہے۔ بڈیڈ ان بستیوں میں سے ہے، جہاں میوات میں تبلیغ کا ابتدائی کام شروع ہوا تھا۔

میاں جی عبدالغفور صاحب ۳۱ سال سے معمولی ابتدائی مدرسہ میں کام کر رہے ہیں۔ ان کے لیے کئی اس سے اچھی معاش کی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ مگر وہ قانع ہو کر مدرسہ کی خدمت میں لگے رہے۔

بڈیڈ میں مولانا حسن خاں سے ملاقات ہوئی۔ یہ بارہ سال پہلے مدرسہ امینیہ دہلی سے فارغ ہوئے تھے۔ یہ میوات کے ان معدودے چند لوگوں میں ہیں جنہوں نے تعلیم کے بعد زراعت کا پیشہ اختیار کیا ورنہ تعلیم کے بعد یہاں کے لوگ زراعت یا کاروبار کو پسند نہیں کرتے۔ "مجھے اخبارات پڑھنے کی

فرصت نہیں، مگر ہفت روزہ الجمعیۃ کو میں پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں" انہوں نے کہا " آپ کے آنے سے اس میں جو کمی تھی وہ پوری ہوگئی"

بڈبیڈ میں ایک مزار ہے۔ اس میں یہاں کے مشہور بزرگ اور شاعر " بھیک جی " دفن ہیں جن کا زمانہ تین سو برس پہلے بتایا جاتا ہے۔ مولانا حسن خاں صاحب نے ان کا ایک شعر سنایا :

اہر ڈِڈ نندرا ڈِڈ اور آسن ڈِڈ بھی ہو
مرے تو سہی بھیک جی پر بڈھا کبھی نہ ہو

مطلب یہ ہے کہ کم کھانے، کم سونے اور قوت مردانگی کم استعمال کرنے پر سختی سے قائم رہو۔ موت اگرچہ اس کے بعد بھی آئے گی۔ مگر تم کبھی بوڑھے نہیں ہوگے۔

قصبہ بڈبیڈ پہاڑی کے عین دامن میں واقع ہے فجر کی نماز کے بعد ہم لوگ پہاڑی پر چڑھے تو وہاں دوسری پہاڑی تک پورا منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ ایک طرف تقریباً پانچ سو ایکڑ زمین شور ہوکر بنجر حالت میں پڑی تھی۔ معلوم ہوا کہ راجستھان کے علاقے سے پہاڑوں کا پانی آتا ہے جس نے اس پوری زمین کو بیکار کر دیا ہے اور اس کے بچاؤ کا کوئی اہتمام نہ ہوسکا۔ دس برس پہلے اسی زمین پر بہترین فصل حاصل کی جاتی تھی۔ گاؤں والوں نے بتایا کہ یہ صورت حال چک بندی کے بعد پیش آئی ہے جب کہ تمام پرانی مینڈیں ختم کردی گئیں اور اس کی وجہ سے پانی کا نظام خراب ہوگیا۔

۲۸ مئی کی صبح کو ہم بڈبیڈ سے روانہ ہوئے راستہ میں حجرہ (راجستھان) میں چند منٹ قیام کیا یہاں ایک میواتی فتقعد ملوماً محسوراً (بنی اسرائیل ۲۹) کی تصویر بنا ہوا گھر کے باہر بیٹھا ہوا تھا حال پوچھنے پر معلوم ہوا کہ شادی میں چھ ہزار روپے قرض لے کر خرچ کر دیئے۔ اب اصل مع سود کی ادائیگی کا سوال اس کے دماغ پر مسلّط ہے۔ وہ بیڑی کے کش لے کر اپنا غم غلط کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا، مجھے اس کی حالت پر اتنا دکھ ہوا کہ میں اس سے کوئی بات بھی نہ کر سکا۔

یہاں شادی کے موقع پر " منوں " میں روپیہ دینے کا رواج ہے اور جہالت کا یہ عالم ہے کہ اپنے پاس نہیں ہوتا تو سودی قرضے لے کر اور زمین رہن رکھ کر مہاجن سے حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص نے حال میں ساڑھے سات من روپیہ لیا۔

قدیم زمانے میں چاندی کے سکے ایک تولہ کے برابر ہوتے تھے اور سیر میں ۸۰ روپے تُلتے تھے

اسی حساب سے یہاں شادی میں لڑکی والا لڑکے والے کو روپیہ دیتا ہے ۔ ایک من روپیہ کا مطلب ہے تین ھزار دو سو روپیہ ۔ اس اعتبار سے ساڑھے سات من روپے کا مطلب ہوا ۲۴ ہزار روپے ۔

شادیوں کی یہ شاہ خرچی زیادہ تر مہاجنوں سے سودی قرض لے کر ہوتی ہے جس پر وہ کم و بیش ۵ روپے فی صد ماہانہ سود لیتے ہیں ۔ گویا ایک ہزار پر پچاس روپے ماہانہ سود جو سال میں چھ سو ہو جاتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ جب خرچ کے لیے روپیہ نہیں تھا تو قرض مع سود کی ادائیگی کے لیے کہاں سے آئے گا ۔ چنانچہ ان سودی قرضوں کے نتیجے میں میو قوم اپنی زمینوں کو مہاجنوں کے حوالے کر رہی ہے ۔ یہ عمل بہت تیزی سے جاری ہے اور یہی حال رہا تو مستقبل میں وہ لوگ بے زمین کہے جانے لگیں گے جو آج سب سے زیادہ زمینوں کا مالک ہونے کی وجہ سے " زمین دار" کہے جاتے ہیں ۔

اس کے بعد قصبہ بیواں (ضلع گوڑگاؤں) تھا ۔ راستہ میں ایک عجیب و غریب رنگین ہوئی چیز نظر آئی ۔ جس کو یہاں کی زبان میں بیل گاڑی کہتے ہیں ۔ ایک عجیب الخلقت ڈھانچہ کے آگے دو بیل بندھے ہوئے تھے اور اس کے اوپر دو میواتی اپنے روایتی حلیہ میں دکھائی دیتے تھے ۔

" کیا ہمیں اپنی گاڑی میں بٹھاؤ گے " میں نے گاڑی والے سے پوچھا اور اس نے بہت خوشی سے سب سے بہتر جگہ میرے لیے خالی کر دی ۔ میں سائیکل سے اتر کر گاڑی میں بیٹھ گیا تاکہ زیادہ قریب سے اس عجیب الخلقت چیز کو سمجھ سکوں جو اس علاقہ میں بیک وقت انسان سے لے کر بھس تک تمام چیزوں کی نقل و حمل کا واحد ذریعہ ہے ۔

" آپ کا نام کیا ہے " میں نے گاڑی پر بیٹھتے ہی پوچھا ۔

" نصیب خاں "

" آپ لوگ کتنے بھائی ہیں "

" پانچ "

" پانچوں بھائی کیا کرتے ہیں "

" سب کھیتی کرتے ہیں "

" کوئی دکان داری نہیں کرتا "

" نہیں "

"کیوں"

"تعلیم نہیں"

"کیا میو لوگوں کو تعلیم کا شوق نہیں"

"نہیں جی - ان لوگوں کو تو صرف ہل چلانا اور دھوپ اور گرمی میں محنت کرنا اچھا لگتا ہے -

نصیب خاں کے اس جواب سے میری سمجھ میں آیا کہ میواتی لوگ کیوں صرف قدیم طرز کی کھیتی باڑی ہی سے شوق رکھتے ہیں - غالباً ان کی صحرائی طبیعت اور بدوی مزاج کو کسی اور کام سے مناسبت نہیں -

اب ہم بیوان پہونچ چکے تھے - یہ ایک بڑا قصبہ ہے جو پورا کا پورا اونچے ٹیلے پر آباد ہے ، دور سے اس کی بلندی پر پھیلی ہوئی عمارتیں درختوں کے جھنڈ کے ساتھ بہت اچھی معلوم ہو رہی تھیں - مگر جب ہم قصبہ کے اندر داخل ہوئے تو وہی تکلیف دہ منظر یہاں بھی تھا جو تمام قدیم آبادیوں میں نظر آتا ہے - مکانات جنہیں انسانی بھٹ کہنا زیادہ صحیح ہوگا اس طرح بے ترتیب جگہ جگہ کھڑے ہوئے تھے ، جیسے کسی چٹان پر پتھروں کے تودے منتشر پڑے ہوئے ہوں - چند قدم بھی مشکل سے کوئی سیدھی سڑک ملتی ہے - یہی قصبہ اگر نشانات قائم کرکے سیدھے راستوں پر منظم نقشہ کے مطابق بنایا گیا ہوتا تو وہ اس علاقہ کا ایک قابلِ سیاحت مقام ہوتا ، مگر موجودہ حالات میں وہ صرف بے ترتیب مکانات کا ڈھیر ہے جس سے گزرتے ہوئے اکتاہٹ کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا -

۲۸ مئی کو ۱۰½ بجے ہم قصبہ پہاڑی پہونچے - یہاں قصبہ کے باہر سڑک کے بالکل کنارے درگاہ صاحب خاں پیر کی قدیم عمارت ہے جو تین سو برس پہلے تعمیر ہوئی تھی - میں نے سن تعمیر معلوم کرنے کی کوشش کی - معلوم ہوا کہ گیٹ کے اوپر ایک کتبہ ہے چنانچہ وہاں ڈرم کھڑا کرکے میں اس پر چڑھا اور کتبہ پڑھنے کی کوشش کی - جدوجہد کے بعد میں اس کو پڑھنے میں کامیاب ہوگیا - تو معلوم ہوا کہ اس پر خط شکست میں صرف یہ الفاظ کندہ ہیں :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

قدیم وضع کی ایک مسجد ہے اس سے متصل ایک چھتری نما عمارت کے نیچے مزید اور کچھ فاصلہ پر اونچا سا گیٹ جس کو مسجد اور مزار سے ملانے والی صرف وہ دیواریں ہیں جو حادثات زمانہ کی شکار ہو کر زمین بوس ہو رہی ہیں۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں مدرسہ رحیمیہ واقع ہے۔ جس کے صدر مدرس مولانا سراج الدین صاحب ہیں۔ یہ پورا مجموعہ جس کو عمارت کے بجائے کھنڈر کہنا صحیح ہوگا۔ اس کے اندر تہمد اور کرتے میں ملبوس بچے اور بڑے اس طرح چلتے پھرتے نظر آئیں گے جیسے وہ زمانہ کو سیکڑوں برس پہلے کی حالت پر ٹھہرانے کی کوشش کر رہے ہوں، مگر در و دیوار اس کے متحمل نہ ہوتے ہوں۔ مولانا رحیم شاہ صاحب (مقیم دہلی) کی خصوصی توجہ سے ایک طرف درس گاہ کی نئی عمارت بنائی گئی ہے جس پر تقریباً ۱۵ ہزار روپے کی لاگت آئی ہے۔

ظہر کی نماز کے لیے مسجد میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ چھوٹی سی مسجد، جو "مسجد" بننے کے لیے بھی ناکافی ہے، وہ بیک وقت عبادت گاہ بھی ہے اور اسی کے ساتھ اقامت گاہ سے لے کر پانی کے مٹکے رکھنے تک کی جگہ بھی۔

اس درس گاہ سے متعلق بارہ بیگہ زمین ہے مگر وہ اس حال میں پڑی ہوئی ہے کہ اس کی حد بندی تک نہیں ہوئی۔ اصل عمارت کا حال بھی یہ ہے کہ شمال و جنوب دونوں طرف کی دیواریں گر گئی ہیں اور مدرسہ کا ہر سامان غیر محفوظ حالت میں اس کے اندر پڑا رہتا ہے۔ یہاں دینی مدرسہ کا یہ حال ہے اور اس کے گرد میو قوم تقریبات اور شادیوں میں اپنی گاڑھی کمائی کے لاکھوں کروڑوں روپے غیر اقوام کی جیبوں میں پہنچا رہی ہے۔

پہاڑی سے گلپاڑہ کے لیے جاتے ہوئے ایک منظر میرے لیے بڑا عجیب ثابت ہوا۔ ایک میو اور ایک میونی سڑک کے کنارے چلے جا رہے تھے۔ میو کی بغل میں چھوٹا سا بچہ تھا اور سر پر ایک چھوٹا سا کھٹولا۔ (جس کو یہاں کی اصطلاح میں پیڑھا کہتے ہیں) دوسری طرف میونی کا حال یہ تھا کہ وہ ایک بڑا بکس اور اس کے اوپر بھری ہوئی بوری سر پر رکھے اس کے بوجھ کے نیچے دبی جا رہی تھی۔ مرد کے چہرہ پر خفیف سی شرمندگی کے آثار بھی نہیں تھے۔ میں نے ایک صاحب سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو اس نے بتایا کہ یہ تو معمولی بات ہے۔ اگر آپ ان کو قریب سے دیکھیں تو اس سے زیادہ بے حسی کے مناظر دیکھیں گے۔ میوات کی روایات میں یہ بھی ہے کہ یہاں صنف نازک کو صنف کرخت سے بھی زیادہ کام کرنے پڑتے ہیں۔

بس کے انجن میں کوئی خرابی آگئی تھی جس کی وجہ سے ڈرائیور نے اس کو روک کر بنانا شروع

کیا ایک میو مسافر بولا :

" خواہ مخواہ گاڑی روک دی "

اس کے نزدیک انجن کی خرابی کے کوئی معنی نہیں تھے۔ کیونکہ " جب ہماری گاڑی رُکتی ہے تو ہم لاٹھی سے اس کو چلا لیتے ہیں "

کنڈکٹر کو اس کی باتوں پر ہنسی آ گئی، اس نے کہا کہ میو لوگ تو ایسے ہیں کہ کل ایک شخص نے ہم سے گلپاڑہ سے نگر کا کرایہ پوچھا، ہم نے کہا ۷۵ پیسے تو وہ بگڑ گیا۔ اس نے گالی دے کر کہا " فلاں گاڑی والا تو بارہ آنے میں لے جاتا ہے اور تم ۷۵ پیسے مانگ رہے ہو "

یہاں غیر مسلموں کی نظر میں میو قوم ایک بیوقوف قوم کی حیثیت سے ضرب المثل ہے۔ وہ اس درجہ انہیں معذور سمجھتے ہیں کہ ان کی اس طرح کی باتوں پر بگڑنے کے بجائے ہنستے ہیں۔

۲۸ مئی کی شام کو ۵½ بجے ہم گلپاڑہ (ضلع بھرت پور) پہونچے اور یہاں رات سے لے کر اگلے دن تک قیام کیا

گلپاڑہ میں بازار کے پیچھے کی طرف ایک کھلے میدان میں تین میو خاندان آباد ہیں اور یہیں ایک چھوٹا سا مدرسہ اسلامیہ بھی ہے جس کو ۱۹۵۹ء میں قائم کیا گیا تھا۔ آج کل صوفی نور محمد صاحب اس کو سنبھالے ہوئے ہیں طلباء کی تعداد تقریباً پچاس ہے۔

حاجی مل خاں یہاں کی خاص شخصیت ہیں جو مولانا الیاس صاحب کے زمانے سے تبلیغ سے وابستہ رہے ہیں بیسیوں بار نظام الدین جا چکے ہیں اور چلّہ بھی دیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ مولانا الیاس صاحب کی کچھ بات بتائیے۔ مگر اب انہیں کوئی بات یاد نہیں تھی۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے بارہ برس کی عمر میں انہیں دیکھا تھا۔

" آپ کی عمر کیا ہے " میں نے دریافت کیا

" یہی جی باون برس ہو گی "

یہ جواب سن کر مجھے تعجب ہوا، کیوں کہ ان کے بال مکمل طور پر سفید ہو چکے ہیں اور بڑھاپے کے آثار شدت سے نمایاں ہیں۔ میرا اندازہ تھا کہ ان کی عمر غالباً ۶۵ برس ہو گی۔

معلوم ہوا کہ حوادث نے انہیں قبل از وقت بوڑھا کر دیا ہے ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں انہیں گھر

چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ وہ ڈیڑھ برس تک دوسری جگہ پڑے رہے۔

۱۹۴۷ء میں گھاسیڑہ میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں گاندھی جی کو بلا کر شریک کیا گیا تھا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا تھا:

"میو قوم ہندستان کی ریڑھ کی ھڈی ہے"

اس کے بعد فضا بدلی۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے پنڈت نہرو سے کوشش کر کے سرکلر جاری کرایا اور وہ پٹواریوں کے ذریعہ ایک ایک گاؤں میں پہونچایا گیا کہ تمام لوگوں کو دوبارہ اپنے مکان اور اپنی زمینوں پر بسایا جائے۔

اس کے بعد حاجی مل خاں صاحب دوسرے بے شمار لوگوں کی طرح دوبارہ اپنے گھر اور اپنی زمین پر واپس آئے۔

یہاں میں نے میو خاندان کے شب و روز کو قریب سے دیکھا۔ صبح سویرے چکی کی آواز کے ساتھ ان کی سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں، کیونکہ ان کا خیال ہے کہ گھر کا پسا ہوا آٹا زیادہ اچھا ہوتا ہے اس کے بعد شام کو آخری بار بیل کو کھلانے تک ان کے مرد، عورت، بچے سب کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ میں نے ایک میونی کو دیکھا وہ کھیت سے چلی آرہی تھی۔ ایک ہاتھ سے بغل کے بچے کو سنبھالے ہوئے تھی اور دوسرے ہاتھ سے سر کا ٹوکرا پکڑے ہوئے تھی۔ اسی طرح تمام عورتیں دن بھر اندر اور باہر کے کاموں میں مشغول رہتی ہیں۔ دوسری طرف ایک نوجوان میو گول لکڑی کی بڑی سی موگری لے کر مونج کو کوٹ کر اس کا ریشہ نکال رہا تھا۔ میں نے سوچا اگر وہ کسی چپٹی لکڑی سے کوٹتا تو زیادہ چوٹ پڑتی اور نصف محنت سے کام ہو جاتا۔ مگر میو قوم زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں سمجھتی، وہ اندھا دھند محنت کرنا جانتی ہے، خواہ اس کے قریب ہی کم محنت سے وہی نتیجہ حاصل کرنے کے مواقع کیوں نہ موجود ہوں۔

حاجی مل خاں صاحب ایک سنجیدہ اور سمجھ دار آدمی ہیں، خیر خیرات میں آگے رہتے ہیں دین کی خدمت کرنا ان کا مشغلہ ہے۔ ان کے پانچ لڑکے ہیں اور سب کے سب کھیتی باڑی میں لگے رہتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا "میو لوگ تجارت کیوں نہیں کرتے"

"ای ہوئے علم سُو پیسہ سُو" انھوں نے جواب دیا۔ یعنی تجارت وہ کام ہے جو علم اور پیسہ سے

ہوتا ہے۔ اور میو کے پاس نہ علم ہے نہ پیسہ۔

میو قوم کی ہمت اور جفاکشی کا اندازہ مجھے ایک ذاتی واقعہ سے ہوا۔ نگینہ سے ہمیں بڈبڈ ہوتے ہوئے پہاڑی جانا تھا اور وہاں سے گلپاڑہ ہوتے ہوئے الور روانہ ہونا تھا۔ نگینہ میں ایک "مولوی صاحب" نے ذمہ داری لی کہ وہ ہماری اٹیچی ۲۸ مئی کی صبح کو پہاڑی میں دے دیں گے کیوں کہ وہ اسی طرف جارہے ہیں۔ ہم پہاڑی پہونچے تو یہاں کہیں ان کا پتہ نہ تھا۔ اس کے بعد ہم گلپاڑہ چلے گیے۔

گلپاڑہ میں حاجی مل خاں صاحب کے صاحبزادے ظہور الدین (۲۶ سال) کو یہ خدمت سپرد کی گئی کہ وہ بیواں (مولوی صاحب موصوف کے وطن) جاکر معلوم کریں کہ کیا قصہ ہوا۔ ظہور الدین صاحب بیواں گیے جو گلپاڑہ سے ۱۶ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ بیواں میں معلوم ہوا کہ مولوی صاحب ابھی گھر نہیں پہونچے ہیں۔ ظہور الدین صاحب کی ذمہ داری بظاہر یہاں ختم ہوگئی تھی۔ وہ واپس آکر کہہ دیتے کہ مولوی صاحب نہیں ملے۔ مگر ظہور الدین نے مزید پتہ لگایا کہ مولوی صاحب کہاں رُک گیے ہیں، معلوم ہوا کہ وہ کسی شادی کے سلسلہ میں فیروز پور جھرکہ ٹھہر گیے ہیں۔ فیروز پور بیواں سے ۸-۹ میل کے فاصلے پر ہے۔ رات کے وقت وہ سائیکل سے فیروز پور پہونچے، وہاں ڈھونڈ کر انھیں برآمد کیا، اور ان سے سامان لے کر اگلی صبح کو سائیکل سے گلپاڑہ آئے اور سامان ہمارے حوالہ کیا۔

گلپاڑہ میں ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد ہم سڑک پر پہونچے تاکہ الور کے لیے بس پکڑ سکیں۔ ایک بس آئی۔ رُکی تو معلوم ہوا کہ یہ مخصوص گاڑی ہے جس میں ایک ہندو بارات سوار ہے۔ بارات کے لوگ عام طور پر مسافروں سے بات بھی نہیں کرتے۔ مگر اس نے ہمارے اشارے پر بس روکی اور ہم کو سوار کرکے نگر تک پہونچایا۔

نگر میں ہم نے کچھ وقت یہاں کے مدرسے میں گزارا اور پھر ۲۹ مئی کی شام کو الور کے لیے روانہ ہوئے۔

الور میں ۳۰ مئی کی صبح کو ہم ماسٹر امر سنگھ سے ملاقات کے لیے نکلے، اتفاق سے وہ راستہ ہی میں مل گیے۔ میں نے کہا، آپ شاید کسی کام سے جارہے تھے تو آپ اپنا کام کرلیں، پھر ملاقات

ہوگی۔ انھوں نے کہا ہمارے یہاں ایک مثل ہے "کام چھوڑے کام ہوتا ہے" یعنی اگر ایک کام کرنا ہے تو اس کے لیے دوسرے کام کو چھوڑنا پڑے گا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ آدمی بیک وقت سارے کام کر ڈالے۔

ان کی گفتگو بڑی معلوماتی ہوتی ہے، خاص طور پر تاریخ سے انھیں کافی واقفیت ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مغل دور میں میوات کا الگ صوبہ تھا اور اس کے الگ صوبیدار ہوتے تھے انھوں نے بہت سے واقعات سنائے اور کہا کہ "مغل دور اینڈ منسٹریٹو پوائنٹ آف ویو سے اور جنتا کی اپ لفٹ کے اعتبار سے بہترین دور تھا۔ دماغ سے پارشیلیٹی کو نکال کر دیکھا جائے تو اس حقیقت کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوسکتی"

انھوں نے کہا کہ ریاست الور میں مہاراجہ بنے سنگھ نے مرزا غالب کے باپ دولے خاں کو اپنی فوج کا کمانڈر انچیف بنایا تھا۔ اسی طرح مغل فوجوں میں کثرت سے راجپوت کمانڈر ہوا کرتے تھے۔

انھوں نے کہا کہ ریاست میں یہ فضا ہمیشہ موجود تھی۔ راجپوت جب کسی بستی میں جاتے تو وہ میو (مسلمان) خاندان میں قیام کرتے تھے۔

میو بورڈنگ قائم کرنے میں جن لوگوں نے حصہ لیا، ان میں ایک خاص شخص کرنل مادھو سنگھ جی بھاٹی (راناوڈھ) تھے۔ انھوں نے مہاراجہ تیج سنگھ (الور) سے کہہ کر اس کے لیے زمین دلوائی اور اپنی پلٹن سے چندہ دلوایا۔

اس گفتگو کے وقت کرنل صاحب کے لڑکے کپتان وجے سنگھ بھی موجود تھے۔ انھوں نے کہا: "پہلے ہندو مسلمان کا کوئی سوال نہیں تھا۔ اس قسم کے ڈسٹنکشن تو اب پیدا ہوئے ہیں۔"

ماسٹر امر سنگھ نے میو قوم کی بہت تعریف کی۔ میں نے پوچھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ میو بیوقوف ہوتے ہیں کیا یہ صحیح ہے" انھوں نے جواب دیا:

"سیدھے آدمی کو لوگ بے وقوف کہتے ہیں"

میوات کے لیڈروں کا ذکر آیا تو ماسٹر امر سنگھ نے کہا کہ اس علاقہ میں سب سے پہلا

چودھری جس نے لیڈر کا مقام حاصل کیا وہ چودھری لیسین خاں (۱۸۹۶-۱۹۷۰) ہے ان کی تعلیم بی۔ اے تک ہے۔ ۱۹۴۶ء میں پنجاب اسمبلی کے لیے ایم، ایل، اے منتخب ہوئے تقسیم کے بعد اس علاقہ میں فساد ہوا اور مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے تو انھوں نے مسلمانوں کو دوبارہ جمانے میں خصوصی پارٹ ادا کیا۔ انھوں نے قوم کی کافی خدمت کی۔

ان کے صاحبزادے چودھری طیب حسین خاں کی بھی ماسٹر صاحب نے بہت تعریف کی تیسرے الیکشن کے بعد طیب حسین خاں پنجاب میں محکمۂ صحت کے ڈپٹی وزیر مقرر ہوئے۔ ماسٹر صاحب نے ان کی بہادری، ان کے کیرکٹر اور ان کی انسانیت دوستی کی بہت تعریف کی۔ انھوں نے اس کو ایک المیہ بتایا کہ پچھلے الیکشن میں چودھری طیب حسین خاں کو ناکامی ہوگئی۔

انتخابی نتیجہ کی وجہ ایک کے مقابلہ میں دوسرے کی لیاقت نہیں تھی بلکہ گوت پال کا نعرہ تھا۔ چودھری طیب حسین خاں اس الیکشن میں فیروز پور جھرکہ کے حلقہ سے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ چوں کہ اس علاقہ کے مقامی باشندے نہیں تھے اور اس کے برعکس ان کے مقابل میں جو صاحب تھے وہ مقامی باشندوں کے ہم قبیلہ یعنی جھرک لوت تھے، اس لیے اوّل الذکر ناکام اور ثانی الذکر کامیاب ہوگیے۔ حالاں کہ صلاحیت اور خدمت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی نسبت نہیں تھی۔" انھوں نے کہا:

الور سے دلی جانے والی ٹرین پر بیٹھیں تو پچھم کی طرف ارولی پہاڑ کے دامن میں بسا ہوا الور شہر نظر آئے گا اور پورب کی طرف پہلے اور دوسرے سگنل کے درمیان وہ مسجد دکھائی دے گی جو الور کی ایک سو گیارہ مسجدوں کے خاتمہ کے بعد شہر کی واحد مسجد ہے جو دوبارہ تعمیر کی جارہی ہے اور جہاں مسلمان نظر آتے ہیں۔

دو مہینے پہلے اپریل ۱۹۶۹ء میں جب میں پہلی بار الور آیا تھا تو میں نے دیکھا تھا کہ مکمل طور پر برباد شدہ مسجد کی قدیم بنیادوں پر دوبارہ تعمیر شروع کی گئی ہے۔ مگر اس کو از سر نو مسجد کی شکل دینے کی کوشش نصف دیواروں تک پہونچ کر رُک گئی ہے۔ اس وقت میرے سامنے ایک پر حسرت نقشہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ الور میں ملت اسلام نے اپنی بربادی کو دوبارہ ایک فراموش شدہ واقعہ بنانے کی کوشش کی تھی مگر وہ اس میں کامیاب

نہیں ہوئی۔

دو مہینے کے بعد ۳۰ مئی کو میرا جو دوسرا سفر ہوا تو نقشہ کسی قدر مختلف نظر آیا۔ اب دیواروں کو مکمل کرکے اس پر چھت ڈالی جا چکی تھی اور کام جاری تھا۔ معلوم ہوا کہ پچھلی بار میں نے روداد سفر میں الور کی مسجد کا جو ذکر کیا تھا اس سے متاثر ہو کر ڈاکٹر موثق الدین صاحب (بمبئی) نے ایک ہزار روپے روانہ فرمائے ہیں جن کو پاکر یہاں کے لوگوں کی مزید ہمت بندھی اور انھوں نے پھر سے کام شروع کر دیا۔

اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو جزائے خیر دے مگر جو کام پیش نظر ہے اس کے اعتبار سے ابھی بہت سے "ڈاکٹر موثق الدین" کی ضرورت ہے۔ ۵۰ فٹ لمبی اور ۲۰ فٹ چوڑی مسجد پر پتھر کی چھت ڈالنے کے لیے چھ عدد لوہے کے گرڈر استعمال کیے گئے ہیں صرف انھیں کی قیمت تقریباً ایک ہزار روپیہ ہو جاتی ہے۔ مسجد کے تحفظ اور الور میں دوبارہ اسلام کو زندہ کرنے کے لیے اس کے کچھ اور تقاضے بھی ہیں۔ مثلاً یہاں مدرسہ تعمیر کیا جائے۔ مسجد کی پوری زمین پر باؤنڈری گھیر دی جائے۔ یہاں امام، موذن، طلبہ اور اساتذہ کے ٹھہرانے کا انتظام ہو۔ تاکہ یہ جگہ "قبضہ" میں رہے اور یہاں ایسی سرگرمیاں شروع ہو سکیں، جس سے یہ جگہ الور میں ایک قسم کا اسلامی مرکز بن جائے، جہاں اسلام کا لٹا ہوا قافلہ دوبارہ اپنے کو منظم کرکے سفر شروع کرنے کے قابل ہو سکے۔

محض ایک سفر کی روداد پڑھ کر ایک مسلمان ڈاکٹر کا ہزار روپیہ الور کی مسجد کے لیے بھیج دینا میرے نزدیک بڑی خوش گوار علامت ہے۔ اگر ہم ملت کی برباد شدہ عمارت کو دوبارہ اٹھانا چاہتے ہیں تو ہم کو اپنے اندر یہی فضا پیدا کرنی ہوگی کہ جب ضرورت سامنے لائی جائے تو لوگ خود سے اس کے لیے دوڑ پڑیں۔ اس کا انتظار نہ کریں کہ رسیدیں چھپوا کر چندہ مانگنے والے ان کے پاس پہونچیں اسی وقت وہ دینے کی زحمت گوارا کریں گے۔

یاد رکھیے آج اس ملک میں ملت کے جو مسائل ہیں وہ آپ میں سے ہر شخص کے ذاتی مسائل ہیں۔ اگر ملت مضبوط ہوتی ہے تو آپ بھی یہاں جینے کی زمین پا سکتے ہیں۔ اور اگر ملت کمزور ہوئی تو انفرادی خیمے بھی نہیں بچ سکتے، خواہ ان کی طنابوں کو کتنا ہی مضبوط بنانے کی کوشش

کی گئی ہو۔

۳۰ مئی ۱۹۶۹ کو الور کی جامع مسجد میں جمعیۃ کے اجتماع کے موقع پر خطاب کا موقع ملا۔ میں نے کہا کہ الور میں اور پورے میوات میں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ میو قوم میں کافی دینداری پیدا ہوگئی ہے۔

چہروں پر داڑھیاں نظر آتی ہیں۔ ہاتھوں میں تسبیح دکھائی دیتی ہے۔ نمازی ہونے کا نشان ان کی پیشانیوں پر ثبت ہے۔ وہ دینی جذبے کے تحت چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ یہ سب باتیں بڑی خوشی کی ہیں، مگر اس کے ساتھ ایک اور چیز کی ضرورت ہے اور وہ علم ہے۔ علم نہ ہو تو آدمی نہ دین کو ٹھیک طور پر سمجھ سکتا ہے اور نہ دنیا کو۔

میں نے کہا کہ آپ کو دینداری کے ساتھ علم کو بھی جمع کرنا ہے۔ اور علم دو ہوتے ہیں۔ ایک دین کا علم اور دوسرے دنیا کا علم۔

میں نے کہا کہ الور میں دوبارہ آیا ہوں اور یہاں کے حالات کے جائزہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ آپ کو دو کام کرنا ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ اس مسجد کو جہاں آپ اس وقت نماز کے لیے جمع ہوئے ہیں، آباد کریں۔ آپ کو معلوم ہے کہ تقسیم کے بعد یہ مسجد کھنڈر ہوگئی تھی۔ برسوں تک یہاں کوئی اذان دینے والا بھی نہ تھا۔ اس کے بعد مسلمان یہاں آئے اور چھپّر ڈال کر یہاں نماز قائم کی گئی۔ آج آپ چھت کے نیچے نماز پڑھ رہے ہیں۔ یہ بڑی خوش آئند علامت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری ملّت کھنڈر کے اوپر از سر نو تعمیر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مسجد کی تکمیل کے ساتھ آپ کو یہاں ایک دینی مدرسہ بھی بنانا ہے، تاکہ یہ جگہ الور میں اسلامی مرکز کی حیثیت اختیار کر سکے۔

دوسرا کام جس کی طرف میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ میو بورڈنگ کو زندہ کرنا ہے یہاں ۲۸ کمرے ہیں جن میں ایک سو طلبہ مفت رہ سکتے ہیں۔ مگر تعلیمی بے شعوری کا یہ عالم ہے کہ بورڈنگ ہاؤس خالی پڑا ہوا ہے۔ لڑکے نہیں ملتے جو یہاں رہ کر تعلیم جاری رکھ سکیں۔ آپ کو کوشش کرنی ہے کہ یہ بورڈنگ آباد ہو۔ میو نوجوان یہاں کی رہائشی سہولت سے فائدہ اٹھا کر اسکول اور کالج کی تعلیم حاصل کریں تاکہ علوم دنیا میں آپ دوسروں کے ہمسر ہو سکیں۔

تیسرا سفر

میرا یہ سفر اصلاً الور کے لئے تھا۔ مگر رفیق سفر مولانا عبدالرحیم بڈیڈوی کے مشورہ سے یہ طے ہوا کہ راستہ میں چند جگہوں پر اتر اجائے۔

ہماری پہلی منزل گوڑگاؤں تھی۔ یکم اگست ۱۹۶۹ء کی صبح کو جب کہ رکشا مجھے اور مولانا عبدالرحیم صاحب کو چودھری محمد یٰسین صاحب کی قیام گاہ کی طرف لے جارہا تھا۔ ہماری باتوں کو سُن کر رکشے والا اچانک بولا ـــــ "چودھری یٰسین ...... ان کا حال تو یہ ہے کہ رات کو اٹھ کر تنہا جنگل چلے جاتے ہیں اور بھگوان کی دیا ان پر ایسی ہے کہ شیر ان کے تلوے چاٹتا ہے"۔

مگر یہی شخص جو کبھی میوات کا شیر تھا عمر نے اس کو نڈھال کر کے بستر پر ڈال دیا ہے۔ ان کی نقاہت اور نحیف آواز کے ساتھ ان کی گفتگو کو دیکھ کر میں نے پوچھا "آپ کی عمر کیا ہوگی"

چودھری صاحب نے اس کا کوئی جواب دینے کے بجائے یہ فقرہ دہرایا:

صورت ببیں حالت مپرس

میں نے بہت اصرار کیا کہ وہ اپنے پچھلے زمانہ کے کچھ حالات بتائیں. مگر انھوں نے کہا "کام سے مطلب ہے نام سے کیا فائدہ"

وہ ہندستان کے مسلمانوں سے مایوس ہیں۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کو بیدار کرنے کوشش "مردہ کو انجکشن لگانا ہے"۔

جمعہ کا دن تھا اس لئے ہمارا خیال تھا کہ نوح میں جمعہ پڑھ کر جمعہ بعد الور کے لئے روانہ ہوں گے۔ نوح الور کے راستہ میں پڑتا ہے۔ مگر جب ہم گوڑگاؤں سے بس پر بیٹھے تو ڈرائیور اتنا اچھا تھا کہ ہم نے طے کیا کہ اب سیدھے الور جائیں گے۔ اس نے کہا ـــــ ہم آپ کو الور میں جمعہ کی نماز پڑھائیں گے"۔ اور واقعی انھوں نے الور میں نماز پڑھا دی۔

یہ ایک سردار تھے جن کا نام ہے درشن سنگھ پدھیڑ۔ اپنا نام بتانے کے بعد جب انھوں نے اس کا مخفف ڈی، ایس، پی (D.S.P.) بتایا تو مسافر ہنس پڑے۔ "وہ تو اپنے آپ بنتا ہے"۔ سردار جی نے کہا اور لوگ خاموش ہوگئے۔

سردار جی نے کہا "میں ہندو، مسلمان، سکھ سب سے یکساں طریقہ سے ملتا ہوں"۔ کیا رکھا ہے ان باتوں میں" اور مجھے محسوس ہوا کہ سردار جی کے ان الفاظ میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں ہے۔ کیوں کہ میں نے دیکھا کہ مسافروں کے ساتھ ان کا سلوک عین ان کے بیان کے مطابق تھا۔ ایک غریب داڑھی والے مسلمان سے بھی ان کا سلوک ویسا ہی تھا جیسے کسی پتلون پوش غیر مسلم کے ساتھ۔

ایک اسٹیشن پر ایک غریب شخص نے ان سے سگریٹ مانگا" تمہارے لئے خون بھی حاضر ہے۔ کیا چیز ہے سگریٹ"، یہ کہا اور فوراً سگریٹ پیش کر دی۔ ان کی اس خوش خلقی کا مظاہرہ پورے سفر میں ہوتا رہا۔

سردار جی کو ڈرائیوری پر مکمل قدرت ہے۔ پورے راستہ پر نہایت شان کے ساتھ گاڑی لے آئے اور تین گھنٹے سے بھی کم میں ٹھیک ایک بجے گاڑی الور پہنچادی۔

جمعہ کی نماز ہم نے الور میں پڑھی۔ خطبہ سے پہلے مولانا ابراہیم صاحب کی فرمائش پر میں نے ایک مختصر سی تقریر کی۔

اگر ۱۹۴۷ء کے زمانہ میں کوئی شخص یہاں آتا تو وہ دیکھتا کہ قدیم الور کے مشرقی جانب ریلوے لائن کے ایک طرف میدان ہے جو پہاڑ کی اونچی دیوار کے سایہ میں دور تک چلا گیا ہے اور ریلوے لائن کی دوسری جانب ایک برباد شدہ مسجد ہے جو کھنڈروں کی شکل میں اپنے وارثوں اور سرپرستوں کی خاموش تلاش میں پڑی ہوئی ہے۔

اگر آپ آج الور کے اس حصہ کا مشاہدہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ۲۰ سال گزرنے کے بعد بھی مسجد کو تو اس کے "سرپرست" نہ مل سکے۔ مگر دوسری طرف عمارتوں کی قطاریں اور دھواں اڑاتی ہوئی چمنی بتا رہی ہے کہ اس کو ایسے سرپرست مل گئے جنھوں نے اس خالی زمین کی فریاد کو سنا اور اسے مکمل طور پر آباد کر دیا۔ (اب یہ مسجد مکمل ہو گئی ہے)

الور میں کچھ مسلمان بیٹھے ہوئے دھولی دوب (ضلع الور) کی ایک درگاہ کا ماتم کر رہے تھے۔ "دس لاکھ کی جائداد ہے دس لاکھ کی...... یہ مسلمانوں کی ایک زبردست ملکیت تھی۔ آج غیر مسلموں نے اس پر قبضہ کر رکھا ہے"۔

مجھے شوق ہوا کہ میں اس مرثیہ کا موضوع اپنی آنکھ سے دیکھوں۔ شام کے وقت ہم دھولی دوب

پہنچے۔ یہ پہاڑ کے دامن میں بسا ہوا ایک گاؤں ہے جو اپنی خوش وضع عمارتوں کے ساتھ خاموش اعلان کر رہا ہے کہ یہاں کے کسان خوش حال ہیں۔ تقریباً ۴۰ گھر مسلمان ہیں اور ۲۰ - ۲۵ گھر ہندو ہیں جو زیادہ تر ہریجن اور بڑھئی وغیرہ ہیں۔

بستی کے باہر قلعہ نما فصیل کے ساتھ وہ عظیم عمارت ہے جس کو دیکھنے کے لئے ہم یہاں آئے تھے۔ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ یہ "لال خاں" کا مقبرہ ہے۔ مگر عملاً آج اس پر ہندوؤں کا قبضہ ہے اور انھوں نے اس پر "مہا تما لال داس جی" کی سمادھی کا بورڈ لگا رکھا ہے۔ اگرچہ ہندو صاحبان کے لئے یہ بات بہت عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے بزرگ کی قبر بنا کر اس کو درگاہ کی شکل دیں۔

ہم اندر داخل ہوئے تو ایک نہایت خوش نما منظر سامنے تھا۔ قدیم وضع کی عمارت جو جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی، اس کی مرمت کر کے بہتر بن بنا دیا گیا ہے۔ موزیک کا فرش اور پوری عمارت کی سفیدی مزید رونق پیدا کر رہی ہے۔

اس درگاہ کے ساتھ کافی زمین بھی ہے۔ پورا رقبہ آٹھ بیگہ کا ہے۔ تقسیم سے پہلے اور اس کے فوراً بعد تک یہ ویران قبرستان کی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر آج وہاں چمن بنا ہوا ہے۔ چاروں طرف لیموں اور پپیتے کے درخت لگا دئے گئے ہیں۔ آلو کی کاشت بھی ہوتی ہے۔ ایک طرف بجلی لا کر پمپ بھی لگا دیا گیا ہے جس سے سینچائی ہوتی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ موجودہ سال میں انھوں نے چودہ ہزار کا پپیتہ فروخت کیا ہے اور پمپ کے ذریعہ دوسروں کی سینچائی کر کے موجودہ فصل میں پانچ ہزار روپے کمائے ہیں۔

اس ہرے بھرے باغ میں موروں کی بڑی تعداد بے فکری کے ساتھ اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی جیسے انھیں یہ شعور حاصل ہو کہ وہ "قومی پرند" قرار دئے گئے ہیں۔ اور ان کے لئے اس ملک میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کوئی مور دم اٹھا کر ناچ رہا تھا، کوئی اپنی لمبی خوبصورت دم پھیلائے چہل قدمی کر رہا تھا۔

مجھے بتایا گیا کہ صبح کو روزانہ یہاں کے "باباجی" موروں کو دانہ کھلاتے ہیں۔ اس وقت سارے مور ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں باباجی ہمارے ساتھ گھوم رہے تھے اور بڑی دلچسپی کے ساتھ ساری چیزیں دکھا رہے تھے۔ میں نے کہا "صبح کے وقت باباجی موروں کے جھرمٹ میں بڑے سندر لگتے ہوں گے"۔ اور سب لوگ ہنس پڑے۔

یہاں مجھے اپنا اور برادران وطن کا فرق دیکھ کر بڑی عبرت ہوئی۔ انھیں دھولی دوب کی درگاہ ملی

توانھوں نے اپنے باباجی کو اتنا مالیاتی تعاون دیا کہ آج وہ ایک چمنستان معلوم ہوتا ہے۔ دوسری طرف الور کی مسجد اور مدرسہ اور اس سے ملحق زمین کی تعمیر وانتظام کے لئے فریاد کی جا رہی ہے اور چند مسلمانوں کے سوا کسی کو توفیق نہیں ہوئی کہ وہ اس کے منتظمین کو وہ مالیاتی سہارا دینے کی کوشش کرے جس سے وہ اس اجڑے ہوئے علاقہ کو دوبارہ چمنستان بنا سکیں۔

اس قسم کے عبرت کے نمونے اس علاقہ میں بہت ہیں۔

الور سے چھ میل کے فاصلے پر وہ مقام ہے جس کو "وجے ساگر" کہتے ہیں۔ یہ مہاراجہ الور کے مختلف محلات میں سے ایک محل ہے جہاں ان کے ایک صاحبزادے مقیم ہیں۔

ہم محل کے قریب پہنچے تو پتھر کی قلعہ نما دیوار دور تک پھیلی ہوئی اس کا احاطہ کئے ہوئے تھی "بڑی زبردست دیوار ہے یہ" اس کو دیکھ کر معاً مجھے خیال آیا۔ مگر جب ہم اس قلعہ نما فصیل کے برابر والی سڑک پر چل رہے تھے تو ہم نے دیکھا کہ وہ جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی ہے۔ اور بعض مقامات پر اس میں بڑے بڑے سوراخ ہوگئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ ملے ہوئے پہاڑ سے ہبوط (Land Slide) کی وجہ سے ہوا ہے جگہ جگہ فصیل کے قریب بڑی بڑی چٹانیں پڑی ہوئی تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ کس طرح پتھر اوپر سے گر کر فصیل کی توڑ پھوڑ کرتے رہتے ہیں۔

"انسان کی ہر تعمیر قدرت کی زد میں ہے" اس منظر کو دیکھ کر یکایک مجھے خیال ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ اس واقعہ میں نصیحت لینے والوں کے لئے بہت بڑی داستان چھپی ہوئی ہے۔

دھولی دوب کے ایک کسان مولوی عبدالرحمٰن صاحب کے مکان پر ہم پہنچے تو ان کا خوبصورت نو تعمیر مکان جس میں بجلی وغیرہ لگی ہوئی تھی مکمل طور پر بند تھا۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب ہمارے ساتھ الور سے آئے تھے، مگر کنجی ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے وہ گھر کھول نہ سکتے تھے۔ معلوم ہوا کہ ان کی عورتیں کھیت پر گئی ہوئی ہیں۔

عبدالرحمٰن صاحب کی ساٹھ بیگھہ کی بہت اچھی کھیتی ہے۔ انھوں نے ٹیوب ویل بھی لگا رکھا ہے۔ مگر یہاں کا عام رواج ہے کہ مرد، عورت، بچے سب کام کرتے ہیں، یہاں پردہ مطلق نہیں ہے۔

عبدالرحمٰن صاحب کی مشکوٰۃ، جلالین تک تعلیم نوح میں ہوئی ہے۔ اس کے بعد دورۂ حدیث انھوں نے نظام الدین کے مدرسہ سے کیا ہے۔

وجے ساگر سے واپسی میں دھولی دوب میں کچھ دیر قیام رہا۔ اب مولوی عبدالرحمٰن صاحب کا مکان

کھل چکا تھا۔ مغرب کی نماز ہم نے یہیں پڑھی۔ یہاں سے روانگی میں اتنی دیر ہوئی کہ اندھیرا ہوگیا۔

دھولی دوب سے الور تک عمدہ قسم کی پختہ سڑک ہے۔ ہمارے ایک طرف اروَلی پہاڑ کا سلسلہ اس طرح نظر آرہا تھا جیسے زمین کی پشت پر لمبی کوھان ابھر آئی ہو۔ دوسری طرف کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ماحول بالکل تاریک تھا۔ دور دور دیہاتوں کی روشنیاں اس طرح متفرق طور پر ٹمٹماتی ہوئی نظر آتی تھیں گویا انسان نے گہری تاریکی میں کہیں کہیں امید کے دیے جلا رکھے ہوں۔ کچھ دیر کے بعد قریب کی ریلوے لائن سے ایک پسنجر ٹرین گزری۔ تاریکی کی وجہ سے اصل ٹرین تو دکھائی نہیں دیتی تھی۔ البتہ ڈبوں کی روشنیاں اس طرح نظر آرہی تھیں جیسے بہت سی روشنیوں کو جوڑ کر ایک زنجیر بنالی گئی ہو۔ اس علاقہ میں مور بہت ہیں۔ اندھیرا ہوتے ہی خوبصورت پرندوں کی بھاری آوازیں اس طرح فضا میں بلند ہونے لگی تھیں جیسے وہ قدرت کے خلاف احتجاج کر رہے ہوں کہ کیوں اس نے تاریک رات کا پردہ ڈال کر ان کو اپنے خوبصورت پروں کی نمائش سے محروم کر دیا ہے۔

راستہ میں مولوی عبدالرحمٰن صاحب سے باتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے گاؤں میں ایک مدرسہ ہے مگر انھیں استاد نہیں ملتا۔ انھوں نے کہا کہ ہم استاد کو خوراک کے علاوہ ۲۵ روپے اور ڈیڑھ من اناج ماہوار دیتے ہیں جو اس علاقہ کے عام رواج سے زیادہ ہے۔ پچھلی بار ایک استاد آئے۔ انھوں نے کہا کہ میں تنہا نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ ہم نے چندہ کر کے پندرہ سو روپے اکھٹا کئے اور ان کے لئے مکان بھی بنوا دیا۔ مگر اس کے بعد ان کے "خسر صاحب" بیمار ہوئے اور ان کے علاج میں انھوں نے یہاں کا کام چھوڑ دیا۔

انھوں نے بتایا کہ کتنے استاد آئے، مگر کوئی ٹکا نہیں۔ اکثر پیشگی روپیہ اور اناج لے کر بھاگ جاتے ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ کہہ کر روپے لئے تھے کہ "تمہارے لئے لنگی لاؤں گا" اور "تمہارے لئے ٹارچ لاؤں گا" مگر روپیہ لے کر گئے تو آج تک نہیں لوٹے۔

"کیا یہ فارغ عالم ہوتے ہیں" میں نے پوچھا۔

"نہیں کوئی نحومیر تک پڑھا ہوتا ہے، کوئی شرح جامی تک اور زیادہ تر میاں جی ہوتے ہیں۔

"جب تک رہتے ہیں کیا وہ پڑھانے کا کام محنت سے کرتے ہیں"

"اجی کس کی محنت" (کہاں کی محنت) مولوی عبدالرحمٰن صاحب نے جواب دیا۔

اگست ۱۹۶۹ء کی دوسری تاریخ تھی۔ الور سے دھولی دوب اور وجے ساگر جاتے ہوئے میں نے دیکھا

کہ سڑک کے دونوں طرف کھیتوں میں "مچان" بڑے ہوئے ہیں اور مویشی ہرطرف چر رہے ہیں۔

پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس علاقے کے کسانوں میں عام رواج ہے کہ وہ موسم برسات میں تقریباً چار مہینے کے لئے مویشیوں کو اپنے کھیتوں میں منتقل کر دیتے ہیں۔ ایک اونچی سی چار پائی جس کو یہاں "ڈہلا" کہتے ہیں اس کے اوپر سرکی کی "چھت" ڈال کر ایک ہلکا پھلکا زمینی مچان بنا لیا جاتا ہے۔ یہ کسان کا بسیرا ہوتا ہے۔ اس کے پاس ایک اچھی ٹارچ بھی ہوتی ہے تاکہ رات کے وقت مویشیوں کی دیکھ بھال کر سکے۔

بارش کے موسم میں اس انتقال آبادی کے زبردست فائدے ہیں۔ برسات میں مویشیوں کی قیمتی کھاد کا بڑا حصہ برباد ہو جاتا ہے۔ نیز کسان کے دروازے کے سامنے کیچڑ بن کر بدبو دار غلاظت کا سبب بنتا ہے۔ جانوروں کا پیشاب جو بے حد مفید کھاد ہے اور برسات میں خصوصیت سے زیادہ مقدار میں حاصل ہو سکتی ہے۔ مگر وہ تمام کی تمام اس طرح برباد ہو جاتی ہے کہ اس سے کسان کو بدبو اور مچھر کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ مویشیوں کو کھیت میں منتقل کر کے یہ قیمتی کھاد مکمل طور پر بچالی جاتی ہے۔

پھر اس طریقہ میں برسات بھر مویشیوں کو کھلانے کی بھی آسانی ہو جاتی ہے۔ وہ دن بھر کھیت میں چرتے ہیں اور اس کے بعد کھیت ہی سے چارہ کاٹ کر دیں انھیں کھلا دیا جاتا ہے۔

برسات کے موسم میں یہ عمل ان کھیتوں میں کیا جاتا ہے جو ناغہ کر کے بونے کی غرض سے ایک سال کے لئے چھوڑ دئے جاتے ہیں۔ اور جن کو یوپی کے علاقہ میں "چوماسں" کہا جاتا ہے۔ کسانوں نے بتایا کہ ان کھیتوں میں سرسوں کی بہترین پیداوار حاصل ہوتی ہے۔

واپسی میں دلّی سے الور تک ۱۵۸ کیلومیٹر کا سفر بڑا پرکیف تھا۔ ہرطرف سبزہ سے ڈھکی ہوئی زمین ایسی دکھائی دیتی تھی جیسے قدرت نے کسی پرمسرت تقریب کی آمد کے لئے سطح ارض پر ہرا قالین بچھا دیا ہو۔ آسمان پر ہلکے بادل اور اس کے ساتھ ٹھنڈی ہواؤں نے موسم کو بہت خوشگوار بنا دیا تھا۔

"کتنی حسین ہے یہ دنیا" بے اختیار میری زبان سے نکلا۔ "مگر اس حسین دنیا کا مالک بننے کے لئے خود بھی حسین بننا پڑتا ہے۔" اور یکایک مجھے محسوس ہوا کہ یہ الفاظ جو دنیا کے بارہ میں بلا مبالغہ صحیح ہیں وہ ہمارے اوپر صادق نہیں آتے اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہماری تمام بدبختیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

NATIONAL CAPITAL REGION

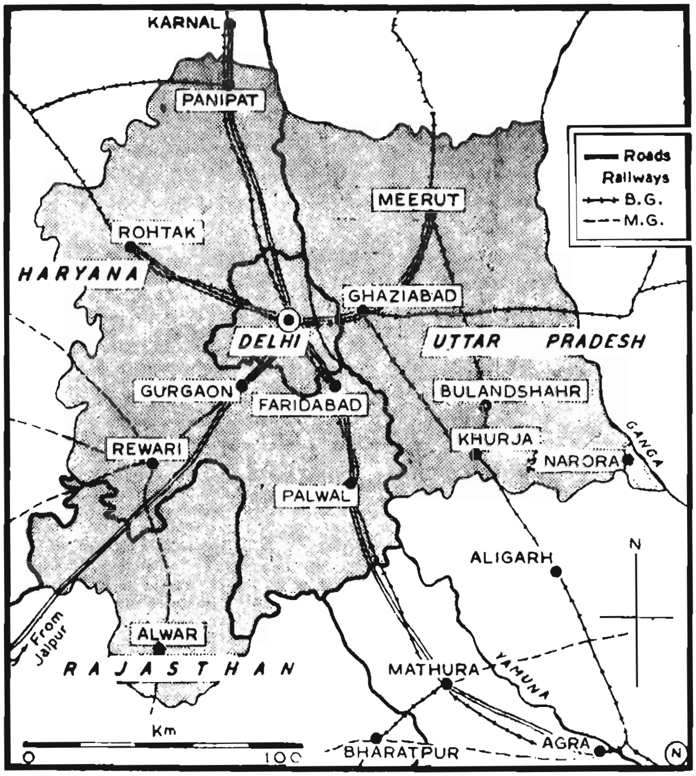

الور (راجستھان) دہلی سے تقریباً ایک سو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ مجوزہ قومی دارالسلطنت کا ایک حصہ ہے۔ دہلی کی آبادی کو لگ بھگ پچاس لاکھ تک محدود رکھنے کے لئے آس پاس کی ریاستوں (اترپردیش، ہریانہ، راجستھان) کے ۷ ضلعوں کو قومی دارالسلطنت میں شامل کیا گیا ہے۔ منصوبہ یہ ہے کہ تقریباً دو ارب خرچ کرکے ان ضلعوں کو ترقی دی جائے تاکہ دہلی کی فاضل آبادی کو وہاں بسایا جاسکے۔

الور کی آبادی اس وقت تقریباً ایک لاکھ ہے۔ اندازہ ہے کہ مجوزہ منصوبہ کے بروئے کار آنے کے بعد اس کی آبادی بڑھ کر ڈیڑھ لاکھ ہو جائے گی۔ الور جو ابھی حال تک ایک پس ماندہ علاقہ سمجھا جاتا تھا اب تیزی سے ایک صنعتی علاقہ بنتا جا رہا ہے۔ مشہور چیتک اسکوٹر کا کارخانہ یہاں قائم ہے اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے کارخانے۔

چوتھا سفر

۱۵ اکتوبر ۱۹۶۹ کی صبح کو میں مولانا عبدالرحیم اور بعض دوسرے رفقاء کے ہمراہ میوات کے لئے روانہ ہوا۔

بس کا ڈرائیور بڑا زندہ دل نوجوان تھا۔ وہ ہریانہ کی جاٹ برادری سے تعلق رکھتا تھا۔ میری سیٹ ڈرائیور کے بغل میں بالکل آگے تھی۔

"کیا شاعری لکھ رہے ہو میاں صاحب" مجھ کو قلم کاغذ میں مشغول دیکھ کر ڈرائیور نے کہا۔

"نہیں میں شاعر نہیں ہوں"۔ میں نے جواب دیا۔ "مگر آپ نے کس طرح سمجھا کہ میں شعر لکھ رہا ہوں"

"محڈن سب شاعر ہوتے ہیں" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ کیسے آپ کو معلوم ہوا"

"اپنے تو چانس پڑے ہیں" جاٹ ڈرائیور نے کہا اور اس کے بعد بتایا کہ اس سے پہلے وہ ملٹری میں اٹھارویں دستہ میں تھا۔ اس میں ایک اسکوڈرن مسلمانوں کا تھا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ سب مسلمان شاعری کیا کرتے ہیں۔

ڈرائیور نے یہ بات اپنی سادگی میں کہی۔ مگر میں سوچنے لگا کہ ایک جاٹ کی نظر میں مسلمان گویا شاعروں کی قوم ہے۔ ہم نے بھی موجودہ زمانہ میں اپنی کتنی عجیب تصویر دوسروں کی نظر میں بنائی ہے۔

۹ بجے گاڑی بدلنے کے لئے فیروز پور جھرکا اترے۔ یہاں تقریباً دو گھنٹے رکنا پڑا۔ فیروز پور میں لگ بھگ پانچ ہزار آبادی ہے۔ مسلمان بہت کم ہیں مشکل سے ۲۰ گھر ہوں گے۔ تقسیم سے پہلے یہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اگرچہ یہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور اس وقت یہاں کوئی مارکاٹ نہیں ہوئی۔ مگر اطراف کے واقعات سے اتنی دہشت پھیلی کہ بیشتر لوگ بستی چھوڑ کر چلے گئے۔

اس وقت یہاں جو مسلمان ہیں وہ تیلی، رنگریز، فقیر، حجام اور مزدور قسم کے لوگ ہیں۔ آس پاس کے دیہات میں مسلمان کثرت سے آباد ہیں۔ پوری فیروز پور تحصیل میں ۸۰ فی صد مسلمان ہیں۔ اطراف میں چھوٹی بڑی تقریباً دو سو بستیاں ہیں جہاں کے باشندے فیروز پور کے بازار میں خریداری کے لئے آتے ہیں۔ فیروز پور کی تمام بازاری ہما ہمی انھیں مسلمانوں کی بدولت قائم ہے۔ مگر حیرت انگیز بات

ہے کہ بازار میں مسلمانوں کی کوئی ایک دوکان بھی نہیں۔ اگر کوئی ہے بھی تو وہ ناقابل ذکر۔

محمد الیاس نام کا ایک نوجوان حجامت بنانے کا کام کرتا ہے اور تیس سال سے بازار میں مقیم ہے اس سے میں نے پوچھا "آخر مسلمان دکان کیوں نہیں کرتے۔"

"بس جی کوئی کھولتا نہیں ہے۔" اس کا جواب تھا۔ مزید سوال کے جواب میں اس نے کہا۔ "یہاں کے لوگ تو ایسے ہیں کہ بنیوں سے قرض نکلوا کر لے جاتے ہیں اور پھر خوش ہوتے ہیں کہ اس نے چودھری صاحب کو سودی قرض دے دیا۔"

میں ایک مسلمان رنگریز کی دوکان پر گیا۔ بوڑھا باپ لال کھدر پر کالی چھپائی کر رہا تھا۔ حالانکہ اس کی عمر اتنی ہو چکی تھی کہ اگر موقع ہو تو وہ صرف یہ پسند کرے گا کہ چارپائی پر لیٹا ہوا بس حقہ پیتا رہے۔

چھپائی کا کام ان کو سال میں بس دو مہینے ملتا ہے۔ ان میں بھی وہ مشکل سے سو روپیہ مہینہ کماتے ہیں۔ باقی مہینوں میں زیادہ تر بیکار رہتے ہیں۔ کبھی رنگائی کا کام مل گیا تو مل گیا۔

"پھر کیسے آپ کام چلاتے ہیں۔" میں نے رنگریز کے لڑکے سے کہا۔

"ایسے ہی چل رہے ہیں جی۔" اس نے بے دلی کے ساتھ جواب دیا۔ اور اس کے بعد اپنے دبلے پتلے ہاتھوں سے گھولے ہوئے رنگ کے نیچے لکڑی کے ٹکڑے ڈالنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر مایوسی کے سوا کسی اور چیز کی تلاش ایک بے سود کوشش ہے۔

گفتگو کے دوران مولوی یوسف صاحب (حسن پور بلونڈا) آگئے۔ یہ زراعت کا کام کرتے ہیں۔

"ہمارا ۳۵ افراد کا کنبہ ہے اور سب اسی زمیندارہ میں لگے ہوئے ہیں۔" انھوں نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

"آپ لوگ کاروبار کیوں نہیں کرتے۔"

"دوسرے کام میں کامیابی نہ ہو ہم لوگوں کو" انھوں نے میواتی زبان میں جواب دیا۔

"کیوں"

"بس ماحول ہی ایسا ہے زمیندارہ کا۔" میں نے بہت کوشش کی کہ وہ اس کے لئے آمادہ ہو جائیں کہ ۳۵ افراد کے کنبہ سے کم از کم ایک شخص کاروبار کے لئے نکالیں مگر وہ اس کے لئے کسی طرح آمادہ نہ ہوئے۔

یہاں مولانا قمرالدین صاحب ایک خاص شخصیت ہیں۔ یہ مڈل پاس ہیں اور عالم بھی ہیں۔ مزید یہ کہ نہایت سمجھدار اور فعال آدمی ہیں۔ انھوں نے اس علاقہ کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں۔

انھوں نے کہا "یہاں کا دھندا ایسا ہے کہ زمین تو بہت ہے لیکن زمین ہی میں سب لگے رہتے ہیں خواہ وہ زمین ایک بیگھہ ہو یا پانچ بیگھہ یا پچاس بیگھہ۔ نہ کوئی ملازمت ہے، نہ تجارت، نہ دستکاری لوگوں کی آمدنی کا اوسط اتنا کم ہے کہ فی کس شاید پانچ روپیہ مہینہ بھی نہیں پڑے گا۔ بہت سے "فالتو چودھری" آپ کو بازاروں میں نظر آئیں گے۔ ان کا دھندا یہ ہے کہ اپنے کو سرکار رس ظاہر کرکے لوگوں سے پانچ روپیہ دس روپیہ اینٹھ لیں۔ اور پھر ہوٹل میں فاتحانہ انداز میں بیٹھ کر چائے پئیں۔ یہاں سب میں دو پارٹیاں ہیں عوام میں بھی اور خواص میں بھی۔ میو کو دوسروں کی تابعداری منظور ہے مگر اپنی نہیں۔ شادی بیاہ کو فوراً ناک کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ اور جو کیا ہے اس میں دیا سلائی لگا دیتے ہیں"۔

اس وقت ۸۔۱۰ میو ہمارے کمرے میں جمع ہو گئے تھے۔ میں نے تعلیم کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا: "آپ لوگ اپنے بچوں کو پڑھاتے کیوں نہیں"۔

"کیا پڑھائیں۔ ملازمت تو ہم کو ملتی نہیں" حاضرین میں سے ایک نے کہا۔

"تعلیم کا مقصد صرف ملازمت نہیں"۔ میں نے کہا "تعلیم یافتہ ہونے کے اور بھی بے شمار فائدے ہیں"۔

اب انھوں نے دوسری دلیل دی "بہت سے تو بچوں کو اسکول اس لئے نہیں بھیجتے کہ وہاں بھجن گوایا جاتا ہے۔ یہ گاؤ، وہ گاؤ، پھر اسکول جاؤ۔

میں نے کہا یہ سب تو صرف ابتدائی درجات میں ہوتا ہے۔ آپ ابتدائی تعلیم کا خود انتظام کرلیں۔

مولانا قمرالدین صاحب نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ یہاں اسلامی مدرسے بہت ہیں مگر سب وہی محدود "دینی تعلیم" دیتے ہیں۔ دینی تعلیم میں اگر مڈل تک کا نصاب بھی شامل کرلیا جائے تو لڑکے ان خرافات سے پاک رہ کر ابتدائی تعلیم ہندی، حساب وغیرہ کی حاصل کرلیں۔ اور پھر آگے ھائی اسکول میں داخلہ لے کر پڑھیں۔" مگر یہ جو ہے ملّا پارٹی یہ بھی خشک ہے بالکل" انھوں نے کہا۔ یہ لوگ دینی تعلیم تو جانتے ہیں مگر زمانہ کے حالات وضروریات کو سامنے نہیں رکھتے۔ حالانکہ دین میں دونوں چیزیں ضروری ہیں۔

فیروز پور میں مولانا عبدالستار صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ یہاں کی جامع مسجد کے امام ہیں۔

اس سے پہلے مشرقی پنجاب کی جمعیۃ علماء کے صدر رہ چکے ہیں۔ موصوف سے دیر تک گفتگو رہی۔ آپ نے یہاں کے مسلمانوں کے حالات کے بارہ میں بڑی مفید اور نصیحت آمیز باتیں بتائیں۔

فیروز پور سے ہم روانہ ہوئے تو جگہ جگہ ٹوٹی ہوئی سڑکیں اور اکھڑے ہوئے درخت میوات کے اس سیلاب کا نشان تھے جس کی خبریں پچھلے مہینے اخباروں میں آتی رہی ہیں۔ حتیٰ کہ پہاڑی سے تقریباً ایک میل پہلے ہماری گاڑی رک گئی۔ کیونکہ آگے کی سڑک اتنی زیادہ خراب تھی کہ گاڑی اس سے گزر نہیں سکتی تھی۔

راستہ میں ایسے کھیت کثرت سے نظر آئے جن کی فصلیں سیلاب میں بہہ گئی تھیں۔ اب وہاں کسان دوبارہ ہل چلا کر کھیت تیار کر رہے تھے تاکہ اگلی فصل بو سکیں۔ ہر کسان جانتا ہے کہ کوئی سیلاب صرف ایک فصل تباہ کرتا ہے۔ وہ اگلی فصل کے امکان کو برباد نہیں کرتا۔ کاش ہم زندگی کا یہ اصول اپنے قومی معاملات میں بھی اختیار کر سکیں۔

راستہ میں ایک مقام پر سڑک اس طرح گردش کرتی ہوئی چل رہی تھی کہ ایک طرف بلند پہاڑ کھڑے تھے اور دوسری طرف گہری کھائی سڑک کے ساتھ نظر آتی تھی۔ "یہ منظر قابل دید ہے" میرے ساتھی نے کہا اور ہم سب لوگ اس خوشنما نظارہ میں محو ہو گئے۔ مگر میں نے ڈرائیور کو دیکھا کہ وہ اپنی نظریں مکمل طور پر سامنے کی پتلی سڑک پر جمائے ہوئے ہے وہ ایک سکنڈ کے لئے بھی اِدھر اُدھر نہیں دیکھتا۔ اس کے لئے دائیں بائیں کے مناظر گویا کوئی وجود ہی نہیں رکھتے۔ یہ دیکھ کر میں نے سوچا کہ قائد کو ایسا ہی بننا پڑتا ہے۔ عام لوگ تو اطراف کی دلچسپیوں میں شغل کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھ سکتے ہیں۔ مگر جو شخص قیادت کر رہا ہو اس کو منزل کی طرف ہمہ تن متوجہ رہنے کے سوا کوئی صورت نہیں۔

فیروز پور کے بعد ہم ساڑھے بارہ بجے پہاڑی پہنچے۔ یہاں ۱۲۰۱ھ کی بنی ہوئی درگاہ صاحب خاں پیر ہے۔ یہ ایک بوسیدہ سی عمارت ہے۔ جس کو اِدھر اُدھر جوڑ پیوند لگا کر مدرسہ اور رہائش کے قابل بنایا گیا ہے۔ بوسیدگی کا عالم یہ ہے کہ اس کی چہار دیواری تک نہیں۔ یہاں پر مدرسہ رحیمیہ واقع ہے جو ۱۹۶۰ء سے قائم ہے۔

تقریباً ۴۵ طلبہ یہاں پر تعلیم پاتے ہیں، جن میں کچھ حافظہ کے ہیں اور کچھ اردو کے۔

"کہاں تک پڑھ چکے ہو" میں نے ناظرہ کے ایک لڑکے سے پوچھا۔

"پورے گراں" لڑکے کا جواب تھا۔

حافظ کے ایک بچے نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا:

"چوتھا پارہ، ہیچ کر لیو"

اردو کی کون سی کتاب پڑھ رہے ہو" میں نے تیسرے لڑکے سے پوچھا" فضائل نماز، تعلیم الدین حکایات صحابہ....

ان جوابات سے اندازہ کیجئے کہ میوات کے طالب علم کی ذہنی وعلمی حالت کیا ہے۔ ٹوٹے پھوٹے لب ولہجہ میں قرآن کو دہرانے کا نام ان کے یہاں ناظرہ و حافظہ ہے۔ اور فضائل نماز اور تعلیم الدین جیسی کتابیں پڑھنا ان کے نزدیک اردو پڑھنے کے ہم معنی ہے۔ میرے سامنے فرش پر مدرسہ کے بچے بیٹھے ہوئے تھے۔ خاموش پلک جھپکاتے ہوئے اور چہرہ سے مکھیاں اڑاتے ہوئے بچے میرے معمولی سوالات کا جواب اس طرح دے رہے تھے جیسے کوئی چاند کا باشندہ زمینی مخلوق سے سوال کر رہا ہو۔ ان کے معصوم چہرے بتا رہے تھے کہ انھیں ماضی، حال، مستقبل کسی چیز کا کوئی پتہ نہیں۔ وہ صرف اتنا جانتے ہیں کہ ایک ٹوٹی ہوئی عمارت ہیں جس کا دوسرا نام مدرسہ ہے، تعلیم کے نام سے زندگی کے کچھ دن گزار لیں اور اس کے بعد کھیتی باڑی کے آبائی کام میں یا مسجدوں کی امامت اور موذنی میں واپس چلے جائیں انھیں کچھ نہیں معلوم کہ آج کی دنیا کس قسم کے انسان مانگ رہی ہے۔ اور وہ کون فریضہ ہے جو بحیثیت مسلمان انھیں دنیا میں پورا کرنا ہے۔ یہی میوات کے تمام مدرسوں کا حال ہے۔

میو قوم کے بچے یہاں اس بیکسی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں اور اس کے باہر میو قوم کا یہ حال ہے کہ زمینوں پر بے پناہ محنت کر کے فصل اگاتی ہے اور اس کے بعد ضروریات زندگی کی خریداری شادی بیاہ کے سامان کی فراہمی یا مقدمہ بازی میں اپنی محنت کی کمائی دوسری قوموں کے پاس لے جا کر انڈیل دیتی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ ایک خاندان نے چند برس پہلے نوے ہزار روپئے ایک شادی میں خرچ کر دئے۔ اور اب اس کے بچے سڑکوں پر مزدوری تلاش کرتے پھرتے ہیں۔

اس طرح کے مدارس اس علاقہ میں کثرت سے ہیں ان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ مدرسے نہیں ہیں بلکہ بے کس یتیموں کا ایک قافلہ ہے جو آبادی میں جگہ نہ پا کر ٹوٹی پھوٹی دیواروں کے سایہ میں پناہ گزیں ہو گیا ہے۔ ان مدارس کے معیار کو بڑھانے کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ مگر سرمایہ

آئے تو کہاں سے۔ جب کہ میو قوم کے پاس سرمایہ کا واحد مصرف اس کو دوسروں کے پاس پہنچا کر خود قلاش بن جانا ہے۔

پہاڑی میں نصف درجن سے زیادہ مسجدیں ہیں، یہ اس وقت کی یادگار ہے جب اس قصبہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اب یہاں صرف چند گھر مسلمان رہ گئے ہیں۔ تاہم مدرسہ رحیمیہ کی بدولت جو یہاں نہایت عمدہ مرکزی جگہ پر واقع ہے مسلم چہرے کافی نظر آتے ہیں۔

یہاں کی جامع مسجد بہت بڑی اور ۱۳۰۱ھ کی بنی ہوئی ہے۔ مکمل پتھر کی یہ عمارت جو پہاڑی کے اوپر قائم ہے، میں اس کے اندر داخل ہوا تو فرش پر جگہ جگہ ہندی اور انگریزی میں غیر مسلموں کے نام کھدے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ ۱۹۴۷ کے ہنگامہ میں جب پہاڑی کا قصبہ مسلمانوں سے خالی ہوا تو یہاں غیر مسلم آباد ہو گئے تھے۔ اور انھوں نے اپنے نام اس کے فرش پر کھود ڈالے۔ بعد کو جمعیۃ علماء نے مولانا محمد ابراہیم صاحب کی سرکردگی میں مساجد اور مکانات وغیرہ کی واگذاری کی جو مہم چلائی اس میں یہ مسجد بھی خالی کرائی گئی۔

اب اس مسجد اور قصبہ کی تمام مساجد کا انتظام مولانا سراج الدین صاحب کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اب غیر مسلموں میں وہ سابقہ تعصب اور ضد نہیں ہے۔ چنانچہ قصبہ کی ایک غیر آباد مسجد جس میں غیر مسلموں نے چونا وغیرہ ڈھیر کر رکھا تھا، اس کو خالی کرنے کے لئے کہا گیا تو وہ بلا بحث راضی ہو گئے۔ اور مسجد خالی کر دی۔

جو لوگ ان مساجد و مدارس کو لے کر پڑے ہوئے ہیں ان کو دیکھ کر ایسا خیال ہوتا ہے جیسے ملت کا عظیم جہاز لوٹنے کے بعد اس کے جو چند تختے بچے تھے اس سے یہ لوگ چمٹے ہوئے ہیں کہ یہ آخری متاع بھی کہیں ضائع نہ ہو جائے۔

پہاڑی کے بعد ہم کھیڑلا میل پہنچے۔ یہاں سڑک کے عین کنارے دارالعلوم محمدیہ ہے جو چار سال سے قائم ہے، اس کے صدر مدرس مولانا اقبال احمد صاحب ہیں۔ یہاں اساتذہ کی تعداد پانچ اور طلبہ کی تعداد ایک سو سے زائد ہے۔ اردو ہندی حساب وغیرہ بھی نصاب میں شامل ہیں۔

مٹی کی دیواروں پر چھپر پڑی ہوئی عمارتیں ایک طرف یہ بتاتی ہیں کہ کتنے معمولی وسائل کے ساتھ یہ لوگ خدمت دین کے میدان میں اترے ہیں اور دوسری طرف اس کی صفائی، ترتیب اور ہر چیز میں

ایک قرینہ بتاتا ہے کہ اگرچہ ان کے وسائل بہت کم ہیں مگر ان کا حوصلہ اوران کی صلاحیت اس سے بہت زیادہ ہے۔

مدرسہ والوں نے مجھے ایک فضائی تصویر دکھائی جس میں اس سیلاب کا منظر دکھایا گیا تھا جس کے نرغہ سے ابھی ابھی مدرسہ نکلا ہے۔ حالیہ سیلاب میں مدرسہ پوری طرح سیلاب میں گھر گیا تھا۔ حد نظر تک پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ اور یہ کیفیت کم وبیش تین ہفتے تک جاری رہی۔

اس مدرسہ کے بانی اور مہتمم مولانا محمد قاسم صاحب ہیں جو مشہور تبلیغی شخصیت میاں جی موسیٰ کے پوتے ہیں۔ جہاں یہ مدرسہ قائم ہے، وہاں پہلے باغ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بار اس طرف سے گذرے تو دن میں کچھ دیر کے لئے درختوں کے سایہ میں آرام کرنے کے لئے یہاں قیام فرمایا۔ اس وقت آپ نے ایک آہ سرد بھرتے ہوئے کہا "کاش کہ یہاں کوئی دینی ادارہ ہوتا"

مدرسہ چاروں طرف سے کھلا ہوا ہے۔ اس کی کوئی چہار دیواری نہیں ہے۔ ایک بار چوری بھی ہو چکی ہے، مدرسہ میں فیلڈ بھی نہیں ہے۔ اطراف میں زمینیں ہیں جو سستی قیمت پر مل سکتی ہیں مگر جس مدرسہ کے لئے قوم کے پاس اتنا بھی تعاون نہ ہو کہ وہ اینٹ کی دیوار اور پختہ چھت بنوا سکے وہ زمینوں کی خریداری کے لئے روپئے کہاں سے لائے گا۔

۱۵ کی شام کو جب میں مدرسہ سے متصل سڑک پر کھڑا ہوا تو پہاڑوں کے اوپر سورج غروب ہو رہا تھا۔ اگلے دن صبح کو جب میں واپس ہوا تو یہ وہ وقت تھا جب کہ مشرق میں نظر آتے ہوئے درختوں کے اوپر سے دوبارہ سنہرا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ "کتنا بڑا سبق ہے یہ" میں نے سوچا۔ جو اس میدانی مدرسہ کو ہر روز صبح شام دیا جاتا ہے۔ یہاں میوؤں کی جو نئی نسل جمع ہوئی ہے قدرت روزانہ اس کو یہ منظر دکھاتی ہے کہ ہر غروب کے بعد طلوع ہے۔ ہر ڈوبنے کے بعد ترنا ہے۔ اس لق ودق میدان میں مدرسہ قائم کئے جانے کی مصلحت شاید یہی ہے کہ یہاں میوؤں کی وہ نسل پیدا ہو جو اپنی قوم کی شام کو صبح میں تبدیل کرنے کا عزم لے کر اٹھے اوراس کی قسمت بدل سکے۔

مدرسہ کھیڑلا میل سے واپس ہو کر ہم دوبارہ پہاڑی پہنچے اور یہاں سے آگے کے لئے روانہ ہوئے۔ ہماری بس بیوال سے آگے بڑھی تو چاروں طرف کھڑی ہوئی پہاڑیوں کے درمیان تارکول کی سڑکیں اور ادھر ادھر کھمبوں کے اوپر دوڑتے ہوئے بجلی کے تار بڑا خوش نما منظر پیش کر رہے

سے۔" ابھی تھوڑے دنوں پہلے یہاں سڑک اور بجلی ناقابل تصور چیزیں تھیں"۔ میرے ساتھی نے کہا" یہاں راستہ چلنا دشوار تھا۔ مگر آج یہاں ہر طرف چہل پہل ہے، ہر طرف گلزار بنا ہوا ہے۔ ایک نئی زندگی نئے حوصلوں کے ساتھ ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے"۔

میرا ساتھی یہ کہہ رہا تھا اور میرے تصور کی نگاہیں دور میو قوم کو دیکھ رہی تھیں جو ابھی تک اس بات سے بے خبر ہے کہ نئے زمانہ نے اس کے لئے بے شمار امکانات کھول دئے ہیں۔ یہ جفاکش اور بہادر قوم ان نئے امکانات سے فائدہ اٹھانے کی بے پناہ صلاحیت رکھتی ہے مگر افسوس کہ ابھی تک نہ اس کو اپنا شعور ہوسکا ہے اور نہ ماحول کا۔

میں انھیں خیالات میں غرق تھا کہ بس اگلے اسٹینڈ پر رکی اور خاکی کپڑے پہنے ہوئے ۸-۱۰ بچے گاڑی میں داخل ہوئے۔ ان کے کندھوں پر لٹکے ہوئے کتابوں کے بستے بتا رہے تھے کہ وہ طالب علم ہیں۔ "یہ کون لوگ ہیں" میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا" یہ میو کے بچے ہیں، فیروز پور کے اسکول میں پڑھنے جا رہے ہیں۔ یہ معلوم کرکے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ کیوں کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ میوؤں کی پچھڑی ہوئی قوم میں اب تعلیم کی طرف ایک آغاز ہوگیا ہے۔ کچھ برسوں بعد انشاء اللہ تعلیم و ترقی کا وہ منظر ہماری آنکھوں کے سامنے ہوگا جس کو دیکھنے کے لئے آج ہماری آنکھیں ترس رہی ہیں۔

۱۶ اکتوبر کی دوپہر کو ہم کھوری جمال پور پہنچے۔ یہ پورا گاؤں پہاڑی کے دامن میں بسا ہوا ہے، یہاں ایک "تھڑی" ہے جس کی عمارت کافی بلندی پر واقع ہے۔ دن کے بارہ بجے میں اس کے صحن میں لیٹا ہوا تھا۔ ہری پتیوں سے لدے ہوئے درخت چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوائیں آآ کر میرے جسم سے ٹکرا رہی تھیں۔ ایک طرف پہاڑی کا حصار کھڑا تھا۔ دوسری طرف افق تک سبزہ پھیلا ہوا عجیب سماں پیدا کر رہا تھا۔" کس قدر حسین ہے یہ کائنات" میں نے اپنے دل میں کہا "مگر کتنی عجیب بات ہے کہ وہ قوم اس حسن کی حصہ دار نہیں جو اس جغرافیہ میں بستی ہے"۔

عبدالرحمٰن صاحب یہاں کے سرپنچ ہیں۔ ان سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ یہاں ایک سرکاری اسکول اور اسلامی مدرسہ قائم ہے۔ مگر بچے نہیں ملتے۔ مفت تعلیم کا انتظام ہونے کے باوجود کتاب اور روشنائی کے پیسے دینا بھی ماں باپ کو زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ میں نے عبدالرحمٰن صاحب سے کہا کہ میو قوم کے بچوں کا تعلیم میں پیچھے رہنا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قوم زمانے سے بہت پیچھے چلی جائے۔

میں نے کہا کہ ان لوگوں میں تعلیم کا شوق بڑھانے کی کیا صورت ہے۔

انھوں نے جواب دیا کہ "ہمارے میوؤں کو خود سے تعلیم کا شوق نہیں ہو سکتا۔ ان کا علاج یہی ہے کہ جبری ایجوکیشن پر عمل کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ کہنے کو حکومت نے اب بھی لازمی تعلیم کے اسکول کھول رکھے ہیں مگر اس پر عمل نہیں ہوتا۔ جو بچے نہیں پڑھتے ان کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا جاتا۔

میں نے کہا اپنے علاقہ کے ایم ایل اے سے کوشش کرائیے، انھوں نے کہا ان لوگوں سے بھی کوئی امید نہیں۔ ان کا اپنا کوئی مسئلہ حل ہوتا ہو تو وہ اسمبلی میں سوال کھڑا کر دیں گے۔ مگر پبلک کے فائدے کے لئے کچھ نہیں کرتے۔

معاملہ خاں یہاں پرائمری اسکول کے واحد ٹیچر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میو قوم کا یہ حال ہے کہ بچے پڑھانے کے لئے نہیں دیتے۔ "یہاں جب میں آیا تو اٹھارہ بچوں کا نام رجسٹر پر تھا جس میں چار بچے مسلمان تھے اور بقیہ ہریجن۔ حالانکہ آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اس سے پہلے میں جاٹوں کی ایک بستی میں تھا، وہاں کسی سے بچوں کے داخل کرنے کے لئے نہیں کہنا پڑتا تھا۔ جہاں کسی خاندان کا کوئی بچہ پڑھنے کے قابل ہوا جاٹ باپ اپنے بچہ کو اسکول میں لے آتا اور کہتا "جی ماسٹر جی ہمارا بچہ پڑھنے کے قابل ہو گیا اس کو داخل کر لو" اسی کے ساتھ وہ ایک روپیہ اور دیتا کہ بتاشے خرید کر رکھ لو اور لڑکے کو دیتے رہو تا کہ وہ آتا رہے، دوسری طرف میو کا یہ حال ہے کہ دس پیسہ کا قاعدہ خریدنا بھی اس کو بوجھ معلوم ہوتا ہے"۔

میوات کے علاقہ میں مقامی سیاست کا سربراہ "چودھری" ہوتا ہے اور دینی رہنمائی کا مقام علماء کو حاصل ہے۔

گھوری جمال پور میں علماء اور چودھریوں کا ایک چھوٹا سا اجتماع ہو گیا تھا۔ اس موقع پر میں نے میوات کے مسائل پر اظہار خیال کیا۔ میں نے کہا کہ میوات میں دینی بیداری کا کام تو بہت ہوا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ کچھ اور کام کرنے کی بھی شدید ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں میں نے دو کام کی طرف خصوصی توجہ دلائی۔ ایک تعلیم اور دوسرے تجارت۔

میں نے پہلے ہی منع کر دیا تھا کہ اس سفر میں عوامی اجتماع نہ کیا جائے۔ اس لئے زیادہ تر خصوصی افراد سے ملاقاتیں رہیں۔

گھوری سے زکو پور جاتے ہوئے سڑک کے دونوں طرف بڑے بڑے زرعی فارم نظر آتے ہیں یہ ابھی

تھوڑے دن پہلے گڑھوں اور ٹیلوں کی ایک "بیکار زمین تھی۔ مگر غیر مسلموں نے اسے معمولی قیمتوں پر خرید کر ٹریکٹر سے ہموار کیا۔ اور اب وہ وہاں کھیتی کر رہے ہیں۔ وہ جدید زرعی طریقوں سے بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ دوسری طرف میو قوم آج بھی پرانے طریقوں سے چمٹی ہوئی ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے بس انھیں کھیتوں پر ساری محنت صرف کر رہے ہیں جو انھیں باپ دادا سے وراثت میں ملے تھے۔

زکو پور میں جن لوگوں سے ملاقاتیں اور گفتگو رہی، ان میں سے چند خاص نام یہ ہیں۔

ملاجی سلیمان سرپنچ گرام پنچایت زکو پور

بابو شادی خاں سکریٹری گرام پنچایت۔

ملاجی سلیمان عجیب و غریب صلاحیت کے آدمی ہیں۔ وہ آزادی کے بعد سے مسلسل یہاں کے سرپنچ ہوتے چلے آئے ہیں۔ اور اس قدر کامیاب ہیں کہ میوارت کی عام بستیوں کے برعکس یہاں کوئی جھگڑا نہیں۔ ہر جھگڑا اوپر اوپر نمٹا دیتے ہیں۔ مقدمات کا رجسٹر ان کے یہاں اب بھی خالی پڑا ہوا ہے۔ بہایت جری، فیاض اور عالی حوصلہ آدمی ہیں۔

بابو شادی خاں نے بتایا کہ اس علاقہ میں ۱۹۴۷ء میں جو بستیاں مرتد ہوگئی تھیں ان کی اکثریت اگرچہ دوبارہ مسلمان ہو چکی ہے۔ مگر اب بھی ایسی بستیاں ہیں جو بدستور مرتد پڑی ہوئی ہیں۔ انھوں نے اپنے ذاتی تجربات کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ مقامی ہندو آبادی کی طرف سے اب ان پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ارتداد زیادہ تر بیرونی شرپسندوں کے اثر سے ہوا تھا۔ اب اگر یہ لوگ دوبارہ مسلمان ہوجائیں تو مقامی ہندوؤں کی طرف سے کوئی فتنہ اٹھنے کی امید نہیں ہے۔ مگر جہالت کا یہ عالم ہے کہ جو مرتد ہوگئے تھے وہ اسی حال میں پڑے ہوئے ہیں۔ اب ان کے شادی بیاہ بھی غیر مسلموں میں ہونے لگے ہیں۔ اس طرح وہ دن بدن دور ہوتے جا رہے ہیں۔

میرے اس سفر کے خاص رفیق مولانا نور محمد صاحب اٹاور تھے۔ موصوف کا تبلیغ سے بہت پرانا تعلق رہا ہے۔ ایک گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک کارکن آئے اور بتایا کہ فلاں بدعتی شخص کو میں نے ایسے اور ایسے جواب دیا۔ مولانا ان کی گفتگو سنتے رہے اور پھر آخر میں فرمایا:

"تم نے میرے کام کی مدد نہیں کی میرے کام کی جڑ کاٹ دی۔"

اسی طرح مولانا یوسف صاحب کا ایک ملفوظ انھوں نے سنایا، ان کے سامنے کچھ لوگوں کی شکایت کی گئی۔ آپ نے فرمایا:

"دین کا کام وہی کرسکتا ہے جو اپنے کانوں میں فولاد کے بوجے ڈال لے۔"

مولانا سے پورے سفر کے دوران اس قسم کی مفید باتیں سننے کے مواقع ملتے رہے۔

مولانا محمد زکریا صاحب (زکوپور) نے مدرسہ امینیہ (دہلی) سے فراغت کی۔ اب وہ زکوپور کی مسجد کے امام ہیں۔ اسی کے ساتھ مرغی بانی کا کام کرتے ہیں۔

"ہمارے مولویوں میں جو جھگڑا ہے" انھوں نے کہا "وہ پونجی نہ ہونے کا ہے۔ فراغت کے بعد یہ لوگ امامت اور مدرسی کی جگہیں تلاش کرتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ امامت اور مدرسی کی جگہیں تو بہت کم ہیں اس لئے ایک دوسرے کو ہٹا کر قبضہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میں اکثر دیکھتا ہوں کہ ان کو ہٹوا دیا، ان کو لگوا دیا، حالانکہ دونوں ایک ہی کام کرتے ہیں۔

مولانا زکریا صاحب اس اعتبار سے ایک اچھی مثال ہیں۔ وہ دینی زندگی اور امامت کے ساتھ مرغی کے انڈے کا کاروبار کرتے ہیں اس طرح انھیں جو معاشی فراغت حاصل ہوتی ہے اس کا نمایاں اثر ان کے اخلاق پر نظر آتا ہے۔ وہ محدودیت، وہ تنگ نظری، وہ جھنجھلاہٹ، وہ احساس کمتری جو عام طور پر مدارس عربیہ کے فارغین میں نظر آتی ہے، وہ ان کے اندر بالکل نہیں۔

مولانا زکریا صاحب کے ساتھ میں نے کافی وقت گزارا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ دین داری اور علمیت کے ساتھ کاروبار کی بھی اچھی صلاحیت رکھتے ہیں۔

مولانا زکریا صاحب نے یہ مرغی فارم تین سال پہلے پچاس روپیہ کے سرمایہ سے شروع کیا تھا۔ اس کے بعد اسی آمدنی سے اس کو ترقی دیتے رہے۔ اب ان کے پاس سوا سو مرغیاں ہیں۔ کرنال گورنمنٹ پولٹری فارم کے مطابق ایک مرغی کی قیمت ۱۲ روپئے ہوتی ہے۔ اب ان کے پاس ایک پورا مرغی خانہ ہے۔ مرغی خانہ کے مختلف سامانوں میں تقریباً ایک ہزار روپے صرف ہوئے ہیں۔ اور ڈھائی ہزار روپے کی مرغیاں موجود ہیں۔ اس وقت ۸۰ - ۹۰ انڈے روزانہ نکل رہے ہیں۔ انڈوں کی فروخت تقریباً ۳۰ روپے سیکڑہ ہو جاتی ہے۔ غلہ کے علاوہ گھر کا سارا خرچ (تقریباً ۸۰ روپیہ مہینہ) اسی سے نکالتے ہیں۔

مولانا زکریا صاحب جدید طرز پر سارا کام کرتے ہیں۔ مرغیوں کو انجکشن وغیرہ خود لگاتے ہیں۔

پچھلے تین برس میں ان کی ایک مرغی بھی نہیں مری ہے۔

"آپ نے اس کو ایک نفع بخش کاروبار پایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے تو اپنے تجربہ میں اس کو سوفی صدی نفع بخش کاروبار پایا ہے" انھوں نے فوراً جواب دیا۔

"ایک شخص ۵۰ مرغیوں سے کام شروع کرے" انھوں نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "تو تین سال میں وہ تین سو مرغیوں کا مالک بن جائے گا۔ تین سو مرغیاں روزانہ دوسو انڈوں کا اوسط دیں گی۔ اس طرح خرچہ نکال کر ماہانہ چار سو روپے کی آمد ہو سکتی ہے۔"

انھوں نے مزید بتایا کہ کم سرمایہ والا اسی وقت نفع میں رہ سکتا ہے جبکہ منڈی قریب ہو، ورنہ وہ سردیوں کے موسم میں چلے گا اور گرمیوں کے موسم میں گھاٹے میں رہے گا۔ جبکہ انڈے جلد خراب ہو جاتے ہیں۔ البتہ زیادہ سرمایہ سے کہیں بھی کام شروع کیا جا سکتا ہے۔

مولانا زکریا صاحب اپنے کاروبار کو بڑھانا چاہتے ہیں۔ یہاں اس کو بڑھانے کے زبردست مواقع ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ انھوں نے ایک پنجابی سے قرض لینے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے اس کے سامنے یہ شکل رکھی کہ میرے پاس دس بیگھہ زمین ہے تم اس کی ضمانت پر مجھے پانچ ہزار روپے قرض دے دو۔ شرط یہ ہو گی جب تک میں روپیہ ادا نہ کردوں اس وقت تک ایک مقررہ شرح سے تم کو نفع دیتا رہوں گا۔ اور اگر خدانخواستہ رقم ڈوب گئی تو اصل رقم بغیر کسی کمی کے تمہیں واپس کر دوں گا۔

پنجابی سے رقم لینے میں تو انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ مگر جب انھوں نے اپنا یہ واقعہ بتایا تو مجھے نظر آیا کہ یہ صرف ایک واقعہ نہیں بلکہ ایک نہایت عمدہ اقتصادی تجویز بھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس علاقہ کی تمام اقتصادیات کا انحصار میو قوم کی زرعی محنت پر ہے مگر وہ بے پناہ محنت کر کے جو کچھ کماتے ہیں وہ شادی بیاہ اور مقدموں میں برباد کر دیتے ہیں۔ اگر اس رقم کو بچا کر ایک فنڈ قائم کیا جائے اور مذکورہ بالا شرائط پر لوگوں کو قرضے دیے جائیں تو ۲۰ برس میں میوات کی قسمت بدل جائے۔

زکوپور سے واپسی پر ہم کچھ دیر کے لئے سوہنا ٹھہرے۔ یہ ایک تاریخی قصبہ ہے۔ قدیم مشرقی پنجاب اور موجودہ ہریانہ کا یہ حصہ ۱۹۴۷ کے ہنگامہ میں مسلمانوں سے خالی ہو گیا تھا۔ اب بہت تھوڑے سے مسلمان

یہاں ہیں جو بعد کو آکر بسے ہیں۔

" میرا نام نورالدین ہے جی" ایک مسلمان سقہ نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "میں کوئی سال ڈیڑھ سال سے یہاں رہ رہا ہوں" وہ میونسپل کمیٹی میں ملازم ہے۔ اور شہر کی نالیوں میں صفائی کے لئے چھڑکاؤ کرتا ہے۔ "تنخواہ نوّے روپے ماہانہ ہے۔" اور بھی کچھ کما لیتے ہو" میں نے پوچھا "نہیں جی" نور الدین نے جواب دیا۔ یہاں مسلمان تو ہیں نہیں۔ باقی گھر گھر میں نلکہ لگا ہوا ہے، اس سے وہ پانی لے لیتے ہیں۔"

" اور مسلمان یہاں سوہنا میں کتنے ہوں گے؟"

"ایک گھر فقیروں کا ہے، دو گھر میوؤں کے ہیں۔۔۔۔۔"

" یہ لوگ کیا کام کرتے ہیں؟"

" فقیر لوگ بازار میں مانگتے کھاتے ہیں، باقی پلہ داری کرتے ہیں۔ آڑھتوں میں ڈھلائی کا کام"

اس سے اندازہ کیجئے کہ یہاں جو تھوڑے بہت مسلمان ہیں ان کی معاشی حالت کیا ہے۔

مجھے بتایا گیا کہ قدیم زمانہ کی بنی ہوئی ۱۸ مسجدیں ہیں ان میں سے صرف تین مسلمانوں کے پاس ہیں۔ بقیہ زیادہ تر غیر مسلموں کے قبضہ میں ہیں۔ میں نے خود جا کر چند مسجدوں کو دیکھا۔ جامع مسجد بہت بڑی پتھر کی بنی ہوتی ہے۔ اس میں لڑکے اور لڑکیوں کا "پاٹھ شالہ" قائم ہے۔ میں نے اس عظیم سنگی عمارت کو صرف باہر سے دیکھا۔ کیونکہ پاٹھ شالہ کے ذمہ داروں نے مسجد کے اندر جانے کی اجازت نہیں دی۔ دوسری مسجد کو میں نے دیکھا کہ وہ باقاعدہ رہائش گاہ بنی ہوئی ہے اور اس میں مویشی بندھے ہوتے ہیں۔ اپلے تھاپے جا رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ منظر بے حد تکلیف دہ تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ وہ منظر تھا جب میں نے قصبہ کے باہر بنی ہوئی ایک اور سنگی مسجد کو دیکھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہنشاہ بابر یا اس کے متصلاً بعد کے زمانہ کی بنی ہوئی ہے۔ یہ مسجد بے حد عمدہ جگہ پر واقع ہے۔ اور مسلمانوں کے قبضہ میں ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ غدر کے زمانہ میں جب انگریزوں نے قبضہ کیا تو ایک عرصہ تک یہ جگہ اپنے عمدہ جائے وقوع کی بنا پر ان کا فوجی مستقر بنی رہی۔ اس کے نشانات اب بھی مسجد میں نظر آتے ہیں۔

اس مسجد کے ساتھ کافی زمین بھی ہے۔ مگر سب یوں ہی غیر آباد اور ویران پڑی ہوئی ہے۔ اگر اس کو گھیر دیا جائے اور یہاں پمپ لگا کر پپیتے وغیرہ کی کاشت کی جائے تو ہزاروں روپے کی آمد ہو سکتی ہے۔ یہاں

ایک زبردست مدرسہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ مگر ان سب کاموں کے لئے پیسہ کی ضرورت ہے اور پیسہ کا مصرف ہماری قوم کے پاس یہ ہے کہ شادی میں دھوم دھام کر کے ناک اونچی کی جائے یا کسی مفروضہ "دشمن" کو جیل پہنچانے کے لئے سارا روپیہ کچہری میں لے جا کر بھر دیا جائے۔

میں نے سوچا کہ ایک مسجد پر غیر مسلموں نے قبضہ کیا تو وہاں وہ لڑکوں اور لڑکیوں کا شاندار اسکول کھولے ہوئے ہیں۔ دوسری مسجد ہمارے قبضہ میں ہے تو وہاں خاک اڑ رہی ہے۔ پھر اگر ہمارا مقدمہ مضبوط نہ ہو تو اس کے لئے ہمیں دوسروں کی نہیں بلکہ اپنی شکایت کرنی چاہئے۔ کیوں کہ ہمارا عقیدہ خواہ جو بھی ہو مگر دنیا کا قانون یہی ہے کہ جو آباد کرتا ہے وہی مالک بنتا ہے۔

۱۷ اکتوبر کو ہم گیارہ بجے نوح پہنچے۔ نوح کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے پہلے مجھ سے تقریر کی فرمائش کی گئی۔ میں نے اس موقع پر کہا کہ اس علاقہ میں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ لوگوں کے چہروں پر داڑھیاں ہیں۔ ہاتھوں میں تسبیح ہے اور نماز اور عبادت کا عام رواج ہے۔ مگر اسی کے ساتھ بعض دوسرے پہلوؤں سے لوگ سخت غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح ذکر اور عبادت کا حکم دیا ہے اسی طرح یہ بھی کہا ہے کہ تم دنیا میں اس طرح رہو کہ دوسری اقوام کے اوپر تمہاری دھاک بیٹھی رہے۔

میں نے قرآن سے مثال دیتے ہوئے کہا کہ سورۂ آل عمران میں اتفاق و اتحاد کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اگر تم آپس میں نا اتفاقی کرو گے تو تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی (فتذھب ریحکم) اسی طرح سورۂ انفال میں کہا گیا ہے کہ مادی طاقت فراہم کرو تاکہ دشمنوں پر تمہاری دھاک رہے (ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم) مگر ان اعتبارات سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ سخت غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ آپ کی آپس کی لڑائیوں کا یہ حال ہے کہ بات بات میں لاٹھی اٹھ جاتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں مادی قوت تعلیم اور تجارت میں منتقل ہو گئی ہے۔ مگر آپ تعلیم اور تجارت سے اس طرح دور رہتے ہیں جیسے کہ وہ کوئی حرام چیز ہو۔

میں نے کہا کہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ کی ہوا خیزی ہو چکی ہے۔ اور دوسروں پر آپ کا کوئی رعب باقی نہیں رہا۔ آپ کو ایک حقیر اور ذلیل قوم سمجھا جاتا ہے۔

میری تقریر کے بعد مولانا نیاز احمد صاحب کھڑے ہوئے۔ انھوں نے حاضرین سے سوال کیا "مقرر کی بات سمجھ میں آئی" آوازیں سنائی دیں۔ "خوب آئی، خوب آئی"۔

مولانا نیاز محمد صاحب کی شخصیت گویا اخلاص و محبت کے مجموعہ کا دوسرا نام ہے۔ان سے ملاقات ہوئی۔مولانا کا مدرسہ جو ایک قدیم جامع مسجد میں واقع ہے اس کے لئے واحد سائبان کی یہ چھوٹی سی مسجد ناکافی ہو رہی تھی۔چنانچہ آج کل وہ اس کے آگے نیا سائبان بنوا رہے ہیں۔

میں اپنے سفر میں دیکھتا آ رہا تھا کہ بارش اور سیلاب نے میوات کی زراعت کو تباہ کر دیا ہے۔اب بھی کھیتوں میں پانی بھرا ہوا ہے۔ایسے وقت میں مولانا نیاز محمد صاحب کا یہ اقدام بڑی ہمت کا کام ہے۔کیوں کہ یہاں کی مسلم آبادی کا معاشی انحصار تمام تر زراعت پر ہے اور دینی مدارس کا انحصار مسلمانوں پر اس لئے موجودہ سال اور نتیجۃً اگلے سال کے لئے بھی اُن کے اقتصادی مواقع بری طرح تباہ ہو گئے ہیں۔

نوح سے ہم برکلی کی طرف چلے۔تارکول کی چکنی سڑک پر ہماری گاڑی تیزی سے پھسل رہی تھی۔سڑک کے دونوں طرف کیکر کے ہری پتیوں سے لدے ہوئے درخت عجیب پر بہار منظر پیش کر رہے تھے۔یہ وہ علاقہ ہے جہاں کبھی ڈاکوؤں کے خوف سے لوگ سفر کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔میں نے سوچا "مگر دور جدید کی ترقیوں نے اس مقام کو آج کس قدر آباد اور پر رونق بنا دیا ہے"۔ جس زمین پر یہ سڑکیں پھیلی ہوئی ہیں اور گاڑیاں نئے دور کا پیغام لے کر دوڑ رہی ہیں، وہیں میو قوم اس حال میں پڑی ہوئی ہے کہ اسے معلوم بھی نہیں کہ زمانہ کی گردش نے اسے کس دور میں پہنچایا ہے اور کون سے امکانات ہیں جو انتظار کر رہے ہیں کہ وہ جاگے اور ان کو استعمال کرے۔

برکلی میں بس اسٹینڈ پر ایک میواتی عبد الصمد صاحب (امام نگر) سے ملاقات ہوئی۔وہ دودھ کا کاروبار کرتے ہیں۔میرے سوالات کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ سو روپیہ سے لے کر دو سو روپیہ مہینہ تک کی آمدنی انھیں ہو جاتی ہے۔مگر میو برادری میں اس قسم کے کام کو پسند نہیں کیا جاتا۔میو تو بس زمینداری ہی کو ایک کام جانتے ہیں"۔

مزید گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ یہاں کے لوگ اتنے جاہل ہیں کہ اپنا نفع نقصان بھی نہیں سمجھتے۔لڑائی جھگڑا کریں گے اور رشوتوں سے افسروں کی جیب بھریں گے۔ان کے الفاظ ہیں:

"یہاں جو افسر آ جائے، وہ کائی بھاؤ میں جانے کی طبیعت نہ کرے"

انھوں نے بتایا کہ ایک تھانے دار کا تبادلہ ہوا تو اس نے کہا مجھے حوالدار بنا دو مگر یہیں رہنے دو۔

"بڑو سے چھوٹو بنادو، پھر یہیں رہو۔"

میو قوم کی جہالت نے اس کو دیگر اقوام کے لئے استحصال کا بہترین ذریعہ بنا رکھا ہے۔ بنیا سود کے ذریعہ، افسران رشوت کے ذریعہ اس کو لوٹ رہے ہیں۔ اگر یہ سب نہ بھی ہو تو میو قوم چونکہ تجارت سے مکمل طور پر کنارہ کش ہے، اس لئے بازار کے راستہ وہ سب کچھ جیبوں سے نکل جاتا ہے جو وہ کھیتوں پر اپنا پسینہ بہا کر کماتی ہے۔

برکلی سے ہم پونھانا جا رہا تھا بس میں میرے پاس کھڑے ہوئے ایک پتلون پوش مسافر نے میرے ساتھی سے کہا :

"یہ کسی اخبار کے اڈیٹر ہیں ؟"

اس وقت میں اپنی رپورٹ کی سطریں لکھ رہا تھا۔ اور اس کو دیکھ کر اسے شبہ ہوا۔ گفت گو کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ہفت روزہ الجمعۃ دیکھتا رہا ہے اور کسی اسکول میں ٹیچر ہے۔

اس سفر میں کئی ایسے تجربے ہوئے جس سے اندازہ ہوا کہ میوات میں ہفت روزہ الجمعیۃ کا حلقہ بڑھ رہا ہے۔

۷ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو مغرب کی نماز ہم نے پونھانا میں پڑھی۔ یہاں قصبہ کے باہر جو سڑک گزرتی ہے اس پر چھوٹا سا بازار بن چکا ہے۔ یہاں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ چند بڑے پختہ مکانات میں سے ایک بڑا مکان میٹو کا بھی ہے۔ یہ مولانا محمد الیاس صاحب (۳۰ سال) ہیں جو مدرسہ امینیہ کے فارغ ہیں۔

میوات کے لحاظ سے یہ ان کی پیش بینی قابل داد ہے کہ دس برس پہلے جبکہ یہاں خاک اڑتی تھی اور سونی سڑک کے سوا کوئی چیز مسافر کا استقبال کرنے کے لئے موجود نہ تھی انھوں نے اس جگہ کی اہمیت کو سمجھا اور اپنا پہلا مکان یہاں کھڑا کیا۔

پونہانا ضلع گوڑگاؤں کا ایک قصبہ ہے۔ ۱۲ برس پہلے یہاں مواصلات کے ذرائع نہیں تھے۔ اس کے بعد برکلی سے ہوڈل تک سڑک بنی جس سے یہ مقام پورے ملک سے جڑ گیا۔

موجودہ سڑک قدیم قصبہ سے کسی قدر فاصلہ سے گذرتی ہے۔ قصبہ میں ۴۷ ۱۹ کے بعد غیر مسلم اکثریت ہو گئی ہے۔ مگر اطراف کی بستیوں میں اب بھی مسلمان ہی زیادہ تعداد میں بستے ہیں۔ پونھانا کے پاس سڑک کے کنارے کی تمام زمینیں مسلمانوں کی تھیں مگر وہ سب کی سب دوسروں نے خرید لیں اور آج وہاں ان کی

دکانیں کھڑی ہوئی ہیں۔ یہ المیہ اکثر ان قصبات میں پیش آرہا ہے جہاں سڑکیں بنائی گئی ہیں۔ میو قوم تجارت اور دکانداری سے پہلے ہی دستکش تھی۔ اب جدید سڑکوں کی تعمیر کے بعد جو زمینیں تجارتی اہمیت اختیار کر رہی تھیں ان کو بھی اس نے بنئے کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

میں نے رات یہیں گزاری۔ صبح آنکھ کھلی تو ایک میو دردانگیز انداز میں یہ نغمہ گا رہا تھا۔

خدا کے سامنے سر کو جھکا لیتے تو اچھا تھا
اگر بگڑی ہوئی قسمت بنا لیتے تو اچھا تھا
مسلمانوں تمہیں اس فرقہ بندی نے مٹایا ہے
اگر تم راہ اک اپنی بنا لیتے تو اچھا تھا

ایک طرف میو یہ نغمہ الاپ رہا تھا، دوسری طرف سڑک کے اوپر بازار کی سرگرمیاں زندہ ہو رہی تھیں۔ بسیں اور ٹرک گھڑگھڑا رہے تھے۔ دوکانوں پر روشنیاں جلائی جا رہی تھیں۔ لوگ نئے دن کی آمد پر دکانیں جمانے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں نے سوچا "میو جو نغمہ گا رہا ہے کتنا صحیح ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں وہ ایک بے اثر روایتی لفظ بن کر رہ گیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان الفاظ کو جدید دنیا کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کیا جا سکا۔ جن مسلمانوں نے یہاں سڑک کے کنارے اپنی زمینیں فروخت کی ہیں وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ "سڑک" کیا چیز ہے اور اس کے کنارے کی زمین کیا حیثیت رکھتی ہے۔ وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر تھے کہ سڑک کی تعمیر نے ان کی زرعی زمین کو کاروباری زمین کے درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ انھوں نے معمولی داموں پر اپنی زمینیں فروخت کر دیں اور اب اپنی زمینوں پر وہ بے جگہ ہو کر رہ گئے ہیں۔

"خدا کے آگے سر جھکانا" اور "فرقوں کو ختم کرنا" اعلیٰ ترین چیزیں ہیں۔ مگر ان چیزوں کو فروغ دینے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ زمانہ کے لحاظ سے دنیا میں ان کے لئے "جگہ" فراہم کی جائے۔ جو اصول زمین میں اپنی جگہ حاصل نہ کر سکے وہ زندگی میں اپنی جگہ حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ زندگی زمین پر بنتی ہے، ہوا میں نہیں بنتی۔

یہ مولوی الیاس حضرت رائے پوری رح کی خدمت میں عرصہ تک رہے ہیں، ان کے واقعات اور قیمتی ملفوظات سناتے رہے مثلاً انھوں نے بتایا کہ ایک بار دنیا کی چیزوں کا ذکر تھا تو فرمایا:

"محللات سب دین ہیں، محرمات سب دنیا ہیں۔ جو اللہ میاں نے حلال کیا وہ دنیا کس طرح ہو سکتی

ہے۔"

میؤ قوم کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے مولوی الیاس صاحب نے کہا میؤ قوم کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی خودداری ہے۔ مگر یہی اس کے لئے مصیبت بھی بن گئی ہے۔ بڑھی ہوئی خودداری کی وجہ سے انھیں کسی کی ماتحتی گوارا نہیں ہوتی۔ اسی لئے ان میں تعلیم کا رجحان نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ تعلیم حاصل کر کے ملازمت کرنی ہوگی اور ملازمت نبھے گی نہیں۔ کاروبار کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے پاس سرمایہ نہیں۔ کم سرمایہ سے معمولی کام شروع کر سکتے ہیں۔ مگر اس میں بھی خودداری رکاوٹ بن جاتی ہے۔ بڑا کام کرنا ہو تو کریں مگر اس کے لئے سرمایہ کہاں سے لائیں۔

۱۸ اکتوبر کی صبح کو ۹ ½ بجے ہم اٹاوڑ (ضلع گوڑ گاؤں) پہنچے۔ اس قصبہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ قصبہ میں جب میں اپنے رفیق مولانا نور محمد صاحب کے ساتھ چل رہا تھا تو راستے پر سیدھے سادے میوؤں کو دیکھ کر مجھے عجیب عبرت ہو رہی تھی۔ بڑے اور چھوٹے سلام کر کے فوراً دونوں ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھاتے اور پھر خاموشی سے الگ ہو جاتے۔ میرے سامنے ٹوٹے پھوٹے مکانات تھے۔ گندی گلیاں جو قدم قدم پر گھومتی تھیں۔ ایک ایسی بستی کا منظر پیش کر رہی تھیں جو ابھی دور جدید سے نہ صرف پیچھے ہے بلکہ اسے خبر بھی نہیں کہ دور جدید ہے کیا۔

اٹاوڑ میں علماء، چودھریوں اور عام لوگوں کا ایک مجمع اکھٹا ہو گیا تھا۔ میں نے گفتگو کرتے ہوئے اپنے خیالات پیش کئے۔

یہاں چودھری یٰسین خاں صاحب ایک خاص شخصیت ہیں۔ انھوں نے میو قوم کے بارہ میں بہت سی باتیں بتائیں، انھوں نے میؤ قوم کے بارہ میں ایک شعر سنایا:

تری مہماں نوازی دیکھ کر اے قوم شرمائی
فضائے عالم برزخ میں روح حاتم طائی

انھوں نے کہا کہ یہ قوم بے حد جفاکش، بے حد وفادار، بے حد فیاض ہے، مگر اس کی یہ خصوصیات ضائع ہو رہی ہیں۔ ان کو استعمال نہیں کیا گیا۔

اٹاوڑ میں یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ یہاں میو کسانوں نے تقریباً ساٹھ ٹیوب ویل لگالئے ہیں اور لگاتے جا رہے ہیں۔ آٹے کی مشینیں بھی بہت سی لگی ہوئی ہیں۔ میوات کے لحاظ سے یہ ایک نئی بات

ہے کیونکہ میواس سے پہلے مشین وغیرہ پر یقین نہیں رکھتے تھے اور اکثر مقامات پر اب تک یہی حال ہے۔

روپڑہ میں ولی محمد صاحب وکیل سے ملاقات ہوئی۔ ان کو میو قوم کی اصلاح کا بڑا درد ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک بار انھوں نے گاؤں کے تمام لوگوں کو جمع کیا اور کہا کہ اس وقت سب سے اہم مسئلہ میو قوم کو تعلیم یافتہ بنانا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہر خاندان یہ طے کرے کہ وہ اپنے یہاں سے کم از کم ایک لڑکا اسکول میں داخل کرے گا۔ مگر لوگ تیار نہیں ہوئے۔

انھوں نے ایک انگریز مسٹر برین کی کتاب (Village Uplift in India) کا ذکر کیا۔ اس میں میوات کا بھی ذکر ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ میو قوم بڑی جاندار ہے اور جب وہ تعلیم کی طرف مائل ہوگی تو ملک میں ممتاز حیثیت حاصل کرلے گی۔

۱۸ اکتوبر کی شام کو چار بجے ہم پالپوری پہنچے۔ یہاں میوات کے مشہور مصلح مولانا عبداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے مولانا رشید احمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ اپنے والد صاحب قبلہ کے اصلاحی کام کو اس علاقہ میں جاری رکھے ہوئے ہیں۔

گوت میں شادی کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے کہا کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مسئلہ کہیں پیدا ہوتا ہے اور اس کا حل کہیں ہوتا ہے۔ میں نے کہا مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ گوت کے اندر شادی کے مسئلہ کی اصلاح مذہبی طرز پر مشکل ہے۔ اس قسم کی چیزیں جب زیادہ مدت تک کسی قوم میں رائج رہتی ہیں تو ان پر ایک تقدس کا رنگ چھا جاتا ہے۔ گویا وہ مذہب جس کے حوالے سے ہم رسم کو دور کرنا چاہتے ہیں خود رسم بھی اسی قسم کا مذہب بن چکی ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں میرا خیال ہے کہ اگر جدید تعلیم کو رواج دیا جائے تو شاید زیادہ جلد اصلاح ہو جائے۔ میں نے کہا کہ جدید تعلیم کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ سائنٹفک نقطہ نظر یا موضوعی طرز فکر پیدا کرتی ہے۔ اور موضوعی طرز فکر رہبانی طرز فکر کے عین برعکس ہے۔ اس طرح ایک کا پیدا ہونا خود بخود دوسرے کو ختم کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔

مولانا رشید صاحب نے میرے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اس کا تجربہ کیا ہے مگر میں نے اس کا فائدہ نہیں پایا۔

مولانا رشید صاحب نے ہفت روزہ الجمعیتہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جدید تعلیم اور اقتصادیات پر آپ جو اس قدر شدت سے زور دیتے ہیں تو اس کا مطلب کیا ہے کیا آپ ذہن میں اسی کو

سب سے زیادہ اہم چیز سمجھتے ہیں۔

میں نے کہا کہ دین میں اصل اور اوّلین اہمیت کی چیز صرف ایک ہے اور وہ ہے بندے اور خدا کے درمیان تعلق پیدا ہونا۔ اسی تعلق باللہ کے اوپر آخرت کی کامیابی کا انحصار ہے۔ مگر اسی کے ساتھ دنیوی زندگی کی نسبت سے بھی کچھ تقاضے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ دوسرے درجہ کی چیزیں ہیں اور ہماری موجودہ زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں اہل دین کا غلبہ ہو۔ ان کی دھاک قائم رہے۔ اسی دوسرے مقصد کے لئے میں تعلیم اور اقتصادیات پر زور دیتا ہوں۔ کیوں کہ موجودہ زمانہ میں اس کے بغیر دنیوی استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔

مولانا میرے جواب سے مطمئن ہو گئے۔

مولانا رشید صاحب نے مولانا الیاس صاحبؒ کا ایک واقعہ بیان کیا۔ دہلی میں ایک شخص تھے جو داڑھی مونڈتے تھے۔ ان کا آنا جانا نظام الدین میں تھا۔ لوگوں کو ان کی خلاف شرع وضع پسند نہیں تھی۔ ایک بار کسی نے ٹوک دیا۔ یہ بات انھیں اتنی بری لگی کہ انھوں نے نظام الدین آنا چھوڑ دیا۔

مولانا الیاس صاحب کو معلوم ہوا تو خود ان کے پاس گئے اور ان سے فرمایا:

"بھائی معاف کرو ہم کو بات کہنا نہیں آیا۔"

مولانا رشید احمد صاحب سے اس قسم کی مفید باتیں بہت دیر تک ہوتی رہیں۔

روپڑا میں میں نے حکیم الدین، شمس الدین اور صلاح الدین صاحبان سے ملاقات کی۔ یہ تینوں بھائی احمد آباد (نارول) میں کپڑے کے کارخانہ میں چھپائی کا کام کرتے تھے۔ یہ مسلمان کا کارخانہ تھا جو بالی ڈائنگ کے نام سے مشہور تھا۔ احمد آباد کا فساد جب اطراف میں پھیلا تو بالی ڈائنگ کی بھی باری آگئی۔ "کارخانہ کے مزدوروں کے درمیان آپس میں کوئی فساد نہیں تھا"، حکیم الدین صاحب نے مجھ سے بیان کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں تک کہ جب باہر لوگ آگ لگا رہے تھے اس وقت بھی اندر ہندو مسلمان کام کر رہے تھے۔

نارول کے کارخانوں میں جب آگ لگنا شروع ہوئی تو تینوں بھائیوں نے پہلے آگ بجھانے اور مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر جلد ہی ان کے پاس ان کے کارخانے کا مستری ٹھاکر دھنجی (بابن پور۔ اقبال گڑھ) آیا اور کہا کہ یہاں سے بھاگو ورنہ تم لوگ بھی مارے جاؤ گے۔ چنانچہ اس نے تینوں بھائیوں کو

باہر باجرہ کے کھیت میں پہنچا دیا۔ یہاں یہ لوگ تین روز رہے۔ دھنجی روزانہ ان کے پاس چھپ کر آتا اور پانی، بیڑی، کھانا پہنچا جاتا۔ چوتھے روز وہ آیا تو اس نے کہا کہ لوگوں کو شبہ ہوگیا ہے اور وہ کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں کو دبکا رکھا ہے اور کھانا وغیرہ پہنچاتا ہے، اب تک میں نے تم لوگوں کی حفاظت کی۔ اب تم لوگوں کا بچنا مشکل ہے اس لئے یہاں سے چلے جاؤ۔

یہ لوگ کھیت سے باہر نکلے۔ احمد آباد کے اطراف کی تمام بستیاں غیر مسلموں کی ہیں۔ اس لئے کسی گاؤں میں جانے کا سوال نہیں تھا۔ راستہ میں ہندوؤں کی ٹولیاں ملیں اور پوچھ گچھ کی۔ مگر وہ لوگ چونکہ دھوتی پہنے ہوئے تھے اس لئے انھوں نے ان کو "بھیا" سمجھ کر چھوڑ دیا۔ یہ لوگ نالوں کے راستہ سے چھپتے چھپاتے احمد آباد کی درگاہ شاہ عالم پر پہنچے اور وہاں کچھ روز رہ کر اپنے وطن واپس آگئے۔

ماپوری سے واپسی میں میں نے کچھ وقت ہتھین میں مولانا بشیر احمد صاحب کے مدرسہ میں گزارا۔ مولانا بشیر صاحب ایک مخلص نوجوان ہیں جو دینی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ ان کو مدرسہ چلانے میں سخت مشکلات پیش آرہی ہیں۔ مگر انھوں نے ہر حال میں اس کو جاری رکھنے کا عزم کر رکھا ہے۔

یہاں چاند خاں (کنجن نیر ضلع بھرت پور) سے ملاقات ہوئی۔ ایک گفتگو کے دوران انھوں نے کہا:

میوات میں تو وہی شخص کامیاب ہوگا جو لوگوں کو پھر سے مسلمان بنائے"۔

انھوں نے کہا کہ باہر والے تو میوات کو پتہ نہیں کیا سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقت حال اس سے مختلف ہے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تقریر میں نے سنی۔ اس میں انھوں نے میوانیوں کے بہت بڑے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"تم لوگ ابھی دریا کے ساحل پر ہو، تم ابھی دین کے کنارے آئے ہو۔ دین کی گہرائی میں نہیں پہنچے"۔

انھوں نے کہا میوانیوں کا یہ حال ہے کہ اوپر سے تو مذہب اور اندر سے کچھ نہیں۔ جب کسی برائی پر ٹوکا جائے تو جواب دیں گے:

"ہمارے باپ دادا سے چلا آیا ہے تو ہم کیسے چھوڑ دیں"۔

انھوں نے بتایا کہ چورگڑھی (ضلع بھرت پور) میں مولانا یوسف صاحب بیعت لے رہے تھے۔ بہت سے لوگوں نے "بھینٹا پکڑا" مگر جب مولانا نے کہا کہ کہو "چوری نہیں کریں گے" تو سب نے بھینٹا چھوڑ دیا۔ انھوں

نے کہا" یہ ہمارا کسب ہے اس کو کیسے چھوڑ دیں گے"۔ مگر اب تبلیغ کی برکت سے بیشتر لوگ چوری کا کام چھوڑ چکے ہیں۔

ماپوری میں سڑک کے کنارے ایک ٹریننگ سنٹر ہے جس کا نام ہے (Common Facility Workshop) یہاں مختلف قسم کے ٹکنکل کاموں کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ اس وقت چھ طالب علم ہیں جن میں سے چار مسلمان ہیں۔ اس قسم کے کام اگر میوات میں پھیلائے جائیں تو بہت فائدہ ہو۔

۱۹ اکتوبر کی دوپہر کو ہم پلول پہنچے۔ پلول گویا میوات کی سرحد ہے۔ دلی سے قریب ہونے کی وجہ سے یہ ایک بڑا تجارتی مرکز بن گیا ہے۔ سیکڑوں دیہاتوں کے میو یہاں خریداری کے لئے آتے ہیں۔ مگر وہ صرف خریدار ہوتے ہیں۔ دکان دار نہیں۔

یہ منظر پورے میوات میں نظر آتا ہے۔ بے شمار چھوٹے چھوٹے دیہاتوں کا یہ علاقہ دیہاتوں کے اندر میو دنیا کا منظر پیش کرتا ہے۔ مگر قصبات جو تجارتی اور تمدنی مراکز کی حیثیت رکھتے ہیں ان پر تمام تر دوسرے لوگوں کا قبضہ ہے۔ دیہاتوں میں دیکھئے تو میو پیدا کرنے والی قوم نظر آئے گی۔ مگر قصبات میں آکر اس کی حیثیت صرف خرچ کرنے والی قوم کی بن جاتی ہے۔

جی، ٹی روڈ پر پلول کی واحد آباد مسجد ہے۔ یہاں سڑک پر کھڑے ہوں تو مسجد سے ملا ہوا مقبرہ کا بلند و بالا گنبد صاف دکھائی دیتا ہے۔ تناسب کے ساتھ بنا ہوا یہ گنبد کسی وقت اس علاقہ کی نمایاں ترین عمارت ہوگا۔ مگر آج اس کی برجیاں ٹوٹ چکی ہیں۔ اور اپنے ٹوٹے ہوئے پتھروں کے ساتھ وہ اس حال میں نظر آتا ہے کہ سڑک کے کنارے جدید طرز کی بنی ہوئی عمارتیں ہیں جن میں ہندی اور انگریزی کے شاندار سائن بورڈوں کے نیچے تجارتی سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔ اور ان کے پیچھے یہ چارسو سالہ گنبد اس طرح خاموش کھڑا ہوا ہے جیسے زبان حال سے کہہ رہا ہو کہ —— میں اس قوم کا نمائندہ ہوں جو زمانہ سے پچھڑ گئی، جو دور جدید کی قوتوں کی مالک نہ بن سکی۔

پلول سے میں دلی کی بس میں روانہ ہوا مسافروں میں کچھ تاجر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ذکر یہ تھا کہ آج کل قیمتیں اتنی تیزی سے بدلتی ہیں اور کاروبار میں اتنے غیر یقینی قسم کے انقلابات آتے ہیں کہ سنبھلنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ایک تاجر نے یہ جملہ کہا:

"اب کے بگڑے بنیں گے نہیں"

تاجر کے اس جملہ میں بلاشبہہ صداقت تھی، البتہ میں اس میں اتنا اضافہ کروں گا کہ ـــــ سوا ان لوگوں کے جو زیادہ محنت کرنے کے لئے تیار رہوں۔"

میوات میں ایک مثل مشہور ہے۔

"میو مراجب جانو جب تیجا ہو جائے۔"

یہ میو قوم کی صحیح تصویر ہے۔ میو ایک بے حد بہادر اور جفاکش قوم ہے۔ بڑی سے بڑی مار اور بڑے سے بڑے مصائب کو سہہ کر نکل آتی ہے۔ اگر اس قوم کی قوتوں کو استعمال کیا جاسکے تو اس سے اسی طرح کی ایک جاندار قوم ابھر سکتی ہے۔ جیسے کہ جاپانی یا چینی یا جرمن قوم۔

پانچواں سفر

۳۱ دسمبر ۱۹۶۹ کو میں دہلی سے الور کے لئے روانہ ہوا۔ میرے کمپارٹمنٹ میں میرے سمیت دو مسلمان تھے باقی تمام غیر مسلم تھے۔ درمیانی اسٹیشن پر ایک غیر مسلم مسافر نے پلیٹ فارم سے چائے خریدی۔ پیتے پیتے ٹرین چل پڑی۔ انھیں چائے کی قیمت میں ۲۵ پیسے دینا تھے۔ انھوں نے روپیہ دیا۔ چائے والے نے پیسہ واپس کیا تو معلوم ہوا کہ صرف ۴۰ پیسے واپس کئے ہیں۔ یعنی ۲۵ پیسے کے بجائے ۶۰ پیسے لے لئے۔ اب چوں کہ ٹرین تیز ہو چکی تھی اس لئے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

"فکر نہ کیجئے" دوسرے غیر مسلم مسافر نے کہا "یہاں نہیں تو وہاں تو اس کو دینا ہی پڑے گا"۔ جزا وسزا کا یہ تصور قطعاً اسلامی تھا اس لئے مجھے تعجب ہوا۔ بعد کو گفتگو میں معلوم ہوا کہ وہ کائستھ ہیں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ سرکاری ملازمت کے سلسلے میں جے پور میں قیام ہے۔ ان کے اکثر خیالات مسلمانوں جیسے تھے۔ اپنے والد کے متعلق انھوں نے بتایا کہ اگرچہ انھوں نے مذہب تبدیل نہیں کیا تھا، مگر وہ مسجد میں جا کر نماز پڑھا کرتے تھے اور قرآن پڑھتے تھے۔

پورے کمپارٹمنٹ میں وہ تہذیب اور شرافت میں نمایاں تھے، باوجودیکہ بیوی بچوں کے ساتھ سفر کر رہے تھے مگر عام مسافروں کی طرح ہولڈ ال بچھا کر جگہ گھیرنے کے بجائے خود اور بچوں کو زحمت دے کر دوسرے مسافروں کو جگہ دے رہے تھے۔ وہ اردو اور فارسی بھی پڑھے ہوئے ہیں۔ ان کے والد اور خاندان کے کئی افراد اردو کے اچھے شاعر تھے۔ دوران گفتگو انھوں نے کہا" میں ہندی کا ورودھی نہیں ہوں۔ مگر اردو پڑھنے سے جو تہذیب آتی ہے وہ ہندی سے نہیں آتی۔ زبان کا تعلق تہذیب سے بہت زیادہ ہے:

اس مسافر کا نام و پتہ یہ ہے:

T.P. Srivastava, E-171/C, Scheme, Jaipur

اسی قسم کا ایک تجربہ الور میں ہوا۔ الور میں ہم ایک رکشے پر بیٹھے۔ میں نے رکشے والے سے بات چیت شروع کی۔ معلوم ہوا کہ وہ جاٹ ہے اور سوہن لال نام ہے۔ اس کے گھر پر ۳۰ بیگھہ کھیت ہے۔

امسال پوری زمین پر چنا بو دیا ہے۔ تقریباً ایک سو من پیداوار کی امید ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کے صرف ایک چھوٹا بچہ ہے اور کوئی اولاد نہیں۔

"پھر تم رکشا کیوں چلاتے ہو" میں نے سوال کیا۔

اس کے جواب میں اس نے بتایا کہ اس کے گاؤں کے لوگ سب شرابی اور غنڈے ہیں۔ وہ گاؤں میں رہتا ہے تو اس کو بھی اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ چنانچہ وہ شہر چلا آیا اور رکشا چلانا شروع کر دیا۔ جس میں وہ دو روپے رکشا کے مالک کو دینے کے بعد ۵ ۔ ۷ روپیہ روز کما لیتا ہے۔ فصل کاٹنے کے وقت گھر جانا ہوتا ہے تو آخری گاڑی سے رات کے وقت جاتا ہوں اور صبح سویرے لوٹ آتا ہوں۔

اس نے بات چیت میں ایمان اور بسم اللہ وغیرہ کے الفاظ اس طرح دہرائے کہ مجھے شبہ پیدا ہوا۔

"جب تم اتنا کرتے ہو تو کبھی کبھی نماز پڑھ لیا کرو" میں نے کہا۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ "میرا جی نماز پڑھنے کے لئے بہت چاہتا ہے مگر کوئی سکھانے والا نہیں"

"پھر مالک کا نام کس طرح لیتے ہو"۔ میں نے پوچھا۔

"اللہ اللہ کر لیتا ہوں" اس نے کہا۔

ان دو واقعات کو دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ کتنے اللہ کے بندے ایسے ہیں جو اپنے دل کے اندر ایمان کی چنگاری لئے بیٹھے ہیں۔ ٹرین کے مسافر یا رکشا کھینچنے والے سے جب میں نے گفتگو شروع کی تو وہم وگمان بھی نہیں تھا کہ وہ ایسے نکلیں گے۔ کاش ان چنگاریوں کو ہوا دے کر شعلہ بنایا جا سکے۔

۱۳ دسمبر کی دوپہر کو میں الور پہنچا۔ یہاں دیگر اصحاب کے علاوہ مولانا حافظ جمال الدین صاحب اور مولانا عبد الرحیم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ آپ دار العلوم العربیۃ الاسلامیہ (جودھپور) میں سنی اور استاد ہیں۔

الور میں ۵ بجے شام کو میو بورڈنگ ہاؤس میں ایک نشست ہوئی جس میں اسکول اور کالج کے طلبہ اور شہر کے کچھ مسلمان اکٹھا ہوئے۔ اس موقع پر میں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ الور میں ۱۹۴۷ء کے فسادات نے مسلمانوں کو بری طرح برباد کر دیا ہے مگر وسط شہر میں چار بیگھ زمین کے ساتھ میو بورڈنگ جیسے ادارہ کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ سب کچھ لٹنے کے بعد بھی آپ کے پاس ابھی ایک بنیاد باقی ہے۔ میں نے

کہا کہ میں نے ایک بار نیم کا ایک درخت کٹوایا۔ بظاہر سطح زمین سے اس کا وجود مٹ گیا مگر اگلی برسات میں میں نے دیکھا کہ اس میں کئی نئے درخت نکل آئے ہیں اور نہایت تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ نیم کا تنہ اگرچہ کٹ گیا تھا مگر اس کی جڑیں پھر بھی زمین کے اندر باقی تھیں۔ ان جڑوں نے زمین سے غذا حاصل کر کے دوبارہ نئی اور زیادہ شاداب زندگی حاصل کر لی۔

میں نے کہا اگر آپ کے اندر حوصلہ اور عمل کا ذوق ہو تو یہ میو بورڈنگ آپ کے لئے اسی قسم کی ایک بنیاد بن سکتا ہے۔ آپ کی محنت اسے پوری میو قوم کا تعلیمی مرکز بنا سکتی ہے۔ یہ ایک جڑ ہے جس سے آپ دوبارہ ایک پورا درخت اگا سکتے ہیں۔

میں نے کہا مسلمان کو دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک خدا سے تعلق دوسرے دنیوی استحکام خدا سے تعلق کے بارہ میں اس علاقہ میں بہت کچھ کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے مگر مادی استحکام کا خانہ بالکل خالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس علاقہ میں میو اگرچہ اکثریت میں ہیں مگر یہاں انھیں عزت کا مقام حاصل نہیں۔ وہ دوسری قوموں کے استحصال کا سامان بنے ہوئے ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ لوگ جو یہاں جمع ہیں وہ صرف ایک کام اپنے ذمہ لے لیں اور وہ یہ کہ میو بورڈنگ کو زندہ کریں اور اس کو میواتیوں کے لئے جدید تعلیم کا مرکز بنائیں۔ اگر یہ کام آپ کر لیں تو گویا آپ نے سارا کام کر لیا۔

الور سے شمال کی جانب تارکول کی سڑک وجے ساگر اور ریواڑی ہوتی ہوئی دلی چلی گئی ہے۔ اس سڑک پر دو میل چلنے کے بعد ایک بورڈ مسافر کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے جس پر لکھا ہوا ہے:

دلمیر میکا نائزڈ ایگریکلچرل فارم

یہ چودھری دلمیر خاں کا زراعتی فارم ہے جو سڑک کے دونوں طرف ڈیڑھ سو بیگھ کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ ایک طرف سرسوں کے کھیت بسنتی پھولوں کا فرش بچھائے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف آلو کے کھیت زمین پر سبز تختہ کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ تیسری طرف گنے کے کھیت ہرے پاسبان کی طرح کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ سبز دنیا ایک طرف پہاڑی کے دامن میں جا کر ختم ہوتی ہے اور دوسری طرف حدِ نظر تک جا کر آسمان کے نیلے کناروں سے مل گئی ہے۔

دلمیر خاں ساری کھیتی مشینوں کے ذریعہ کرتے ہیں۔ ٹریکٹر کا گیرج انھوں نے کھولا تو

زیکوسلاویکیہ کاٹریکٹراس کے اندر کھڑا ہوا تھا جس کی پیشانی پر "۷۸۶" کا نشان ظاہر کر رہا تھا کہ یہ ایک مسلمان فارمر کا ہے۔ دلمیر خاں کو الور میں نمبر ایک کسان کا تمغہ ملا ہے۔ انھوں نے حال میں جیپ خریدلی ہے اور اب اپنے فارم پر ٹیلی فون بھی لگوانے والے ہیں۔

میں چند گھنٹے دلمیر خاں کے ساتھ رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اگرچہ معمولی تعلیم یافتہ میو ہیں۔ مگر فطرۃً غیر معمولی صلاحیت کے آدمی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ وہ سب کو ایک قسم کی صلاحیت دیکر پیدا نہیں فرماتا۔ کسی سماج میں اعلیٰ صلاحیت کے کسی فرد کا پیدا ہونا اللہ تعالیٰ کی خصوصی نعمت ہوتی ہے۔ ایک اعلیٰ صلاحیت کا آدمی پوری بستی بلکہ پورے علاقہ کو سنبھالنے کے لئے کافی ہے۔

قدرت ہم کو ایسے بہترین افراد دیتی ہے مگر بدقسمتی سے یہ افراد عام طور پر اپنی صلاحیتوں کو صحیح سمت میں استعمال نہیں کرتے۔ یہ لوگ اپنی اعلیٰ فطری صلاحیتوں کا بہترین مصرف یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کو قتل کروادیں، کسی کا کھیت کٹوادیں، کسی کو مقدمہ بازی میں الجھا کر اس کا گھر بار بکوادیں۔ موجودہ زمانہ میں الیکشن اور لیڈری نے ایسے لوگوں کو اپنے ذوق کی تسکین کے لئے نئے مواقع فراہم کردیئے ہیں۔ کتنے تعلیم یافتہ اور اعلیٰ ترین صلاحیت والے لوگوں کا حال یہ ہے کہ سیاسی اکھاڑے بازی میں وہ اپنی ساری عمر ضائع کر دیتے ہیں اور اس وقت سے پہلے انھیں ہوش نہیں آتا جب تک لاحاصل جدوجہد کا یہ آخری انجام ان کے سامنے نہ آجائے کہ سیاست کا سرا ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہو۔

دلمیر خاں کی یہ بات مجھے بے حد پسند آئی کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں جو اعلیٰ صلاحیتیں دی تھیں ان کو انھوں نے داداگیری اور لیڈری میں ضائع نہیں کیا بلکہ ان کو تعمیری کام میں لگایا۔ ان کو وراثت میں جو زمین ملی تھی وہ بہت کم تھی۔ انھوں نے زمینیں حاصل کرنا شروع کیں۔ یہاں تک کہ وہ موجودہ فارم کے مالک بن گئے۔ انھوں نے اس علاقہ میں بجلی منگوائی۔ وہ بس اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کے لئے بھی بہترین کام والے بن گئے ہیں۔ جو شخص دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر اپنی تعمیر کے کام میں لگتا ہے، اس سے زیادہ سماج کا مفید عنصر اور کوئی نہیں۔

الور سے ۸ میل کے فاصلہ پر راجہ کا ایک چھوٹا سا محل ہے جو کسی رانی کے لئے بنوایا گیا تھا اس کا نام سیلی سیڑھ (Siliserh) ہے اور اب وہ ریاستی حکومت کے تحت سیاحوں کے لئے ہوٹل کا کام دیتا ہے۔ یہ پورا راستہ پہاڑ کے کنارے کنارے نہایت خوش منظر وادیوں سے گزرتا

ہے ۔ سیلی سیڈ (راجستھان اسٹیٹ ہوٹل) کے تین طرف جھیل ہے اور پہاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کی حسین دنیا میں انسان نے اپنے لئے ایک رہائش گاہ کی جگہ ڈھونڈھ لی ہے ۔ چند گھنٹے یہاں کے پرفضا ماحول میں گزار کر ہم دوبارہ الور واپس آ گئے ۔

الور اور سیلی سیڈھ کے درمیان آٹھ میل کا سفر بڑا پرکیف تھا ۔ شتاب خاں (ایڈوکیٹ) اپنی نئی جیپ کو خود ڈرائیو کر رہے تھے ، تارکول کی چکنی سڑک اور دونوں طرف پہاڑی کے دامن میں سرسبز مناظر ، اس نے ہمارے سفر کو سیاحوں کی روایتی دنیا کا سفر بنا دیا ۔ تھوڑی دیر کے لئے ایسا محسوس ہوا کہ فطرت کے خاموش حسن میں زندگی کے تلخ حقائق گم ہو گئے ہیں ۔ مگر چند گھنٹے بعد جب میں اس دنیا سے واپس لوٹا تو دوبارہ میرے سامنے وہی منظر تھا ــــ سوکھے ہوئے چہروں کے ساتھ اپنے میلے جسموں پر معمولی کپڑے لپیٹے ہوئے میؤ ، اور پھر ان کے بچے جو خاموش اور معصوم صورتیں لئے ہوئے اس طرح بے زبان چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جیسے انھیں ماضی ، حال ، مستقبل کسی چیز کی خبر نہ ہو ۔ آہ یہ مناظر دیکھ کر میرا کلیجہ پھٹ جاتا ہے ۔ سیکڑوں برس سے یہ قوم اسی حالت میں پڑی ہوئی ہے اور آج بھی کوئی نہیں ہے جو یہ بتائے کہ زمین کے نقشہ میں اپنی جگہ حاصل کرنے کے لئے اسے کیا کرنا چاہیئے ۔

الور میں داؤد پور میری قیام گاہ تھی ۔ یہاں بدستور وہی منظر تھا جو اس سے پہلے میں بار بار دیکھ چکا ہوں ۔ ریلوے کے کنارے وہ نامکمل مسجد کھڑی ہوئی تھی جو الور کی منہدم شدہ مساجد میں پہلی مسجد ہے ۔ جس کے اوپر ۱۹۴۷ء کے بعد دوبارہ دیوار اور چھت کھڑی کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ میرے سامنے وسیع احاطہ کے اندر ایک نامکمل تعمیر کھڑی ہوئی تھی اور اس کے صحن میں ایک مفلوج شخص بدستور حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا ۔ یہ مولانا محمد ابراہیم الوری (سابق ایم ۔ ایل ۔ اے) تھے ۔ اس علاقہ کا ہر شخص جانتا ہے کہ تین سال پہلے "مولانا محمد ابراہیم" اس علاقہ کا سب سے زندہ اور فعال نام تھا ۔ ۱۹۴۷ء کی غارت گری کے بعد اس علاقہ میں مسلمانوں کی دوبارہ بحالی کا جو کام ہوا ہے وہ زیادہ تر مولانا ہی کے ہاتھوں اور انھیں کی سرکردگی میں ہوا ہے ۔ مولانا بلا مبالغہ اس علاقہ کے شیر تھے اور نہ صرف عوام بلکہ مہاراجہ اور منسٹر سب سے اپنی بات منوانے کا حوصلہ رکھتے تھے ۔ ۱۳ر فروری ۱۹۶۷ء کو ایک انتخابی تقریر میں اچانک

فالج کا حملہ ہوا اور اس کے بعد سے وہ بے دست و پا ہو کر پڑے ہوئے ہیں۔

مولانا ابراہیم اگر اپنی قوتوں کے ساتھ صحت مند ہوتے تو اس طرح کی کتنی مسجدیں محض اپنے ذاتی بل بوتے پر بنوا چکے ہوتے لیکن اب وہ نہ ٹھیک سے بول سکتے ہیں اور نہ چل پھر سکتے ہیں۔ وہ حسرت کی تصویر بنے ہوئے داؤد پور کی نامکمل مسجد کو دیکھتے رہتے ہیں مگر بس نہیں چلتا کہ اس کے لئے کچھ کر ڈالیں۔

اس مسجد کی نئی تعمیر اکتوبر ۱۹۶۷ میں شروع ہوئی تھی۔ اس وقت سے اب تک تقریباً ساڑھے چھ ہزار روپے اس پر خرچ ہو چکے ہیں۔ قوم اگر تعاون کرتی تو اب تک ایک نئی مسجد اسلامی شان و شوکت کو ظاہر کرنے کے لئے یہاں کھڑی ہو چکی ہوتی۔ مگر دماغوں کے نقشے دماغوں میں رہ گئے اور کام مکمل نہ ہو سکا۔ اگر یہ مسجد مکمل ہو جائے اور اس کے وسیع احاطہ میں ایک مدرسہ بنا دیا جائے تو یہ جگہ الور میں اسلام کی تعمیر نو کا مرکز بن سکتی ہے۔ مگر یہ کام ہو تو کیسے ہو جبکہ موجودہ دور میں اسلام کی وراثت ایک ایسی قوم کے حصہ میں آئی ہے جو بس دوسروں کے خلاف فریاد و فغاں کرنا جانتی ہے اس نے اپنے وسائل کو مفید کاموں میں استعمال کرنا نہیں سیکھا۔

الور کے شمال مشرقی حصہ میں ایک انتہائی قدیم اونچی عمارت ہے۔ یہ فتح جنگ کا مقبرہ ہے جو ہمایوں کی فوج میں سپہ سالار تھا۔ اس عظیم عمارت کے چاروں طرف احاطہ کی دیوار سے متصل چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے ہیں جن کی مجموعی تعداد ۶۴ ہے۔ کارپوریشن نے آثار قدیمہ سے اجازت لے کر یہاں ایک پرائمری اسکول کھول دیا ہے۔ طلبہ کی تقریباً تین سو تعداد میں ایک مسلمان ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ ہمارا وقف بورڈ اگر اسی طرح قدیم عمارتوں کو اسکول کی مد میں استعمال کرے تو ان کے ذریعہ ملت کی تعمیر کا کتنا بڑا کام ہو سکتا ہے۔

میں اس چھ منزلہ گنبد کے بالکل اوپر چڑھ گیا۔ ٹوٹی ہوئی سیڑھیاں اور شکستہ دیواروں سے گزر کر جب ہم اوپر پہنچے تو پہاڑی کے دامن میں پھیلا الور شہر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہمارے قدموں کے نیچے آباد ہو۔ مقبرہ کی شکستہ عمارت کے اوپر ہم سب سے بالا نظر آتے ہیں مگر اس کے نیچے حقیقی زندگی میں ہمارا کوئی مقام نہیں۔ بنانے والوں نے اگر مقبروں کی تعمیر کے بجائے زندگیوں کی تعمیر کی ہوتی تو جہاں آج مقبرے نظر آتے ہیں وہاں زندگی اور اقبال مندی کے منارے کھڑے

ہوتے ۔ مگر ماضی کی غفلتوں نے ہمارا یہ حال کیا ہے کہ زندگی کے میدان تو درکنار قبرستان کے گوشے بھی ہمیں جگہ دینے کے لئے تیار نہیں ۔

چار سو برس پرانے اس عظیم مقبرہ کے احاطہ میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی جو ۱۹۴۷ کے ہنگامہ میں مکمل طور پر ڈھادی گئی ہے اور اب صرف اس کا ٹوٹا ہوا چبوترہ اور گری ہوئی دیواروں کے نشانات ہیں جو دیکھنے والوں کو یاد دلاتے ہیں کہ یہاں کبھی مسجد کھڑی ہوئی تھی ۔ فسادیوں نے مسجد گرادی مگر عظیم مقبرہ کو باقی رکھا ۔ شاید انھیں معلوم تھا کہ مسجد زندگی کا مرکز ہے جب کہ مقبرہ صرف مردہ کی آماجگاہ ہے جس سے کسی حرکت اور انقلاب کا کوئی خطرہ نہیں ۔

مولانا جمال الدین صاحب کی معیت میں الور شہر کی مساجد اور اسلامی آثار دیکھنے کا موقع ملا ۔ ہم چلتے ہوئے الور کے ایک گنجان اندرونی محلہ دھوبی پاڑہ میں پہنچے ، یہاں وہ مکان اب بھی موجود ہے جس میں مولانا رکن الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ قیام فرما تھے ۔ اور داؤد پور کی مسجد کے بعد یہیں وہ ۸۰ سالہ قدیم مسجد بھی ہے جو الور کی تقریباً ایک سو مسجدوں کے خاتمہ کے بعد یہاں کی واحد مسجد کے طور پر باقی رہ گئی ہے ۔ ہم سڑک پر کھڑے ہوئے ایک ایسی شکستہ عمارت کا منظر دیکھ رہے تھے جس کے سامنے کی دیواریں اور منارے گرادیئے گئے ہیں ۔ مگر مسجد کا اصل حصہ اپنے محراب تما دروازوں کے ساتھ بدستور موجود ہے ۔ اتنے میں اندر سے ایک سفید ریش رفیوجی برآمد ہوئے ۔ یہ اس مسجد میں رہائش پذیر ہیں ۔ اور ان کے بیان کے مطابق وہ وقف بورڈ کو پانچ روپیہ مہینہ کرایہ ادا کرتے ہیں ۔

"یہ کیا ہے سردار صاحب" میں نے پوچھا ۔

"مسجد ہے"

"اگر ہم یہاں نماز پڑھ لیں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا"

"نہیں ۔ شوق سے پڑھئے"

یہ جنوری ۱۹۷۰ کی پہلی تاریخ تھی اور اس وقت شام کے سوا چار بجے تھے ۔ سردار جی ، جن کا نام سہیل سنگھ ہے اور بھاول پور سے آکر ۲۳ برس سے یہاں مقیم ہیں ۔ انھوں نے "مسجد" کے صحن میں ایک چادر بچھائی اور میں نے مولانا جمال الدین صاحب کی امامت میں وہاں عصر

کی نماز پڑھی ۔ غالباً ۱۹۴۷ کے ہنگامہ کے بعد یہ پہلا سجدہ تھا جو اس مسجد میں کیا گیا ۔

سہیل سنگھ ایک معمر آدمی تھے ۔ انھوں نے بتایا کہ وہ حکیم ہیں اور اردو پڑھے ہوئے ہیں ۔ انھوں نے بخوشی ہمیں مسجد کے صحن میں نماز پڑھنے کی اجازت دی ۔ دوڑ کر وضو کا پانی لائے ۔ جائے نماز کے لئے ایک صاف چادر لاکر بچھائی ۔ چائے کے لئے اصرار کیا جس سے ہم نے انھیں باصرار باز رکھا ۔

مجھے غیر مسلموں سے ملاقاتوں میں اکثر یہ اندازہ ہوا ہے کہ ان میں جو لوگ اردو پڑھے ہوئے ہیں وہ عموماً بے تعصب ہوتے ہیں اور ان میں بھائی چارہ کی کیفیت بہت زیادہ ہوتی ہے ۔

میں نے دیکھا تو تین دروں کی اس مسجد میں اوپر وسط میں ایک کتبہ لگا ہوا تھا جس پر جلی حرفوں میں حسب ذیل قطعہ لکھا ہوا تھا :

محنت صبح و مسا سے حاجی عبد اللہ نے
کی بنائے یادگار مسجد اہل حدیث
سال میں تعمیر کے جب فکر شاداں ہیں نے کی
بولا ہاتف خوب ہے یہ معبد اہل حدیث
۱۳۱۲ھ

محلہ دھوبی یاڑہ کی اس مسجد پر میونسپلٹی کی طرف سے ۶۳۸ نمبر پڑا ہوا ہے ۔

"کیسی عجیب بات ہے" میں نے کہا "کہ وہ شہر جہاں سو مسجدیں مکمل طور پر ڈھادی گئی ہیں، وہاں ایک مسجد اب بھی صحیح و سالم کھڑی ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بے حد اخلاص کے ساتھ بنائی گئی تھی ۔"

میرے اس تأثر کو سن کر مولانا جمال الدین صاحب نے ایک شعر پڑھا جو بے حد حسب حال تھا :

کمند گردش ایام کے اسیر نہیں
نقوش دست عقیدت فنا پذیر نہیں

انور کی اس واحد مسجد میں ۲۲ برس بعد پہلی بار سجدہ کرنے کا دل پر بڑا اثر تھا ۔ مولانا

جمال الدین صاحب کے ہاتھ میں دیوان حافظ تھا۔ انھوں نے عارف شیرازی سے فال نکالی تو یہ شعر نکلا:

ازآں زماں کہ فتنۂ چشمت بمارسید
ایمن ز شر فتنۂ آخر زماں شدم

آپ الور میں کسی واقف کار کے ساتھ گھومیں تو جگہ جگہ آپ کو نہایت عبرتناک خبریں سننی پڑیں گی ــــ کہیں آپ دیکھیں گے کہ دور تک شاندار دومنزلہ عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں۔ آپ کا ساتھی بتائے گا کہ یہاں پہلے کربلا اور مسجد تھی۔ کہیں پارک اور اشوک کی لاٹ نوتعمیر سڑک کا حسن دوبالا کر رہی ہوگی اور بتانے والا آپ کو بتائے گا کہ یہاں بھی پہلے ایک مسجد کھڑی ہوئی تھی، اسی طرح کتنے اسکول، کتنے مارکیٹ، کتنے مندر، کتنے مکان اور کتنی نئی تعمیرات نئے نئے بورڈوں کے ساتھ نظر آئیں گی اور بتایا جائے گا کہ یہ سب مسجدوں کو ڈھا کر ان کی جگہ بنوائے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض مقامات پر ایسے آخری نشانات بھی ملیں گے جو بول رہے ہوں گے کہ یہاں پہلے کیا تھا اور اب کیا ہوگیا ہے۔

"آزادی سے قبل ہندستان دنیا کی نظر میں ستیہ اور اہنسا کا نشان تھا" میں نے سوچا اندازہ کرنے والے اندازہ کر رہے تھے کہ آزاد ہونے کے بعد ایشیا کا یہ عظیم ملک پورے ایشیا کا قائد ہوگا۔ مگر آزادی کے ۳۲ ویں برس بھی ملک زبردست تنزل کا شکار ہے۔ سارے ملک کا یہ حال ہو رہا ہے کہ کوئی شخص ملک اور قوم کا وفادار نہیں۔ سب اپنے اپنے اغراض کے لئے ملک کے جہاز میں سوراخ کر رہے ہیں۔ وہ ملک جو نہ صرف ایشیا بلکہ دنیا کا قائد بننے کا خواب دیکھ رہا تھا وہ خود اپنے ملکی مسائل کو بھی حل نہ کر سکا۔

آزادی نے اس ملک کو زبردست امکانات عطا کئے تھے ــــ وسیع جغرافیہ، بے پناہ قدرتی وسائل ایک نہایت باشعور اور محنتی قوم۔ مگر ان میں سے کوئی چیز اس کے کام نہ آئی۔ اور ملک کا یہ حال ہے کہ وہ تیزی سے بدترین انتشار اور بربادی کی طرف چلا جا رہا ہے۔

نفرت اور ظلم کی بنیاد پر جو عمارت کھڑی کی گئی ہو اس کا واحد آخری انجام بربادی ہے، خواہ اس کی تعمیر میں کتنی ہی مضبوط اور قیمتی اینٹیں استعمال کی گئی ہوں۔

یکم جنوری ۱۹۷۰ کی رات ہم نے الور میں گزاری۔ صبح ۴ بجے آنکھ کھلی تو اللہ اللہ اور لا الٰہ الا اللہ کی پرکیف آوازیں آرہی تھیں۔ میرے ساتھی مولانا مفتی جمال الدین صاحب اور مولانا عبدالرحیم صاحب تہجد کے وقت ذکر بالجہر کر رہے تھے۔ دل نے کہا جو سفر اذکار اور عبادت کے جلو میں ہو رہا ہو وہ ضرور بابرکت اور نافع ہوگا۔ اور میں اپنے رب سے اسی کی امید رکھتا ہوں۔

فجر کی نماز میں مولانا مفتی جمال الدین صاحب نے سورہ حاقہ اور سورہ انفطار کی تلاوت کی۔ اس کو سن کر دل کی عجیب کیفیت ہوگئی۔ ظالموں کا انجام سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ پھر اہل ایمان کے انعامات کو سن کر حرص پیدا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی ان خوش قسمت بندوں میں شامل فرمائے۔

۲ جنوری کی صبح کو ہم الور سے گوبند گڑھ کے لئے روانہ ہوئے۔ الور — بھرت پور روڈ پر ہماری بس آگے بڑھی تو ایک مقام پر عجیب منظر نظر آیا۔ یہاں سڑک انگریزی حرف ایس کی شکل میں ٹیڑھی ہوکر آگے کو جارہی تھی۔

معلوم ہوا کہ یہاں سڑک سیدھی لے جانے میں درمیان میں ایک بستی پڑتی تھی جس کا نام نگرڑھ ہے۔ نگرڑھ کے لوگ بگڑ گئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اپنی زمین سے سڑک جانے نہیں دیں گے۔ چنانچہ سڑک کو غیر ضروری طور پر گھما کر لے جانا پڑا۔

اس سے اندازہ کیجئے کہ اس علاقہ کے لوگ ابھی کتنے پیچھے ہیں۔ انھیں نہیں معلوم کہ سڑک کتنی قیمتی چیز ہوتی ہے — سفر کی آسانی، چیزوں کو لانے لے جانے کی آسانی کے علاوہ جس گاؤں سے سڑک گزرتی ہے وہ جگہ گاؤں سے ترقی کرکے بازار کی حیثیت حاصل کرلیتا ہے۔ وہاں کے باغات اور کھیتوں کی پیداوار کی قیمت بڑھ جاتی ہے، کیونکہ ٹرانسپورٹ کا معاملہ آسان ہوجاتا ہے۔ سڑک کے ذریعہ جدید تمدن کی آسانیاں وہاں پہنچنا شروع ہوجاتی ہیں۔ مگر یہ لوگ ابھی اسی قدیم دنیا میں ہیں جب وہ پیدل سفر کرتے تھے، ان کے ذہن قدیم روایتی ڈھانچہ میں اس طرح بندھے ہوئے ہیں کہ وہ نئے زمانہ کی چیزوں کو سمجھ نہیں سکتے۔ حالانکہ سڑک اب نئے زمانہ کی کوئی چیز نہیں رہی۔ وہ اب سینکڑوں برس پرانی ہوچکی ہے۔ مگر یہ لوگ شاید سینکڑوں برس سے بھی پہلے ہزاروں برس پہلے کی دنیا میں رہتے ہیں انھیں قریبی ماضی تک کی خبر نہیں۔

جالو کی، الور ــ بھرت پور روڈ پر ایک چوراہہ ہے، یہاں سے ہمیں بس چھوڑ کر اسکوٹر کے ذریعہ چار میل جانا تھا۔ "کیا کوئی جماعت ہے" ہم تین داڑھی والوں کو دیکھ کر اسکوٹر کے غیر مسلم ڈرائیور نے کہا۔ یہاں تبلیغی جماعتوں کی آمدورفت کی وجہ سے عام طور پر لوگ "جماعت" سے واقف ہیں۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ یہاں تبلیغ کا کتنا زیادہ کام ہوا ہے۔

جالو کی سے ہم گوبند گڑھ پہنچے۔

گوبند گڑھ کی آبادی تقریباً پانچ ہزار ہے جس میں تقریباً ایک سو مسلمان بستے ہیں۔ مسلمانوں کا ذریعہ معاش زراعت ہے یا بعض معمولی قسم کی تجارتیں۔

یہاں ایک مدرسہ ہے جس کا نام ہے مدرسہ زینت العلوم۔ صدر مدرس مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب ہیں۔ طلبہ کی تعداد ۳۰ اور اساتذہ کی تعداد ۲ ہے۔ یہ مدرسہ ۱۳۶۰ھ سے قائم ہے۔ مٹی کی ناہموار دیواروں کے اوپر ایک اجڑا ہوا سا چھپر پڑا ہوا ہے۔ بس اسی کا نام زینت العلوم ہے۔ دو کوٹھریاں جو قدیم طرز کے ڈربہ سے زیادہ مشابہ ہیں، یہی اس مدرسہ کا گودام، مطبخ، اساتذہ اور طالب علموں کی رہائش گاہ سب کچھ ہے۔ ایک طالب علم (۱۳ سال) کو میں نے نمونہ کے طور پر بلایا۔ یہ حافظہ کا طالب علم ہے اور ۱۲ پارے حفظ کر چکا ہے۔ میں نے کہا کہ چند آیتیں پڑھ کر سناؤ۔ بار بار کہنے کے بعد اس نے تبارك الذی شروع کی۔ مگر ایک آیت سے آگے نہ پڑھ سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ طلبہ پر احساس کمتری اتنا زیادہ مسلط ہے کہ کسی اجنبی کے سامنے چند جملے بول بھی نہیں سکتے۔

یہیں آکر احساس ہوتا ہے کہ اقتصادیات کا بہت گہرا تعلق اخلاقیات سے ہے۔ یہ لڑکے اگر فارغ البال گھرانوں سے نکل کر آئے ہوتے اور یہاں ایک اچھی قائم شدہ درسگاہ ان کی تعلیم کے لئے موجود ہوتی تو ان کا حال دوسرا ہوتا۔

یہاں مدرسہ سمیلہ خورد کے ایک مدرس سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بڑے جوش سے یہ بات کہی کہ میوات میں جتنے مدرسے چل رہے ہیں ہر ایک میں صرف پڑھنے کا انتظام ہے "کائی میں بھی لکھنا نا سکھایو جاوے ہے" لوگ پڑھ پڑھ کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ مگر انھیں ایک خط پڑھنا نہیں آتا۔

"آپ بھی تو ایک مدرسہ میں استاد ہیں" میں نے کہا۔ "پھر کیا آپ کے مدرسہ میں لکھنا سکھایا جاتا ہے۔"

"نہیں" انھوں نے فوراً کہا "میں خود لکھنا نہیں جانتا، پھر بچوں کو کیا سکھاؤں"

"پھر آپ یہ کیجئے کہ سب سے پہلے خود اس پر عمل کیجئے" میں نے کہا "آپ خود لکھنا سیکھئے اور پھر اپنے مدرسہ میں لکھائی کا کام شروع کر دیجئے۔"

اس کے جواب میں انھوں نے اپنی جیب سے ڈائری نکالی اور دکھایا کہ انھوں نے یہ جدوجہد شروع کر دی ہے۔ ان کی ڈائری میں پنسل سے مختلف قسم کے جملے لکھے ہوئے تھے۔ ۳ رجون کے صفحے پر درج تھا:

"اس وقت رسیملہ خرد میں حاضری ہوں"

یہ یہاں کے ایک مدرسہ کے استاد کی تحریری لیاقت تھی۔

اس کے علاوہ یہاں کے مدارس میں بلکہ تمام ہندستان کے ابتدائی اسلامی مدارس میں ایک اصلاح کی شدید ضرورت ہے۔ ان مدارس میں عام طور پر قرآن (حافظہ و ناظرہ) اردو اور دینیات پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ضروری ہے کہ ہندی اور حساب وغیرہ کو بھی اس حد تک داخل نصاب کر لیا جائے کہ ان مدارس سے فارغ ہو کر طالب علم کا داخلہ بآسانی اسکول کے ساتویں آٹھویں درجہ میں ہو سکے۔ ہم اپنی نئی نسل کو اسکولوں میں جانے سے نہیں روک سکتے۔ اس لئے ہمیں کم از کم یہ کرنا چاہئے کہ ان کو ابتدائی دینی تعلیم سے مسلح کر کے اسکول کی دنیا میں پہنچائیں۔

گوبندگڑھ میں نماز جمعہ کے وقت مسجد میں کافی مجمع ہو گیا تھا، مجھ سے تقریر کی فرمائش کی گئی۔ میں نے دو باتوں کی طرف توجہ دلائی۔ ایک ایمان کی حقیقت، دوسرے تعلیم کی اہمیت۔

حدیث ذاق طعم الایمان من رضی باللہ...الخ کو یاد دلاتے ہوئے میں نے کہا کہ ایمان ایک مزہ، ایک کیفیت ہے اور حقیقی معنوں میں صاحب ایمان وہی ہے جس کے لئے وہ مزہ اور لذت کی چیز بن جائے۔ میں نے کہا کہ یہ عمل کا ابتدائی درجہ ہے کہ "ایک کام کے لئے حکم دیا جائے اور آپ اسے کر دیں۔ مگر اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آپ عمل میں لطف و لذت محسوس کرنے لگیں۔ اگر آپ کا حال یہ ہو کہ جب اسلام کسی عمل کا حکم دے تو وہاں خاندانی طریقہ آپ کے لئے رکاوٹ بن جائے۔ آپ کی عادت آپ کو باز رکھے۔ کسی فائدہ کا خیال آپ کو اس سے روک دے، رسم و رواج کی بنا پر آپ اس کو اختیار نہ کر سکیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عمل کا پہلا درجہ بھی آپ کو حاصل نہیں ہوا۔ جب کہ اعلیٰ ایمانی درجہ تو یہ ہے کہ آپ ذوق اور

سرور کے تحت اس کی طرف دوڑ پڑیں۔

اس کے بعد میں نے کہا کہ دوسری چیز جس کی طرف میں آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ تعلیم کا مسئلہ ہے میں نے کہا کہ میں آپ کی بستی میں پہلی بار آیا ہوں۔ یہاں مجھے آپ کے اس مدرسہ میں ٹھرایا گیا جو اسی مسجد کے پڑوس میں واقع ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ مدرسہ ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ ایک بڑے مفکر کا قول ہے۔ "کسی قوم کے مستقبل کو دیکھنا ہو تو اس کی تعلیم گاہ کو دیکھو" اس اعتبار سے جب میں اس جھونپڑے پر نظر ڈالتا ہوں جو یہاں آپ نے مدرسہ کے نام سے قائم کر رکھا ہے تو مجھے آپ کے مستقبل کے بارے میں بہت مایوسی ہوتی ہے۔

میں نے کہا کہ مدرسہ میں آپ کی وہ نئی نسل تیار کی جاتی ہے جو آپ کے مستقبل کی تعمیر کرنے والی ہے اب غور کیجئے کہ جو نوجوان ان جھونپڑوں میں سسک رہے ہیں وہ یہاں سے کیا سبق لے کر جائیں گے اور قوم کے اندر کیا کام کریں گے۔

شام کو میں گوبند گڑھ سے نکلا تو باہر ایک شاندار پختہ عمارت کھڑی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ یہاں کا ہائر سیکنڈری اسکول ہے۔ اس میں ۱۲ سو طالب علم تعلیم پا رہے ہیں اور تقریباً ۳ درجن اساتذہ کام کر رہے ہیں۔ گوبند گڑھ میں اس کے علاوہ دو لڑکیوں کے اسکول، ایک مڈل اسکول اور متعدد پرائمری اسکول ہیں۔ ایک طرف قصبہ کا اسلامی مدرسہ ہے جس کو صرف جھونپڑے میں جگہ ملی ہے۔ دوسری طرف زمانہ کی تعلیم کے ادارے ہیں جو عالی شان عمارتوں میں قائم ہیں۔ یہ نسبت جو دو طرز تعلیم کے در و دیوار میں نظر آتی ہے یہی اس علاقہ کی دو قوموں میں موجود ہے۔ مسلمان یہاں دوسروں سے اتنا ہی پیچھے ہیں جتنا ہائر سیکنڈری اسکول کی پرشوکت عمارت کے مقابلہ میں ان کا وہ مدرسہ جس نے ایک معمولی جھونپڑی میں پناہ لے رکھی ہے۔

گوبند گڑھ میں چار مسجدیں تھیں جو سب کی سب ۱۹۴۷ء میں مسمار کر دی گئیں۔ تین مسجدیں اب بھی اس حالت میں ہیں کہ ان کی ٹوٹی ہوئی دیواریں اپنے چاروں طرف پتھر کے ڈھیر لئے ہوئے پڑی ہیں۔ البتہ بستی کے کنارے کی ایک مسجد کو از سر نو تعمیر کر لیا گیا ہے۔ یہ نو تعمیر مسجد کافی شاندار ہے اس کو دیکھ کر خیال آیا کہ مسلمانوں نے جس طرح پرانے کھنڈر پر یہ نئی مسجد کھڑی کر لی ہے، کاش اسی طرح ان کے اندر اپنی پوری لٹی ہوئی زندگی کو از سر نو تعمیر کرنے کا ذہن پیدا ہو سکے۔

گوبند گڑھ کی مسجد میں نماز جمعہ کے بعد مشہور تبلیغی بزرگ میاں جی موسیٰ کی تقریر ہوئی جو

مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ابتدائی ساتھیوں میں ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ میو قوم کی حالت پہلے یہ تھی کہ اس کو سب لنگور کہتے تھے۔ اس کے بعد ان میں تبلیغ پھیلی اور انھوں نے اس کو بڑھ بڑھ کر قبول کیا۔ تبلیغ کی برکت سے ان کا یہ عالم ہوا کہ لوگ کہنے لگے کہ موجودہ زمانہ میں صحابہ کو دیکھنا ہو تو میو قوم کو دیکھو۔ آج دنیا بھر کے لوگ میوؤں کو دیکھنے کے لئے یہاں آتے ہیں۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ دین سے بڑائی آتی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ میو قوم دنیا کو آگے بڑھا کر اب خود پیچھے ہٹ رہی ہے حالانکہ اب تو اس کی محنتوں کے پھل کھانے کا وقت آیا تھا۔

سفر کے آخری مرحلہ میں، میں نے ایک شب "نصیر باس" میں گذاری۔ رات کے آخری حصہ میں اٹھ کر بستی کی نئی تعمیر شدہ مسجد میں گیا تو وہاں دیکھا کہ کئی لوگ فجر سے پہلے تہجد پڑھنے میں مشغول ہیں۔ یہ منظر میوات میں عام طور پر نظر آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میوات میں کسی بھی علاقہ کے مقابلہ میں ایسے لوگ زیادہ ملیں گے جو روزانہ تہجد کی نماز ادا کرتے ہیں۔ اکثر مساجد میں فجر سے پہلے آبادی ہو جاتی ہے۔

گوبند گڑھ سے ہم بیل گاڑی پر روانہ ہوئے جس کو یہاں کی مقامی زبان میں "چھپیری" کہتے ہیں۔ لکڑی کا ایک عجیب الخلقت ڈھانچہ دو عجیب الخلقت پہیوں کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ آگے دو بیل اس کو لئے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ اسی کا نام یہاں کی زبان میں چھپیری گاڑی ہے۔ اس کے اوپر ہم اس طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے کوئی لکڑی کے اونٹ پر سوار ہو۔ یہ گاڑی غالباً اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود میو قوم۔ جس طرح میو قوم میں زمانہ کے فرق سے کوئی تبدیلی نہیں آئی اسی طرح یہ گاڑی بھی زمانہ کی تمام تبدیلیوں سے بالکل بے نیاز ہے۔ یہ گاڑی اپنے سواروں کو لئے ہوئے بدستور ان خام راستوں پر رینگ رہی ہے جو گرد کی کثرت سے "خشک دلدل" کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ ان کے سر پر کبھی کبھی گھڑگھڑاتا ہوا ہوائی جہاز تیزی سے نئے دور کا پیغام دیتا ہوا گزر جاتا ہے۔ مگر وہ اس کو اس طرح دیکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں جیسے کوئی بچہ اڑتی ہوئی چڑیا پر ایک نظر ڈالے اور پھر اپنے کھیل کود میں مشغول ہو جائے۔

الگھانی سے چلتے ہوئے راستہ میں ہم سرسوں کے کھیت سے گزرے۔ غیر معمولی طور پر بڑے بڑے پتوں اور درجنوں شاخوں کے ساتھ پھیلے ہوئے درخت میری توجہ اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ میں ایک کھیت میں گھس گیا۔ ایک درخت کو ناپا تو وہ میرے سر سے بھی اوپر تک پہنچ رہا تھا۔ جب کہ ابھی وہ بڑھ رہا ہے اور غالباً ایک بالشت اور اوپر جائے گا۔

میں نے دیکھا کہ اس کی زمین جتی ہوئی بالکل خشک حالت میں پڑی ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہاں سرسوں کے کھیت میں پانی دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کھاد وغیرہ بھی نہیں دی جاتی۔ زمین اس کے لئے اتنی موزوں ہے کہ کھاد اور پانی کے بغیر نہایت شاندار فصل ہو جاتی ہے۔

اس علاقہ میں ابھی تک سڑک اور بجلی نہیں پہنچی ہے۔

یہ سفر میں نے جس بیل گاڑی پر طے کیا وہ اشرف خاں پہلوان کی تھی۔ "کیا یہ گاڑی کرایہ پر چلاتے ہو۔" میں نے اس سے گفتگو کرتے ہوئے کہا۔ "جی نہیں" اس نے ایسے انداز سے جواب دیا جیسے میں نے اس پر کوئی عیب لگا دیا ہو۔ یہ میو قوم کی آن کے خلاف ہے کہ وہ گاڑی کرایہ پر چلائے (اگرچہ اس قسم کی آن کی چیزیں اب حالات کے دباؤ کے تحت ختم ہو رہی ہیں)

اشرف خاں نے بتایا کہ اس کی پہلی بیوی عرصہ ہوا مر گئی۔ اس نے دوسری شادی کی جس میں ساڑھے چھ ہزار روپے خرچ ہو گئے۔ شادی دور انجان مقام پر ہوئی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ اچھے لوگ نہیں تھے۔ میں نے کہا یہ تو آپ لوگوں نے بلاوجہ کی مصیبت اپنے سر لے رکھی ہے۔ قصہ یہ ہے کہ میوؤں کی پوری قوم ۱۲ پال (قبیلہ) میں تقسیم ہے۔ ہر پال مختلف گوتوں میں بٹی ہوئی ہے۔ مجموعی طور پر ۱۲ پال کے ۵۲ گوت ہوتے ہیں۔ یہاں کے آبائی رسم ورواج کے مطابق کوئی شخص نہ اپنے گوت کے اندر شادی کرے گا اور نہ پال کے اندر۔ وہ بہرحال اپنی گوت اور پال کے باہر ہی رشتہ کر سکتا ہے۔ اس جاہلانہ رسم نے میوؤں کو بے شمار مصائب میں مبتلا کر رکھا ہے، اسی کی وجہ سے ان کو دور دور شادیاں کرنی پڑتی ہیں کیونکہ قریب کے رشتے ان کے رسمی عقیدہ کے مطابق اسی طرح حرام ہوتے ہیں جس طرح شرعی محرمات۔

راستہ میں شام کو ۴ بجے ہم تھوڑی دیر کے لئے الگھانی (ضلع بھرت پور) اترے۔ یہاں مٹی کی دیواروں کا ایک چھوٹا سا 'مکان' ہے جو چھپر کے بوجھ سے بھی خالی ہو چکا ہے۔ اس کی کالی دیواریں بتا رہی ہیں کہ اس کا چھپر آگ کی نذر ہو چکا ہے۔ پچھلے اکتوبر میں کسی طالب علم کی غلطی سے آتش زدگی کا یہ واقعہ پیش آیا جس میں نہ صرف اس کی چھپر کی چھت بلکہ سارا اثاثہ بھی جل گیا۔ اور اثاثہ ہی کیا تھا، کتابیں، رحل معمولی بستر، ٹاٹ اور لکڑی کے چند ٹوٹے پھوٹے بکس جھلسی ہوئی ننگی دیواروں کے اوپر اب بھی لکھا ہوا ہے:

مدرسہ اسلامیہ زینت العلوم۔ الگھانی۔

اس مدرسہ کے مہتمم منشی مہتاب خاں ہیں۔ "سر سے کھر تک مبلغ ہوں" جوش میں آکر انھوں نے کہا۔ وہ مولانا الیاس صاحب کی تحریک سے متاثر ہوئے اور دس سال تک ان کے ساتھ کام کیا۔ اس کے بعد ۲۲ برس تک مولانا یوسف صاحب کے ساتھ کام کرتے رہے۔ اب بھی وہ تبلیغ کا کام کرتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ انھوں نے دینی تعلیم کی اہمیت کے پیش نظر ایک مدرسہ پچھلے بیس سال سے قائم کر رکھا ہے، مگر ۲۰ برس بعد بھی اس کی کس مپرسی کا عالم یہ ہے کہ چھپر کے سوا کوئی سایہ نہیں، اور اب تو حالات نے اس کو اس سے بھی بے نیاز کر دیا ہے، اور اس وقت تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ آسمان کے سایہ کے نیچے بیٹھے ہوئے ہیں۔ پہلے یہاں تقریباً ایک سو طالب علم قرآن، اردو اور فارسی پڑھتے تھے۔ اب تعداد کم ہو گئی ہے۔ دو استاد ہیں۔ ایک اردو وغیرہ کے لئے دوسرے ایک نابینا قاری ہیں جو حفظ اور تجوید پڑھاتے ہیں

کس قدر عجیب بات ہے۔ دنیوی تعلیم کے لئے عالیشان عمارتیں کھڑی ہیں اور اسلام کی دینی تعلیم کے لئے جھونپڑے بھی میسر نہیں۔ اور یہ اس علاقہ کا حال ہے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔

۲ جنوری کی شام کو ۵ ½ بجے جب کہ سرخ آفتاب ہماری پشت کی جانب افق کے نیچے جا رہا تھا ہم کیماسا پہنچے۔ یہ مولانا مفتی جمال الدین صاحب کا وطن ہے۔ مولانا اس سے پہلے الور کی جمعیۃ علماء کے صدر اور اس کے بعد وہاں کے سکریٹری رہ چکے ہیں۔ اس علاقہ میں ۱۹۴۷ء کے فسادات کے بعد مسلمانوں کی بحالی کا جو کام ہوا ہے اس میں مولانا محمد ابراہیم صاحب کے رفیق کار رہے ہیں۔

مولانا جمال الدین صاحب، جو اس علاقہ میں "مفتی صاحب" کے نام سے مشہور ہیں ہفت روزہ الجمعیۃ کے بہت قدرداں ہیں، "مجھے پڑھنے کے لئے اخبار بہت مل سکتا ہے" انھوں نے کہا۔ "مگر میں خود اپنا اخبار خریدتا ہوں، میں اس کو اخبار کی ناقدری سمجھتا ہوں کہ کسی سے مانگ کر پڑھ لیا جائے اور خود خریدا نہ جائے۔" ان کے پاس ہفت روزہ الجمعیۃ کا آغاز سے لے کر اب تک مکمل فائل موجود ہے۔

ان کا ساتھ سفر کے بیشتر حصہ میں رہا، اور بہت سی دلچسپ اور مفید باتیں ان کی زبان سے سننے کو ملیں۔ انھوں نے بتایا کہ عطاء اللہ شاہ بخاری اپنی تقریروں میں اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

ہوا مخالف و گل بے وفا و لالہ دو رنگ

دریں چمن بہ چہ امید آشیاں بندم

انور صابری کا ایک شعر انھوں نے سنایا جو انھوں نے عطاء اللہ شاہ بخاری کے بارے میں لکھا تھا۔

تقریر بخاری کا انور مفہوم میں اتنا سمجھا ہوں
جینے کی تمنا سے پہلے مرنے کی تمنا کون کرے

فارسی شعر کا مطلب یہ ہے کہ جب تک انگریز ہندستان پر قابض ہے یہاں وہ حالات پیدا نہیں ہو سکتے جس میں آشیانہ بنایا جائے۔ دوسرے شعر کا مطلب یہ ہے کہ انگریز کے مقابلہ میں جو لڑائی جاری ہے وہ بظاہر موت اور آزمائش کی راہ ہے۔ مگر اسی میں قومی زندگی کا راز چھپا ہوا ہے!

ان اشعار میں اپنے ماضی اور حال کو پڑھتے ہوئے ہم کیماسا کے حدود میں داخل ہوئے۔ یہاں میرے استقبال کے لئے میوؤں کے وہ چہرے تھے جن کو آزاد ہندستان نے صرف مایوسی اور نامرادی کا تحفہ دیا ہے۔ اس علاقہ میں خاص طور پر الور اور بھرت پور کے اضلاع میں آپ گھومیں پھریں تو آپ کو بہت سے ایسے میو ملیں گے جو بتائیں گے کہ ان کے مکانات ان سے چھن گئے، ان کی زمینوں پر دوسرے قابض ہیں، اپنے بنائے ہوئے کنوؤں سے وہ آبپاشی نہیں کر سکتے۔

۱۹۴۷ء کے ہنگامہ کے بعد اس علاقہ کے دوسرے مقامات کی طرح یہ گاؤں بھی مسلمانوں سے خالی ہو گیا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ برس باہر رہنے کے بعد یہ لوگ جمعیۃ علماء کی کوششوں سے اپنے وطن میں واپس ہوئے۔ مگر اس طرح کہ اب بھی وہ اپنے وطن میں بے وطن بنے ہوئے ہیں۔ یہ کیفیت زیادہ تر "ریاست" کے علاقہ میں ہوئی ہے۔ "انگریز کا علاقہ" نسبتاً مسلمانوں کے لئے محفوظ رہا!

۳ر جنوری کو میں کیماسا سے باہر نکلا تو گاؤں کے شمال میں ایک بڑا سا کنواں نظر آیا، جس پر کچھ "شرنارتھی" کام کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ اس کا نام "گوجلی" ہے۔ اس سے ملحق ۱۴ بیگھ چاہی زمین تھی جو سب کی سب ان میوؤں کی تھی جن کا ایک فرد بھی پاکستان نہیں گیا۔ "اس کنوئیں کی تعمیر جدید میں، میں نے خود اپنے سر پر پتھر ڈھوئے تھے۔" مولانا جمال الدین صاحب نے کہا۔ مگر یہ کنواں آج اس کے گرد کی ۱۰½ بیگھ زمین کے ساتھ شرنارتھیوں کو دے دیا گیا ہے اور اصل مالکوں کے حصے میں صرف ۳½ بیگھ زمین آئی ہے۔ نئے مالکوں کا حال یہ ہے کہ وہ کنوؤں سے دوسروں کو قطعاً پانی لینے نہیں دیتے۔ اگر میو ان سے اپنے کھیتوں کی آب پاشی کے لئے پانی لینا چاہتے ہیں تو وہ لڑنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

یہاں زمین کی تین بڑی قسمیں ہیں — چاہی زمین، نہری زمین، بارانی زمین۔ ایک بیگھ چاہی زمین ۳ بیگھ بارانی زمین کے برابر سمجھی جاتی ہے — مولانا جمال الدین کے بڑے بھائی عمر خاں نے

بتایا کہ اس ۲ ۱/۲ بیگھ چاہی زمین کے بدلے ہم سے ۱۰ ۱/۲ بیگھ بارانی زمین دوسری جگہ لے لی گئی ہے۔ مگر خود اپنے بنائے ہوئے کنویں سے چند قدم کے فاصلے پر ان کے کھیت ہیں اور وہ اس میں کنوئیں سے پانی نہیں لے جا سکتے۔ "دونوں جگہ ٹوٹو کا ٹوٹو۔ پھر بھی ۱۰ ۱/۲ بیگھ زمین کٹ گیو" عمر خاں نے مایوس کن لہجہ میں کہا۔ ان کی ساری زمین پہلے صرف اپنے گاؤں میں تھی، اب ۷۰ بیگھ کے بجائے صرف ۴۰ بیگھ زمین ملی ہے اور وہ بھی تین مختلف دیہاتوں میں۔

اسی کے قریب میں نے ایک اور کنواں دیکھا۔ اس کا نام مجھے "جوگین کنواں" بتایا گیا۔ یہ گاؤں کے شمال مغرب میں بستی کے بالکل قریب واقع ہے۔ یہ کنواں اور اس سے ملحق سات بیگھ زمین میو زمینداروں کی طرف سے مسلمان "جوگیوں" کو معافی میں دی گئی تھی، آج کنواں سمیت یہ پوری زمین "دوسروں" کے قبضہ میں ہے۔ ان کے اصل مالکوں کا پورا خاندان یہیں موجود ہے۔ مگر ان کو ایک کوڑھ زمین نہیں ملی"

میں نے ایک اور کنواں دیکھا جو گاؤں کے مشرقی جانب واقع ہے۔ اس کا نام "نچلی کنواں" ہے۔ چودہ بیگھ بہترین زمین اس کی سیرابی کے حلقہ میں ہے۔ یہ سب جس میو خاندان کی تھی اس کا ایک ایک فرد اب بھی یہاں موجود ہے۔ ان میں کا کوئی ایک شخص بھی پاکستان نہیں گیا۔ مگر اس قیمتی زمین کا ۹ بیگھ ٹکڑا مع کنویں کے شرنارتھیوں کو دے دیا گیا اور صرف ۵ بیگھ زمین میو خاندان کو ملی۔ پرانے مالکوں نے ۱/۲ حصہ پر قناعت کر کے چاہا کم از کم کنویں سے انھیں آب پاشی کا موقع حاصل رہے۔ مگر نئے مالک زبردست مزاحم ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ میو خاندان کا پانچ بیگھ کا پلاٹ بالکل کنویں کی دیوار سے ملا ہوا ہے، مگر انھیں خود اپنے بنائے ہوئے کنویں سے آب پاشی کے لئے پانی لینے کی اجازت نہیں۔ یہی حال اس گاؤں میں آب پاشی کے تمام کنوؤں کا ہوا ہے جن کی مجموعی تعداد نو ہے۔

"ہم کو منع کریں، فوج داری کریں، جھگڑا کرن کو تیار ہوں" عمر خاں نے کہا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ مقامی طور پر ان کی کوششیں کامیاب نہیں ہو رہی ہیں تو انھوں نے عدالت کی طرف رجوع کیا، وہ پہلے تحصیل میں مقدمہ لے گئے۔ پھر کلکٹریٹ میں پہنچے۔ اس کے بعد اجمیر میں ریونیو بورڈ میں اپیل کی۔ مگر یہ عدالتی جد و جہد بھی اس طرح ناکام ہوئی کہ کنویں سے محرومی کے ساتھ اپنی گاڑھی کمائی کے مزید دس ہزار روپیہ وہ انصاف کی تلاش میں کھو چکے تھے!

تحصیل گوبند گڑھ میں ۴۶ گاؤں ہیں جن میں ۸۵ گاؤں میوؤں کے ہیں" مگر سب میں یہی تکلیف ہے، عمر خاں نے دردمند لہجہ میں کہا، مولانا جمال الدین صاحب نے بتایا کہ یہ حالت صرف تحصیل گوبند گڑھ کی نہیں بلکہ الور اور بھرت پور کے اضلاع میں عام طور پر یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ بعض لوگ جو سو سو بیگھہ زمین جوتتے تھے، آج ان کو دو بیگھہ کھیت بھی حاصل نہیں" وہ میری تیری طرح محنت کر رہے ہیں" عمر خان نے کہا۔

الور اور بھرت پور میں تخمیناً ۱۰ ہزار غیر میو مسلمانوں کے خاندان بستے ہیں۔ یہ مسلمان اگرچہ سب کے سب یہیں کے ہیں اور ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ کے بعد دوبارہ آکر اپنے مکانات میں بس گئے ہیں۔ مگر ان کو سرے سے نہ زمین ملی نہ مکان "کچھ بھی نہیں جی" عمر خان نے کہا۔ "وہ تو مرے تو دفن کا جگہ بھی نہیں"۔

یہ مناظر چوں کہ پہلی بار میرے سامنے آئے تھے اس لئے ان کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوا "بھلا کیسے برداشت کرتے ہوں گے یہ لوگ" میری زبان سے شدت تاثر سے نکلا۔

"اجی سوکھ گئی دنیا خون بھی نہیں" امید خاں (الگھانی) نے کہا۔ انھوں نے قریب کے ایک گاؤں ایڈ بیڈ مان پور کا حال بتایا۔ وہاں میوؤں کی ۵۰۰ بیگھہ زمین تھی۔ یہ سارے خاندان آج بھی یہاں موجود ہیں۔ مگر ان کی زمینیں غلط طور پر شرنارتھیوں کو الاٹ کر دی گئی ہیں" میری بھی اس میں دس بیگھہ زمین تھی" امید خاں نے کہا" اب یہ لوگ مزدوری کرتا پھریں، زمین نا ہے تو کیا کریں۔" انھوں نے کہا۔

کیماسا میں عشاء کے وقت مسجد میں بہت سے لوگ جمع ہوگئے تھے۔ مجھ سے تقریر کی فرمائش کی گئی۔ میں نے نماز کے بارے میں کچھ باتیں عرض کیں۔

میں نے کہا۔ میں اپنی طرف سے اور آپ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے ہم کو نمازی بنایا۔ مگر صرف نمازی بن جانا کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ ہماری نماز وہ نماز ہے یا نہیں جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ کیوں کہ قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ نماز پڑھتے رہتے ہیں مگر ان کی نماز سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

میں نے کہا کہ نماز دو قسم کی ہوتی ہے: ایک وہ جس کو قرآن کے الفاظ میں "صلاۃ سہو" (غفلت کی نماز) کہہ سکتے ہیں (فویل للمصلین الذین ھم عن صلوتھم ساھون) اس نماز سے آدمی کو کچھ نہیں ملتا، بلکہ جیسا کہ ارشاد ہوا ہے، ایسے نمازیوں کے لئے خدا کے یہاں خرابی اور ویل ہے۔

دوسری نماز وہ ہے جس کو قرآن میں صلاۃ خشوع (ڈر اور عاجزی کی نماز) کہا گیا ہے۔ یہی نماز اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ میں نے کہا کہ قرآن میں آپ کو ایسی کسوٹی مل سکتی ہے جس سے آپ اندازہ کر سکیں کہ صلاۃ خشوع کیسی نماز ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی رہنمائی ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتابا موقوتا سے ہوتی ہے۔ یعنی وہ نماز وقت کی پوری پابندی کے ساتھ ادا کی جاتی ہے جس طرح ٹرین اور کچہری کے وقت کا خیال ہوتا ہے اسی طرح اس نماز کا بھی خیال لگا رہتا ہے۔ دوسری چیز کا ذکر سورۂ عنکبوت میں ہے ان الصلاۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر یعنی یہ نماز آدمی کو فحش اور بری باتوں سے روکتی ہے۔ تیسری چیز وہ ہے جس کو "واسجد واقترب" کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی نماز اس کے لئے خدا سے قریب ہونے کا ذریعہ بن جائے۔ یہ نماز اور عبادت کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔ اس وقت جب آدمی سجدہ کرتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اس نے اپنے رب کے قدموں میں سر رکھ دیا ہے اس کی روح خدا سے انتہائی قریب ہو جاتی ہے۔ زمین پر پیشانی رکھنا اپنے مولا سے لپٹنے کے ہم معنی ہو جاتا ہے۔

پانچواں سفر-۲

یہ سفر ہم نے دسمبر ۱۹۶۹ کی آخری تاریخ کو شروع کیا تھا۔ اب ہم جنوری ۱۹۷۰ میں داخل ہو چکے ہیں۔ جب ہم اس سفر کے لئے چلے تھے تو ہم "پچھلے سال" میں تھے، اب ہم "اگلے سال" میں ہیں۔

کیلنڈر میں زمانہ لازماً آگے کی طرف سفر کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ حال سے مستقبل کی طرف جاتا ہے۔ مگر انسانی زندگی میں اس قسم کا لزوم ضروری نہیں۔ انسان اگر بیدار ہو تو اس کا سفر بھی کیلنڈر کی طرح آگے کی طرف جائے گا۔ مگر جو لوگ غفلت میں پڑ جائیں وہ زمانہ سے پچھڑ جاتے ہیں۔ عین اس وقت جب کہ ان کے گرد و پیش زمانہ حال سے مستقبل کی طرف جا رہا ہوتا ہے، وہ یا تو حال میں پڑے رہتے ہیں یا حال سے ماضی کی طرف جانے لگتے ہیں۔

۳ جنوری ۱۹۷۰ کو ۱۱ بجے ہم اشرف خاں پہلوان کی گاڑی میں کیما سا سے روانہ ہوئے۔ درمیان میں کچھ دور پیدل چل کر دو پہر کو سیکری پہنچے۔

سیکری بازار سے گزرتے ہوئے ایک مقام پر میں نے دیکھا کہ ایک سنار کی دوکان پر ایک میو جوڑا اپنے روایتی لباس میں بیٹھا ہوا ہے۔ "میونی" اپنے ہاتھ سنار کے لڑکے کی طرف بڑھائے ہوئے ہے اور سنار اس کے ہاتھ کے چاندی کے کڑے اوزار کے ذریعہ کاٹ کر نکال رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ دوبارہ گلا کر بنوانے یا رہن رکھنے کے لئے یہ عمل کیا جاتا ہے۔ اس معاملہ میں جس کا ایک فریق جاہل اور دوسرا انتہائی ہوشیار ہوتا ہے، نہ صرف تول اور حساب بلکہ من مانی شرائط کا تقرر بھی ہمیشہ فریق ہوشیار کے قبضہ میں ہوتا ہے، چنانچہ ایسے ہر عمل میں نقصان میو کا ہوتا ہے۔ اور فائدہ سنار کا۔

قصبہ سیکری کے بازار میں تمام دکانیں غیر مسلموں کی تھیں البتہ میو اور میونی کثرت سے خریداری کرتے ہوئے نظر آئے۔

سیکری قصبہ کو پار کر کے میں اس کے دوسری طرف پہنچا تو وہاں ایک نوجوان طالب علم سائیکل لئے ہوئے میرا انتظار کر رہا تھا۔ یہاں سے میں اس کے ساتھ بیٹھ کر روانہ ہوا۔ پندرہ سالہ مبین احمد

مجھے میل کھیڑا کے مدرسہ کی طرف لئے جا رہا تھا۔ وہ جس شان اور اعتماد کے ساتھ سائیکل چلا رہا تھا اس کو دیکھ کر میری عجیب کیفیت ہوئی۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا "کیسے قیمتی ہیں یہ نوجوان۔ مگر ان کی حالت یہ ہے کہ وہ نہ حال سے باخبر ہیں نہ مستقبل سے۔ وہ چلے جا رہے ہیں مگر انھیں نہیں معلوم کہ وہ کہاں پہنچیں گے۔ قدرت نے انھیں سب کچھ دیا تھا مگر انھوں نے اپنی کسی چیز کو استعمال نہیں کیا"

میل کھیڑا کے مدرسہ میں میں نے ایک گھنٹہ گزارا یہاں مولانا محمد قاسم صاحب سے ملاقات ہوئی جو اس مدرسہ کے مہتمم ہیں۔ میرا خیال ہے کہ موصوف کے اندر اہتمام اور انتظام کی اچھی صلاحیت ہے۔ انشاء اللہ ان کے زیر اہتمام مدرسہ ترقی کرے گا اگرچہ ابھی وہ دوسرے مدارس کی طرح خس پوش ہی نظر آتا ہے۔

۳ جنوری کی سہ پہر کو بس نے ہمیں پہاڑی کے مدرسہ کے سامنے اتارا۔ یہاں کی مسجد میں ہم نے ظہر کی نماز ادا کی۔ ایک چھوٹی سی معمولی عمارت جو اس مدرسہ کی مسجد بھی ہے اور دوسری ضروریات کے لئے اس کی آماجگاہ بھی۔ اپنے جائے وقوع کے اعتبار سے بہترین جگہ پر واقع ہے۔ اس کے مشرق میں "پہاڑی" نام کا قصبہ ہے، شمال سے سڑک گزر رہی ہے۔ اور مغرب میں دور تک پھیلے ہوئے کھیت پہاڑوں کی دیواروں پر جا کر ختم ہوتے ہیں جن کی آسمان سے ملی ہوئی چوٹیاں عجیب آفاقی منظر پیش کر رہی ہیں۔ اس حسین دنیا اور اس مرکزی مقام پر مدرسہ کے نام سے جو چیز قائم ہے وہ ایک درگاہ ہے۔ جس کو کھنڈر سے کچھ ہی زیادہ کہا جا سکتا ہے۔ اگر اس کی زمین اور اس کے جائے وقوع کو پوری طرح استعمال کیا جائے تو یہاں ایک عالی شان مدرسہ ایک بلند و بالا مسجد کے ساتھ نظر آ سکتا ہے جو نہ صرف اسلامی تعلیم کا مرکز ہو بلکہ ایک تفریح گاہ بھی بن جائے۔ مگر ملت کی بے توجہی نے اس کو صرف ایک ایسی پناہ گاہ بنا رکھا ہے جہاں کچھ لوگ دینی تعلیم کا جذبہ رکھ کر اپنا سر چھپائے ہوتے ہیں۔

پہاڑی میں مولوی کمال الدین صاحب ایک سرگرم شخصیت ہیں۔ ان کے معمولی لباس اور سادہ گفتگو کے اندر ایک قیمتی شخصیت چھپی ہوئی ہے۔ سیاست اور تبلیغ دونوں میں طویل مدت صرف کرنے کے باوجود ابھی وہ اس حال میں پڑے ہوئے ہیں جیسے ان کی شخصیت ابھی تک اپنا استعمال نہ پا سکی ہو۔ یہ نہ صرف مولوی کمال الدین بلکہ بیشتر امت مسلمہ کا حال ہے۔ ہمارے وہ قابل قدر لوگ جنھوں نے

ملی خدمت میں عمریں صرف کر دیں آج یہ محسوس کرتے ہیں کہ انھیں کچھ اور بھی کرنا تھا۔ یا کم از کم اب کچھ اور کرنا چاہئے۔ آہ وہ قافلہ جو مستقبل میں اس حال میں پہنچے کہ اسے محسوس ہو کہ اس کا ماضی اس کا ساتھ چھوڑ رہا ہے۔

۲۳ جنوری کو شام کے ۳ بجے ہم بیواں اترے۔ یہاں سے ہمیں سائیکل کے ذریعہ بڈیڈ جانا تھا۔ بیواں میں قصبہ کے باہر ایک قدیم طرز کی نمایاں عمارت نظر آتی ہے۔ مقبرہ کے اونچے گنبد کے ساتھ چھوٹی چھوٹی دو مسجدیں ہیں اور ارد گرد کافی زمین بھی ہے۔ ہم نے چاروں طرف ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر کہیں کوئی کتبہ ایسا نہیں ملا جس سے صاحب قبر اور سن تعمیر کا پتہ چل سکے۔

"جانے کتنی صدیاں گذر گئیں" میرے رفیق سفر مولانا عبدالرحیم نے کہا "کس قدر شاندار عمارت مگر بالکل ویران پڑی ہوئی ہے۔ حالانکہ یہاں مدرسہ بن سکتا ہے، اسلامی مرکز بن سکتا ہے۔۔۔۔"

مولانا عبدالرحیم صاحب کے الفاظ میں بے حد صداقت تھی۔ یہ جگہ سڑک سے متصل ہے بجلی بھی قریب سے مل سکتی ہے اگر ان سہولتوں سے فائدہ اٹھا کر اس زمین اور اس عمارت کو کار آمد بنایا جائے تو یہاں بھی وہی نقشہ ہو سکتا ہے جو میں نے دھولی دوب کی درگاہ میں دیکھا تھا اور جس سے آج وہ لوگ سو روپے روز کما رہے ہیں۔ مگر ہمارا حال یہ ہے کہ جو چیز دوسروں کے قبضہ میں چلی جائے اس پر داویلا مچاتے ہیں اور جو چیز اپنے قبضہ میں ہو اس کو ویران چھوڑے رکھتے ہیں۔

اس طرح کی سیکڑوں قدیم عمارتیں جو آج بھی مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں مگر ان کو کوئی استعمال کرنے والا نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ رات دن کھنڈر ہو رہی ہیں اور ان کی زمینوں کو دوسرے لوگ اپنے قبضہ میں لیتے جا رہے ہیں۔

راستہ میں ہم گھاٹ میکا اور رجہرہ سے گذرے۔ یہ میوؤں کے گاؤں ہیں۔ مٹی کی نیچی دیواریں جو اپنے دوشس ناتواں پر چھپر کا بوجھ سنبھالے ہوئے تھیں، انھیں کا نام یہاں کی اصطلاح میں مکان ہے۔ ان چھپر پوش خام مکانات کے آگے سب سے زیادہ نمایاں جو چیز نظر آتی ہے وہ گھورا اور اپلوں کے ڈھیر ہیں۔ یہی اس علاقہ کی تمام بستیوں کا حال ہے۔ میو گاؤں عام طور پر غلیظ گھروندوں کا دوسرا نام ہوتا ہے۔

اور آگے بڑھے تو ہمارے سامنے ایک طویل بند تھا جو راجستھان کو ہریانہ سے جدا کرتا ہے۔ یہاں سے ہمارا راستہ پہاڑ کے کنارے کنارے بڈیڈ تک جاتا تھا۔ پہاڑ کی سنگی دیوار آسمان کو چھوتی ہوئی مسلسل ہمارے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ ارولی کے یہ پہاڑی سلسلے پورے میوات میں پھیلے ہوئے ہیں اور انھیں کے

دامن میں وہ قوم بسی ہوئی ہے جس کو میوؔ کہتے ہیں۔

مولانا فقیہ الدین صاحب نے بتایا کہ جامع اللغات میں میوؔ کے معنے لکھے ہوئے ہیں۔

ایک بہادر اور جاہل قوم

یہ اس قوم کی بے حد بامعنیٰ تعریف ہے، کسی قوم کا بہادر ہونا اس قوم کو تمام دنیوی و اخروی سعادتوں کو حاصل کرنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ مگر یہ قوم صرف اس لئے اپنے عظیم امکانات کو حاصل کرنے سے محروم ہے کہ وہ جاہل رہ گئی۔ اسے نہ اپنا شعور ہو سکا اور نہ زمانے کا۔ اگر یہ قوم علم کی حامل ہو جائے تو اس کی بہادری کے ساتھ اس کا علم مل کر اس کو دنیا کی ایک انتہائی جاندار قوم بنا سکتا ہے۔ یہ ایک پہاڑ ہے جس کو اپنی بلندی اور صلابت کا احساس نہیں۔ کاش یہ اپنے آپ کو جان سکے۔ میوؔ قوم کے چاروں طرف کھڑے ہوئے پہاڑ اس کو صدیوں سے دنیا کی قوموں میں ایک کوہ پیکر قوم بننے کا پیغام دے رہے ہیں مگر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ یہ پہاڑ جیسا سبق ابھی تک کوئی نہیں سن سکا اور نہ قوم کے اندر اس کی طرف کوئی توجہ پیدا ہوئی۔

۳؍جنوری کی شام کو ۵ بجے بڈیڈ پہنچا۔ یہ میرے رفیق سفر مولانا عبدالرحیم صاحب کا وطن ہے۔ ان کے والد میاں جی عبدالغفور صاحب سے ملاقات میرے لئے خصوصی طور پر خوشی کا باعث ہوئی۔ موصوف سادگی اور اخلاص کی تصویر ہیں۔ قدیم زمانہ کے بے ریا مسلمانوں کی ایک یادگار ہیں۔ جن کے نمونے اب تلاش کرنے کے باوجود کہیں نہیں ملتے۔

یہاں کی مسجد میں عشاء کی نماز سے پہلے مجھ سے تقریر کی فرمائش کی گئی۔ میں نے کہا کہ میوات میں یہ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ یہاں دینی بیداری پیدا ہوئی ہے۔ لوگوں کے چہروں پر داڑھیاں ہیں، ہاتھ میں تسبیح ہے وہ مسجدوں میں نماز پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ جب میں دیکھتا ہوں کہ یہاں کے بے شمار لوگ سودی قرضوں میں مبتلا ہیں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے ایک ضروری پہلو کی طرف انھوں نے بالکل توجہ نہیں دی ہے۔ اور وہ ہے زمانہ کے لحاظ سے اپنے کو باعزت زندگی کے لئے تیار کرنا۔

میں نے کہا کہ میوؔ لوگ تعلیم کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی جہالت نے دوسری قوموں کو موقع دیا کہ وہ انھیں خوب لوٹیں۔ اسی طرح میوؔ لوگ صرف زمیندارہ کو معاش کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور وہ بھی خالص پرانے طریقہ کے مطابق۔ اب اگر سیلاب آجائے یا قحط پڑ جائے تو وہ بالکل خالی ہاتھ ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آدمی کو صرف غلہ کی ضرورت نہیں ہوتی اسی کے ساتھ اس کو زندگی گذارنے کے لئے

اور بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے ۔ یہ ساری چیزیں دوکان سے حاصل ہوتی ہیں ۔ آپ لوگوں نے دکانداری کو بالکلیہ غیرقوموں کے حوالے کردیا ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ آپ لوگ جانوروں کی طرح محنت کرکے اپنے کھیتوں پر جو پیسہ پیدا کرتے ہیں اس کو چیزوں کی خریداری میں "دوسروں" کی دوکانوں پر الٹ آتے ہیں ۔

میں نے کہا کہ زراعت کے علاوہ دوسرے معاش کے ذریعوں کو چھوڑنے کی وجہ سے آپ سود کی لعنت میں مبتلا ہیں ۔ کیونکہ جب کھیت کی پیداوار آپ کی ضروریات کی کفالت سے جواب دیدیتی ہے تو آپ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہوتا کہ بنئے سے جاکر سودی قرض لیں اور اس طرح اپنی ضرورتیں پوری کریں ۔ حتیٰ کہ مجھے معلوم ہوا کہ آپ لوگ دینی سفروں کے لئے بھی مہاجن سے سودی قرض لیتے ہیں ۔ یہ بے حد دکھ کی بات ہے ۔ آپ اگر زراعت کے علاوہ دوسرے معاشی ذریعوں کو بھی پکڑے رہتے تو آپ کو ایسا کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی ۔

پھر میں نے ان لوگوں کو بڈیڈ کی مسجد کی طرف توجہ دلائی جو گاؤں کی مسجد ہونے کے باوجود اس حال میں نظر آتی ہے کہ مٹی کا فرش اور مٹی کی دیواروں کے اوپر چھپر پڑا ہوا ہے ۔ اس میں نہ کوئی سائبان ہے نہ وضو وغیرہ کا انتظام ۔

میں نے کہا کہ مسجد اسلام کی شوکت کا نشان ہوتی ہے اسی لئے اس کے منارے ہماری عمارتوں سے بلند بنائے جاتے ہیں ۔ آپ لوگوں نے اپنے کو نمازی تو بنالیا مگر اس قابل نہیں بنایا کہ اپنی بستی کی مسجد کو اس طرح تعمیر کرسکیں کہ وہ دیکھنے والوں کے لئے اسلام کی عظمت و بلندی کا نشان نظر آئے ۔ آپ کو جس طرح اس قابل بننا ہے کہ آپ دوسرے پر بار بنے بغیر اور سود وغیرہ کی لعنت میں مبتلا ہوئے بغیر اپنی معاش حاصل کرسکیں اسی طرح آپ کو اس قابل بھی بننا ہے کہ آپ دین کی ان تمام ضرورتوں میں اس کے معاون بن سکیں جو سرمائے کے بغیر پوری نہیں ہوسکتیں ۔ یہ مسجد اپنی خستہ حالی کے ساتھ آپ کی غیرت کے لئے چیلنج ہے اور اس چیلنج سے آپ اسی وقت عہدہ برآ ہوسکتے ہیں جب کہ آپ "زمیندارہ" کے روایتی گھروندہ سے نکلیں ۔

عشاء کی نماز پڑھ کر مسجد کے باہر نکلا تو رات کافی بھیگ چکی تھی ۔ مسجد کی مغربی سمت میں پوری بستی گہری تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی ۔ سر کے اوپر پھیلا ہوا آسمان جگمگاتے ہوئے تاروں کے ساتھ ایسا نظر آرہا تھا جیسے وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس عجیب وغریب دنیا کو دیکھ رہا ہو ۔

صبح ۵ بجے اٹھا تو دوسرا منظر تھا ۔ ۲۵ ویں تاریخ کا چاند مشرق کی سمت سے بلند ہوکر بڈیڈ کی اس

اسم بامسمیٰ بستی کو اپنی ہلکی روشنی کے ساتھ گویا رات کی تاریکی سے نکال رہا تھا۔ گھڑی کی ایک سوئی چھ پر تھی اور دوسری بارہ پر کہ مسجد سے اللہ اکبر، اللہ اکبر کی آواز بلند ہوئی۔ اور یہ خاموش بستی اچانک اذان کی آواز سے گونج اٹھی۔ آدھ گھنٹہ بعد فجر کی نماز ہوئی۔ نماز سے فارغ ہوکر جب ہم مسجد کے باہر نکلے تو چاروں طرف خوب اجالا پھیل چکا تھا۔ عشار کی نماز کے بعد میں نے جس مسجد کے باہر تاریکی ہی تاریکی پائی تھی وہاں فجر کے بعد روشنی ہی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ دل نے کہا "خدایا، تو جو ہر روز تاریکی کو روشنی میں تبدیل کرتا ہے، اس مصیبت زدہ قوم کی تاریکیوں کو بھی اجالے میں تبدیل کردے۔"

بڈیڈ میں میں نے بھیک جی کے مزار کو دیکھا جو تین سو برس پہلے یہاں گزرے تھے۔ تلاش بسیار کے باوجود مقبرہ کی عمارت پر کہیں کوئی کتبہ نہیں ملا۔

مولانا حسن خاں (۳۵ سال) جو میرے ساتھ تھے، انھوں نے بھیک جی کے کچھ اشعار سنائے۔ جن میں سے دو یہ ہیں۔

ہری ہری کو دیکھ کے ہر کو بھول گیا
کتنے باغ جہاں میں بھیک جی لگ سوکھ گیا
دھندے میں دھن او بجے جوں پنکھے میں پون
بن دھندے ائے بھیک جی دھنے دیگا کون

بڈیڈ کا حال سناتے ہوئے یہاں کے بعض لوگوں نے مجھے بتایا کہ ۱۹۶۳ء میں جب یہاں ڈاک خانہ قائم کیا گیا تو اس کی سخت مخالفت کی گئی۔ اسی طرح یہاں گورنمنٹ نے اسپتال قائم کرنے کی منظوری دیدی مگر اس کی سخت مخالفت ہوئی حتیٰ کہ پنچایت میں ریزولیوشن منظور کر کے بھیجا گیا کہ یہاں اسپتال کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ دس سال پہلے بڈیڈ کے مقابلہ میں نسبتاً چھوٹے مقام۔ گوکل پور۔ میں یہ اسپتال قائم کیا گیا جو اب تک وہاں چل رہا ہے۔

یہ باتیں اتنی عجیب تھیں کہ میرے لئے ان کا یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا۔ "وہ آخر کس شکل وصورت کے لوگ ہوں گے جو اس بات کے مخالف ہوں کہ ان کی بستی میں ڈاک خانہ اور ہسپتال قائم کیا جائے۔"

مگر جلد ہی مجھے اس کا جواب مل گیا۔ رات کو میری تقریر کے بعد مولانا عبدالرحیم صاحب نے کچھ گفتگو کی۔

اس میں انھوں نے کہا کہ ہمارے میوز مانہ سے اتنے پیچھے ہیں کہ بستی کے اندر ڈاک خانہ اور ہسپتال قائم کیا جائے تو اس کی بھی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ سن کر ایک بوڑھا شخص بول اٹھا۔

"ہم نے کہا ضرورت پڑی ہے۔ ہمارے کون سا کھط آو اں ہاں۔"

یہ چاہت خاں تھے جو پانچ بار تبلیغ کے تحت باہر جا چکے ہیں (چار بار چلہ اور ایک بار ۴ ۲ دن) دلی، بھوپال، امروہہ میرٹھ ان کا دیکھا ہوا ہے۔ تبلیغ میں میوات کا پورا علاقہ گھوم چکے ہیں۔

"یو پی میں چلّہ دیو، بھوپال میں چلہ دیو۔۔" انھوں نے کہا۔ میں نے پوچھا کہ یو پی میں کن کن مقامات پر آپ گئے۔" میرے تو یاد نا ہیں جی" انھوں نے سادگی کے ساتھ جواب دیا۔

مزید سوالات کے جواب میں انھوں نے کہا "پانچ بیر تبلیغ میں گیا۔ پر سیکھو سا کھو کچھ نا ہیں۔"

اس گفتگو کے کچھ دیر بعد چاہت خاں دوبارہ میری قیام گاہ پر آئے۔

"مولوی صاحب" انھوں نے کہا "اخبار میں نا لکھ دیو کہ کچھ سیکھو سا کھو نا ہیں۔ نہیں تو اثر برو پڑے گو۔ پھر دنیا تبلیغ میں نا جا وے گی۔"

یہ بات چاہت خاں نے اتنی سادگی اور اخلاص سے کہی کہ میں نے سوچا "اگر انھوں نے واقعتہً کچھ نہ سیکھا ہو جب بھی انھوں نے بہت بڑی بات سیکھی ہے اور وہ ان کا وہ جذبۂ اعتراف ہے جو ان کے اس جملہ میں جھلک رہا ہے۔

ان کو جب میرے ساتھی نے میواتی زبان میں بتایا کہ اوپر کے جملے میں نے ان کے بارہ میں لکھے ہیں تو انھوں نے عاجزانہ لہجہ میں کہا،

"اللہ جانے کیسے بکھسے گو ہم تو پورا گنہ گار ہیں۔"

یہاں میں علاء الدین (رنگریز) کے گھر گیا پہاڑ سے متصل ان کا خس پوش مکان بس اس اعتبار سے مکان کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ایک انسان رہتا ہے۔ ورنہ جہاں تک اس کی مکانیت کا سوال ہے اس کو جانور کا کھوہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ انھوں نے جس اخلاص کے ساتھ مجھے روٹی اور چائے پیش کی اس نے مجھے بے حد متأثر کیا۔ میں نے شوق سے ان کے ناشتہ میں شریک ہوتے ہوئے کہا "بڑی لذیذ روٹی ہے۔"

"اجی بجیب کہاں" وہ سادگی اور شرمندگی کے ساتھ بولے۔

میں نے عمر کے بارہ میں دریافت کیا تو ان کا جواب تھا "عمر کا بارہ میں موئے پتو نا ہے۔"

علادین چھیپا بالکل ان پڑھ ہے۔ اس کے پاس زمین بھی نہیں، موٹے کھدر پر، جس کو یہاں کی زبان میں ریزی کہتے ہیں، لحاف کی چھپائی کا کام کرکے گذر بسر کرتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ سال میں صرف ایک مہینہ انھیں چھپائی کا کام ملتا ہے۔ اس مفلسی میں بھی وہ بہت سے میوؤں کے لئے اتنے قیمتی ہیں کہ وہ ان کے برتن تک چرالے جاتے ہیں۔ اپنی تمام بے سرو سامانی کے باوجود علادین کے چہرے پر ایک اطمینان ظاہر ہو رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ بیوی بچوں کے انتقال کر جانے کی وجہ سے اپنی ذات کے سوا اس کے اوپر کوئی خرچ نہیں۔

یہاں چند ہندو بنئے ہیں۔ وہ نہ صرف خوشحال ہیں بلکہ جاہل میوؤں کے مقابلہ میں بہت زیادہ باشعور بھی ہیں۔ ٹھاکر لال بڈیڈ کے واحد شخص ہیں جن کے پاس ٹریکٹر ہے اور جنھوں نے آئل انجن کے ذریعہ اپنی زمین پر آبپاشی کا پمپ لگا رکھا ہے۔ میں ان کے گھر جاکر ان سے ملا۔ دوسرے نسبتاً کم عمر "خوش حال چند" ہیں۔ وہ مجھے سن کر خود ملنے آئے اور میں پھر بازدید کے لئے ان کے گھر گیا۔ انھوں نے اپنے عجیب و غریب واقعات بتائے۔ انھیں خاندانی حالات اچھے نہیں ملے تھے مگر انھوں نے اپنی لیاقت سے بہت ترقی کی۔ بڈیڈ اور اس علاقہ کے بارہ میں انھوں نے کہا ہم تو سمجھتے ہیں کہ آزادی ابھی ہمارے لئے نہیں آئی ہے۔ یہاں نہ سڑک ہے نہ بجلی ہے نہ کوئی سرکاری افسر کبھی یہاں کا حال دیکھنے کے لئے آتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس علاقہ کی سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ یہاں سڑک نکالی جائے۔ ان کے بیان کے مطابق پنگواں اور بیواں کے درمیان سڑک بنادی جائے تو یہ علاقہ بھی بقیہ آزاد ہندوستان سے مل جائے گا (اب یہاں سڑک اور بجلی آچکی ہے، اگرچہ ہندستانی انداز میں)

خوش حال چند کے دو بچے ہیں جن کو وہ تعلیم دلانا چاہتے ہیں "چاہے زائداد بک جائے۔" انھوں نے کہا "مگر یہ بچے جہاں تک پڑھیں گے انھیں پڑھاؤں گا۔" ان کی خواہش ہے کہ اپنے ایک بچے کو الہ آباد انگلش اسکول میں پڑھائیں اور اس کے بعد انگلینڈ بھیج کر اعلیٰ تعلیم مکمل کرائیں۔ مگر بچہ کی ماں اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔

خوش حال چند کے یہاں سے میں واپس ہو رہا تھا کہ میرے ساتھی نے کہا۔ آیئے آپ کی ملاقات یہاں کے سب سے بڑے میو سے کرائیں۔ ہم ایک مکان کے سامنے پہنچے۔ ایک طرف بندھی ہوئی بھینسیں اور بیل غلاظت پھیلانے میں مشغول تھے دوسری طرف ایک بڈھا شخص حقہ پینے میں محو تھا۔ اس کے اوپر اتنا معمولی لباس تھا کہ اس کو دلی کے "جھگی والے" بھی ناخوشی ہی سے پہننا پسند کریں گے۔

یہ کمل خاں تھے جو بڈیڈ میں ایک سو پندرہ ایکڑ زمین کے مالک ہیں۔ انھوں نے میرے بیٹھنے

کے لئے ایک مونڈھا پیش کیا جس پر چڑیوں نے بیٹ کرکے اپنا حق استراحت ثبت کر رکھا تھا۔ کمل خاں کو یہاں کا لکھ پتی زمیندار کہنا چاہئے۔ مگر ان کا حال یہ ہے کہ معمولی مزدوروں کی طرح سارا خاندان کھیت میں جٹا رہتا ہے۔ میں نے کہا ٹھاکر لال کے پاس آپ سے کم صرف ستر ایکڑ زمین ہے اور اس نے ٹیوب ویل لگا رکھا ہے پھر آپ کیوں نہیں لگواتے۔" پانی تو نکلے ہی نا" انھوں نے میوز بان میں جواب دیا۔ میں نے کہا ٹھاکر لال نے تین جگہ بورنگ کرائی آخر وہ کامیاب ہو گئے۔ اسی طرح آپ بھی کیجئے۔ اس میں آپ کو اتنا فائدہ ہوگا کہ اس کا خرچ نفع کے ساتھ تھوڑے دنوں میں نکل آئے گا۔ مگر ان کی سمجھ میں میری بات نہیں آئی۔

کمل خاں کا کنبہ بہت بڑا ہے۔ میں نے کہا لڑکوں اور پوتوں کو تعلیم دلائیے مگر وہ یہی کہتے رہے کہ پڑھ کر کیا ہوگا۔ میں نے کہا ایک ہی لڑکے کو پڑھائی کی طرف لگائیے۔ آپ کو خدا نے اتنا دیا ہے کہ آپ اعلیٰ ترین تعلیم تک ان کا خرچ اٹھا سکتے ہیں۔ مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ ان کے نزدیک لڑکوں کا مصرف بس یہ ہے کہ مزدوروں کی طرح کھیتی میں جتے رہیں۔ پڑھائی ان کے نزدیک کوئی مسئلہ نہیں۔ اسی بستی میں خوش حال چند اپنے لڑکے کو یورپ تک پڑھانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں اور یہیں مسلمان میوؤ کے لئے یہ بات ناقابل فہم ہے کہ وہ اپنے بچے کو مکتب بھیجے تو کس لئے بھیجے۔

چودھری عظمت خاں سرپنچ (نیم کھیڑا) سے ملاقات ہوئی سمجھ دار اور سنجیدہ آدمی ہیں۔ اور کام کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے چودھری طیب حسین خاں ایڈوکیٹ کی بہت تعریف کی۔ طیب حسین پچھلے سال اسی حلقہ سے ہریانہ اسمبلی کے لئے الیکشن لڑے تھے۔ مگر آپس کے اختلافات کی وجہ سے معمولی ووٹوں سے ناکام ہو گئے۔

بڈیڈ کا ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یہاں کی زمین شور ہوتی جا رہی ہے۔ مولانا حسن خاں نے بتایا کہ کسی زمانہ میں بڈیڈ کی زمین اتنی اچھی پیداوار دیتی تھی کہ یہاں لڑکیوں کا رشتہ کرنا لوگ فخر سمجھتے تھے۔ مگر اب صورت حال بدل گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس مسئلہ کا واحد حل اوٹ بندی ہے۔ مگر میو اتنے بے شعور ہیں کہ اس طرف توجہ نہیں دیتے۔ اگر اوٹ بندی کرکے بارش کا پانی جگہ جگہ روک دیا جائے تو نہ صرف مزید زمینوں کا متاثر ہونا رک جائے جو شور زمینوں سے بہہ کر آئے ہوئے پانی سے خراب ہو رہی ہیں بلکہ خود بخود شور زمینوں پر بارش کے میٹھے پانی کے رکنے سے ان کی شوریت چند برس میں ختم ہو جائے۔ انھوں نے

بتایا کہ اوٹ بندی کرنا اور ڈھینچا بونا شور زمینوں کی اصلاح کا بہترین طریقہ ہے۔

میو قوم کی جہالت سے یہ امید تو نہیں ہے کہ وہ خود سے اس تدبیر کو اختیار کریں گے۔ البتہ اگر حکومت اپنے انتظام کے تحت اسے کرائے تو یہ ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کے تحت حکومت میں محکمے قائم ہیں جو دوسرے مقامات پر اوٹ بندی کراتے ہیں مگر معلوم نہیں کیوں اس علاقہ کو حکومت چھوڑے ہوئے ہے۔ حالانکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک بہترین فصل پیدا کرنے والا علاقہ ہمیشہ کے لئے برباد ہو جائے۔

بڈیڈ میں ایک عجیب و غریب میو ہے جس کا نام روڑا ہے۔ وہ سو بیگھ کا بسوہ دار ہے مگر اس کو اور اس کے بیوی بچوں کو دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ حجری دور کا کوئی خاندان لا کر میوزیم میں رکھ دیا گیا ہے۔ اس کا گھر انسانی رہائش گاہ کے مقابلہ میں جانوروں کے بھٹ سے زیادہ مشابہ ہے۔ اس کا حال سن کر اور اس کے گھر کو دیکھ کر میں نے کہا یہ اتنی بڑی زمین کا مالک ہے، اس کے پاس کوئی خرچ بھی نہیں۔ یہ اپنا پیسہ کہاں رکھتا ہو گا۔ "یہ اپنے نوٹ درخت کے کھونیرا میں رکھتا ہے" میرے ساتھی نے کہا "اور پھر ایک روز اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نوٹ گلہری کھا گئی۔"

آج جنوری ۱۹۷۰ء کی ۴ر تاریخ ہے۔ اس وقت دن کے ۱۰½ بجے ہیں اور میں بڈیڈ کے پہاڑ پر بیٹھا ہوا ہوں۔ میں نے یہاں لوٹے میں پانی منگوا کر وضو کیا اور ایک پتھر پر دو رکعت نماز پڑھ کر دعا کی کہ،

"خدایا میں بہت گنہ گار ہوں، تو میرے گناہوں کو معاف فرما۔ اور مجھ سے اس برباد شدہ امت کی اصلاح و احیاء کا کام لے لے۔"

میرے سامنے وسیع پھیلا ہوا میدان ہے۔ حد نظر تک کھیت سبزہ سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ نیم اور کیکر کے درخت جگہ جگہ اس طرح بکھرے ہوئے ہیں جیسے مخملی فرش پر ہرے رنگ کے ابھرے ہوئے پھول بنا دیئے گئے ہوں۔ کہیں کہیں سرسوں کے بسنتی پھول اور خالی زمینوں کا خاکی رنگ اس کے سادہ حسن پر رنگین چھڑکاؤ کا منظر پیش کر رہا ہے۔ درمیان میں ادھر ادھر اراولی کی پہاڑیاں اس طرح نظر آتی ہیں جیسے قدرت نے اس حسین دنیا کی پاسبانی کے لئے سنتری کھڑے کر رکھے ہوں۔ اوپر افق تک آسمان کی نیلی چھتری نہ صرف اس کے حسن کو دوبالا کر رہی ہے بلکہ اس میں عظمت و وقار کا اضافہ بھی کر رہی ہے۔

یہیں میرے نیچے پہاڑی کے دامن میں ایک گاؤں آباد ہے۔ ٹیڑھے میڑھے راستوں پر اجڑے ہوئے مکانات جن کی بڑی تعداد خس پوش جھونپڑوں کی شکل میں ہے۔ چند مکانات پختہ اور سفید نظر آتے

ہیں جو یا کسی بنیئے کے ہیں یا کسی بڑے زمیندار کے ۔ گاؤں کے اوپر چیلوں اور گدھوں کی ایک فوج منڈلا رہی ہے جو شاید اس کی گندگی اور غلاظت کی وجہ سے کھنچ آئی ہے ۔ یہی گوڑ گاؤں ضلع کا وہ گاؤں ہے جس کو بڈیڈ کہتے ہیں ۔ قدرت کی حسین گود میں بسا ہوا یہ بدنصیب گاؤں نہ صرف ایک گاؤں ہے بلکہ یہ ایک چھوٹی سی تصویر ہے جس میں آپ پورے میوات کو دیکھ سکتے ہیں ۔ اس علاقہ میں میوؤں کی آبادیاں جو بیک وقت تین ریاستوں (راجستھان ہریانہ اور یوپی) میں پھیلی ہوئی ہیں، تقریباً سب اسی حالت میں ہیں ۔ پہاڑوں اور جنگلوں کے درمیان بسے ہوئے ان دیہاتوں کو دیکھ کر ایسا خیال ہوتا ہے جیسے یہ لوگ ابھی تک دور جدید میں داخل نہیں ہوئے ۔

بڈیڈ سے متصل جو پہاڑی ہے اس کی آخری چوٹی پر پتھر کے ٹکڑے گولائی میں جوڑ کر تقریباً دس فٹ اونچا اور پانچ فٹ چوڑا ایک ٹیلہ بنا دیا گیا ہے جس کو یہاں کی زبان میں "چونتری" کہتے ہیں ۔ لمبی چڑھائی چڑھ کر میں اس کے اوپر پہنچا ۔ یہ بلند جگہ غالباً اس لئے بنائی گئی تھی کہ یہاں بیٹھ کر چاروں طرف کا مشاہدہ کیا جاسکے ۔ میں اس پر کھڑا ہوا تو واقعۃً اتنی دور تک کا منظر نظر آ رہا تھا کہ پہاڑ کی اونچی کھڑی ہوئی دیواریں اور حد نظر پر ختم ہونے والے افق کے کنارے ہی اس کی راہ میں حائل ہوتے تھے ۔ میو قوم پتھر کے پہاڑ پر "چونتری" بنا کر سیکڑوں برس سے اپنے گردو پیش پھیلی ہوئی دنیا کو دیکھ رہی ہے ۔ مگر وہ نظر پیدا نہ کر سکی جس سے وہ بدلے ہوئے زمانہ کو دیکھ سکے ۔ اس کی محنت اور جفاکشی نے اس کو پہاڑ کی بلندی پر پہنچا دیا ۔ مگر زمین کی سطح پر جو تغیرات ہو رہے تھے اس سے وہ اتنی بے خبر رہی کہ آج بھی اس کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ابھی تک حجری دور میں سانس لے رہی ہو ۔

۵ جنوری ۱۹۷۰ء کی صبح کو ہم بڈیڈ سے نکلے تو گاؤں کے جنوبی کنارے کا آخری مکان عجیب و غریب منظر پیش کر رہا تھا ۔ ایک قلعہ نما مکان اپنی گری ہوئی دیواروں کے ساتھ بتا رہا تھا کہ ماضی میں وہ کسی بڑے آدمی کا مکان ہوگا ۔

"ہمارے گاؤں میں سب سے اونچے مالدار تھے یہ لوگ" میرے ساتھی نے کہا ۔ میرے سامنے ایک میو ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر لیٹا ہوا تھا اس نے اپنے قدیم مکان کے باہر ایک خس پوش کوٹھری بنا کر اس کے اندر "دوکان" رکھ لی ہے ۔

"کس چیز کی دوکان ہے" میں نے پوچھا ۔ "چھوٹو موٹو سودو بیچ لوں، کوئی سائیکل بھا ئیکل

بنالوں۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے دوکان کے اندر جھانک کر دیکھا۔ یہ ایک غارنما کوٹھری تھی۔ جس میں تلاش کے باوجود میں یہ جاننے میں ناکام رہا کہ اس کے اندر وہ کون سا "سودا" ہے جس سے وہ دوکانداری کر رہا ہے۔

اس مسلمان میؤ کا نام پرانے طریقہ پر سہدیو ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کے پاس ۴۰ بیگھہ زمین ہے۔ مگر اس میں "اب بھی پانی بھر و پڑو ہو" اس نے مایوس کن لہجہ میں کہا کہ "ہم دس سال سے مصیبت ہی مصیبت میں ہیں" کوئی فصل نا ہو، نہ کا تک نہ بیساکھ۔"

میں گاؤں کے باہر نکلا تو سہدیو کے مکان کے سامنے دور تک کھیتوں میں اب بھی جگہ جگہ پانی نظر آرہا تھا۔ یہاں چرواہے کے لباس میں ایک شخص لاٹھی لئے مویشی چرارہا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ کمل خاں کا لڑکا ہری سنگھ ہے (اس طرح کے یہاں کتنے میؤ ہیں جو اگرچہ مسلمان ہیں مگر نام سے لے کر معاشرت تک کوئی چیز ان میں مسلمان جیسی تلاش کرنا مشکل ہے) ہری سنگھ جو بڈیڈ کے سب سے بڑے مسلمان زمیندار خاندان کا ایک فرد ہے، اس سے میں نے پوچھا کہ یہ پانی کھیتوں میں کتنے دن سے ہے۔ مگر وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ جہالت اور تہذیب سے دوری نے اکثر میوؤں کا یہی حال کر رکھا ہے۔

۵ رجنوری کی شام کو ہم فیروز پور جھرکا (ضلع گوڑگاؤں) پہنچے۔ "جھر" کے معنی جھرنا کے ہیں۔ چونکہ اس قصبہ کے قریب پہاڑوں سے بہتا ہوا ایک چشمہ آتا ہے اسی لئے اس کی نسبت سے اسے فیروز پور جھرکا کہتے ہیں۔ پہاڑ کی بھیانک بلندیوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی سڑک تجارہ (ضلع الور) کی طرف چلی جارہی ہے۔ اس سڑک سے متصل پہاڑی چشمہ ہلکی موسیقی کے ساتھ نامعلوم مدت سے بہتا چلا آرہا ہے۔

پہاڑ کے اوپر جگہ جگہ اجڑی ہوئی خاموش مسجدیں اپنے بنانے والوں کا مرثیہ پڑھتی ہوئی کھڑی ہیں، جنھوں نے پہاڑوں کی بلندیوں پر مسجدیں بنادیں مگر اسلام کو بلندی و عظمت کے مقام پر کھڑا نہ کرسکے۔

ایک مقام پر ایک چھوٹا سا غار بھی ہے جو اللہ کی کوٹھری کے نام سے مشہور ہے۔

دوطرفہ پہاڑیوں کے درمیان (جن کی مجموعی چوڑائی تین میل ہے) اونچی نیچی سڑک سے گذرتے ہوئے ہم تقریباً چار میل پہنچے تھے کہ وہاں ایک آباد دنیا نظر آئی۔ یہ مہادیو کا استھان ہے۔ یہاں مندر ہے، دھرم شالے ہیں۔ جانوروں اور انسانوں کے لئے قیام کی اور رستانے کی جگہیں بنی ہوئی ہیں۔ پیپل اور برگد کے سائے میں بسی ہوئی اس دنیا میں بے شمار ہرے ہرے طوطے چہچہا رہے تھے۔ کہیں کہیں مور اپنی خوبصورت

دم لئے ہوئے چٹانوں پر نظر آتے تھے۔ نیچے میدان میں اونٹوں کی ایک تعداد اپنے عجیب الخلقت جثہ کے ساتھ اپنے مخصوص طرز پر آرام کر رہی تھی۔

اس وقت جبکہ میں یہاں کی ایک عمارت کی چوتھی منزل پر بیٹھ کر یہ سطریں لکھ رہا ہوں، مجھے وہ درجنوں مسجدیں اور درگاہیں یاد آرہی ہیں، جو میوات کے سفر میں اپنے پیچھے چھوڑتا آیا ہوں۔ یہ قدیم زمانہ کی عمارتیں اکثر بہترین جگہوں پر واقع ہیں۔ کہیں سڑک کے کنارے، کہیں کسی چوراہے پر۔ کہیں کسی بستی کے درمیان۔ مگر وہ آباد کرنے والوں کا مرثیہ پڑھتی ہوئی ویران کھڑی ہیں۔

"اس فرق کی وجہ کیا ہے" میں نے اپنے آپ سے سوال کیا "دور پہاڑ کے اس ویرانہ میں سادھوؤں نے ایک مندر کو لے کر پوری دنیا آباد کر رکھی ہے اور بے چارے مولوی سڑکوں اور بستیوں پر کھڑی ہوئی عمارتوں کو بھی آباد نہ کر سکے۔"

اس کا جواب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ "سادھوؤں" کو ایک ایسی قوم ملی ہے جو زندہ ہے اور اپنے اداروں کو زندہ رکھنا جانتی ہے۔ اس کے برعکس "مولویوں" کے پیچھے جو قوم ہے وہ زندہ نہیں۔ اس لئے اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ اپنے قومی اداروں کو کس طرح زندہ رکھا جاتا ہے۔

قومی اداروں کو جہاں سے غذا ملتی ہے وہ خود ان کی قوم ہے۔ اگر قوم مردہ اور غافل ہو جائے تو قومی ادارے بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔

۵ جنوری کی شام کو چار بجے جب کہ میں مندر کی چوتھی منزل پر بیٹھ کر یہ سطریں قلم بند کر رہا ہوں میرے سامنے سبز پوش پہاڑیوں کے اوپر سورج بدلیوں کے پیچھے چلا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ پردہ کے پیچھے سے ہمیں جھانک رہا ہو۔ چند گھنٹوں کے اندر یہ مدھم روشنی بھی ختم ہو جائے گی اور چاروں طرف پہاڑ سے گھری ہوئی اس دنیا پر مکمل اندھیرا چھا جائے گا۔

مگر زندہ انسان اندھیرے اور تنہائی میں بھی اپنی زندگی باقی رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی کو کوئی چیز ختم نہیں کرتی اور اگلی صبح یہ بتائے گی کہ یہ الفاظ کس قدر صحیح تھے۔

فیروزپور جھرکا کے پاس جو پہاڑی سلسلے ہیں ان کو مقامی زبان میں " کالا پہاڑ" کہا جاتا ہے۔ اس پہاڑی علاقے میں گھومتے ہوئے میں نے دیکھا کہ جگہ جگہ پتھروں سے پٹے ہوئے شہد کے چھتے لٹک رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ علاقہ شہد کی مکھیاں پالنے اور ان کا کاروبار کرنے کی بہترین جگہ ہے۔ مگر ابھی تک

کسی کو اس کی طرف توجہ نہیں ہوئی۔ میوؤں کے لئے شہد کے معنیٰ صرف یہ ہیں کہ کسی چٹان سے جب وہ شہد کا ایک چھتا لٹکتا ہوا دیکھیں تو اس کو کسی طرح لکڑی سے گرا لیں اور بھڑ چھتے اور مکھیوں کو برباد کر کے اس سے تھوڑا سا غیر صاف شہد نچوڑ لیں۔ اگر میوات کے پہاڑی علاقوں میں جدید طرز پر شہد کی مکھی پالنے کو رواج دیا جائے تو وہاں اس کا بہترین کاروبار ہو سکتا ہے۔

اسی طرح جب میں بڈیڈ کے پہاڑ پر بیٹھا ہوا تھا میرے ساتھی مولانا حسن خاں ایک بوٹی اکھاڑ کر لے آئے۔

"یہ روکھڑی خون فوراً روک دیتی ہے اور زخم کو بہت جلد اچھا کر دیتی ہے۔" انھوں نے کہا۔

انھوں نے اپنے پاؤں کا ایک نشان دکھایا۔ یہ ایک گہرے زخم کا نشان تھا۔ جب یہ زخم لگا تو میں نے یہی روکھڑی پیس کر لگا دی۔ چنانچہ اسی وقت خون بند ہو گیا۔ اور چند روز میں زخم بالکل اچھا ہو گیا۔"

اسی طرح انھوں نے اور بعض بوٹیاں دکھائیں اور پیچیدہ امراض میں ان کے طلسماتی فائدے بتائے۔ یہ سن کر میں نے سوچا کہ "یہ لوگ جو یہاں زمینوں کے شور ہونے اور سیلاب میں برباد ہونے کا مرثیہ لئے بیٹھے ہیں ان کے پہلو میں قدرت نے ان پہاڑوں کو اقتصادی خوش حالی کا زبردست پیغامبر بنا کر کھڑا کر دیا ہے، اگر ان بوٹیوں کی تحقیق کی جائے اور ان کو کاروباری انداز میں چلایا جائے تو اس علاقہ میں ان کی بدولت دوا سازی کی بڑی بڑی صنعتیں وجود میں آ سکتی ہیں۔ مگر ان کاموں کے لئے تعلیم کی ضرورت ہے۔ اور تعلیم کو میو قوم نے پہلے ہی سے اپنے لئے حرام کر رکھا ہے۔"

فیروز پور کو نواب فیروز الدین نے آباد کیا تھا۔ موجودہ نواب لوہارو انھیں کی باقیات میں سے ہیں۔ تقسیم سے پہلے یہ ایک مسلم بستی تھی۔ مگر ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں یہاں کے مسلمان پورا قصبہ خالی کر کے چلے گئے۔ اب وہاں زیادہ تر شرنارتھی آباد ہیں۔

اس تاریخی قصبہ کے گرد پتھروں کی زبردست شہر پناہ اس دور کو یاد دلاتی ہے جب کہ لوگ بستیوں کے گرد اونچی اونچی فصیلیں بنا کر سمجھتے تھے کہ انھوں نے اپنے کو محفوظ کر لیا ہے۔ حالانکہ زمانہ انھیں ایک ایسے مستقبل کی طرف لے جا رہا تھا جبکہ بستیوں اور میدانوں میں اپنی حفاظت کے سامان مہیا کرنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ جب نئے دور کا انقلاب آیا تو وہ لوگ جو صدیوں سے اس شہر پناہ میں اپنے کو محفوظ سمجھتے چلے آرہے تھے، انھیں یہ سنگی دیوار زمانہ کی دستبرد سے محفوظ نہ رکھ سکی۔

اس محصور شہر کے باہر کثرت سے قدیم طرز کے بنے ہوئے گنبد نظر آتے ہیں۔ یہ قدیم زمانہ کے امراء ورؤسا کے مقبرے ہیں جنھیں یہ تو معلوم تھا کہ وہ اپنی مردہ لاشوں کو کس طرح صدیوں تک کے لئے زمین پر محفوظ کردیں۔ مگر وہ یہ نہ جان سکے کہ زندہ انسانوں کو محفوظ کرنے کے لئے وہ کیا تدبیر اختیار کرسکتے ہیں۔ ان کے لئے دونوں ممکن تھے۔ مگر انھوں نے اس کو زیادہ ضروری سمجھا کہ اپنے مردہ ڈھانچوں کے لئے محفوظ چھتریاں کھڑی کردیں، زندہ انسانوں کی حفاظت کے لئے چھتریاں بنانے کا کام مستقبل کی ان نسلوں کے لئے چھوڑ گئے جو ماضی کی غفلت کے نتیجہ میں سرے سے تعمیری مواقع ہی سے محروم ہو چکی ہوں۔

فیروزپور میں سب کچھ لٹنے کے بعد اب بھی ایک چیز باقی ہے۔ یہ یہاں کی جامع مسجد ہے جو اپنی وسیع تعمیرات اور بلند میناروں کے ساتھ وسط شہر میں اسلام کے آخری نشان کے طور پر کھڑی ہوئی دور سے نظر آتی ہے۔ اس مسجد کو نواب احمد بخش نے ۱۲۴۲ھ میں بنوایا تھا۔

میں مسجد کے احاطہ میں داخل ہوا تو اس کے جنوبی سمت میں ایک وسیع عمارت نظر آئی۔ جس کے بند دروازوں پر ایک شاندار بورڈ لگا ہوا ہے۔ یہ مدرسہ اسلامیہ کا بورڈ تھا جو "انجمن محافظ الاسلام" کے زیر اہتمام قائم ہے۔ اس کو اس علاقہ کے مشہور مصلح مولانا محمد حسن صاحبؒ نے قائم کیا تھا جن کی ذاتی رہائش گاہ اب بھی مدرسہ کے پڑوس میں اپنی سابق شکل میں موجود ہے۔

"کیا یہ بند ہے" میں نے اپنے رفیق سفر مولانا حسن خاں سے دریافت کیا۔ انھوں نے ۶۔۷ سات سال تک یہاں رہ کر تعلیم حاصل کی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ فارسی کی ابتدا سے لے کر مختصر معانی تک میری تعلیم یہیں ہوئی ہے۔ ۱۹۵۶ء میں وہ یہاں سے چھوڑ کر دہلی چلے گئے اور بقیہ تعلیم مدرسہ امینیہ میں حاصل کی۔

مولانا حسن خاں نے بتایا کہ تقسیم کے بعد اگرچہ فیروزپور کا قصبہ مسلمانوں سے خالی ہوگیا تھا۔ مگر مدرسہ اس کے بعد بھی چلتا رہا۔ "ہمارے زمانہ میں مدرسہ کافی عروج پر تھا" انھوں نے کہا۔ لیکن ڈھائی برس سے خود مسلمانوں کے اختلاف نے اسے بند کر رکھا ہے۔ اس کا کیس عدالت میں پہنچ چکا ہے اور دونوں فریق یہ ثابت کرنے میں مشغول ہیں کہ اس پر کس کا حق ہے اور آئندہ کس کے قبضہ میں رہے۔

"قبضہ بحال رکھنے" کا یہ ذہن جس کا مظاہرہ مدرسوں اور مسجدوں میں زور شور سے ہوتا رہتا ہے، کاش یہ اس سے باہر وسیع دنیا کے لئے بھی ہوتا تو ان چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کی نوبت ہی نہ آتی۔ زمانہ ہماری تمام بڑی بڑی املاک پر قبضہ کرتا جا رہا ہے اور ہم ہیں کہ ہڈیوں کے لئے لڑ رہے ہیں۔

۵ جنوری کی شام کو ہم مغرب کے وقت نصیر باس پہنچے۔ یہ الور۔ دہلی روڈ پر دہلی سے ۶۵ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں ہم نے رات گذاری۔

نصیر باس تقریباً ۳۰ خاندانوں کی بستی ہے جو سب کے سب میو ہیں۔

خس پوش مکانات کے سامنے سڑک کے عین کنارے دو شاندار عمارتیں سب سے پہلے آنے والے کی توجہ اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ ان میں سے ایک تو "تھڑی" ہے جو کسی میو بستی کی سب سے مقدس قومی جگہ ہوتی ہے۔ دوسری عمارت نو تعمیر مسجد ہے جو قدیم خام عمارت کے اوپر پختہ شکل میں بنائی گئی ہے۔

"یہ مسجد کتنے میں تیار ہوئی ہے" میں نے شہاب الدین صاحب سے دریافت کیا۔ جب انھوں نے بتایا کہ "سولہ سو روپے میں"، تو مجھے بہت تعجب ہوا۔ کیونکہ اصل تعمیر کے لحاظ سے یہ مقدار بہت کم تھی۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ گاؤں والوں نے خود رضاکارانہ طور پر کام کرکے اسے بنایا ہے اس طرح مزدوری کا خرچ پورا کا پورا بچ گیا۔ یہاں دیواریں اینٹ کے بجائے پتھر سے بنتی ہیں۔ جب ضرورت ہوئی گاؤں والوں نے دس دس گاڑیاں کھڑی کردیں۔ اور پتھر لاکر ڈھیر کردیا۔ یہ ایک معمولی گاؤں ہے۔ مگر گاؤں والوں کے اتحاد کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں بجلی بھی آگئی اور انھوں نے کوشش کرکے سب سے پہلے مسجد کو بجلی کے قمقموں سے منور کیا۔

۶ جنوری کو ۱۱ بجے ہم نوح (ضلع گوڑگاؤں) پہنچے۔ یہاں ایک گھنٹہ مولانا نیاز محمد صاحب کے مدرسہ میں گذرا۔ جو نام کے اعتبار سے "مسجد بنگلہ والی" مگر حقیقت کے اعتبار سے جھونپڑے والی مسجد میں قائم ہے اب بھی اسی بے سروسامانی کے ساتھ میرے سامنے تھا، جس طرح میں نے اسے ایک سال پہلے دیکھا تھا۔ البتہ مسجد کے سامنے ایک نئی دیوار سائبان بنانے کے لئے کھڑی تھی۔ معلوم ہوا کہ مولانا عتیق احمد (دہلی) اور مولانا جمیل احمد (نوح) کی فیاضی سے یہ تکمیل پذیر ہوئی ہے۔ اب یہ بغیر چھت کی دیوار کسی اور صاحب خیر کا انتظار کررہی ہے جو اس کو سایہ دار سائبان میں تبدیل کردے۔

میں نے اپنی طبیعت کو آمادہ کیا کہ اس دیوار ہی کو دیکھ کر خوشی منالوں۔ کاش وہ دن بھی آتا کہ میں یہ دیکھ کر خوش ہوتا کہ میوات کے اس مرکزی مقام پر ایک شاندار دارالعلوم کھڑا ہوا ہے۔

نوح میں حافظ محمد صدیق صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ تبلیغ کے بہت سرگرم کارکن ہیں۔ نوح آبائی وطن ہے مگر زیادہ تر نظام الدین میں رہتے ہیں۔ موصوف سے میوات اور تبلیغ کے بارہ میں بڑی قیمتی باتیں

معلوم ہوئیں۔

میوات میں تبلیغ کا کام تقریباً ۷۰ برس پہلے شروع ہوا۔ مولانا الیاس صاحبؒ کے والد مولانا محمد اسمٰعیل صاحب (وفات ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۸ء) اس خانوادۂ دعوت کے پہلے شخص ہیں جنھوں نے بنگلہ والی مسجد (نظام الدین۔ دہلی) میں قیام فرمایا۔ انھوں نے خود تو کبھی میوات کا سفر نہیں کیا مگر میوات سے قرب کی وجہ سے ان کے "مدرسہ میں ۱۰۔ ۱۲ میواتی طالب علم برابر رہتے تھے۔"

مولانا الیاس صاحب اور ان کی دینی دعوت

ازمولانا سید ابوالحسن علی ندوی ص ۳۸

مولانا اسمٰعیل صاحب کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے مولانا محمد صاحبؒ (وفات ۱۳۳۶ھ) نے بنگلہ والی مسجد میں قیام فرمایا۔ یہاں آپ نہ صرف مدرسہ میں میواتی نوجوانوں کو تعلیم دیتے رہے بلکہ انھوں نے میوات میں سفر کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ حافظ محمد صدیق صاحب کے بیان کے مطابق وہ تین بار قصبۂ نوح آئے تھے جو دلی سے ۵۳ میل کے فاصلہ پر میوات کا پہلا مرکزی مقام ہے۔

مولانا محمد صاحب کے بعد یہ دعوتی اور تبلیغی وراثت مولانا الیاس صاحبؒ (۱۳۰۳۔ ۱۳۶۳ھ) کی طرف منتقل ہوئی۔ انھوں نے میوات کو اپنی جدوجہد کا مخصوص مرکز بنالیا۔ اور نوح تو وہ بےشمار بار آئے ہیں۔ مدرسہ معین الاسلام سے متصل حافظ محمد صدیق صاحب کے حجرہ میں مولانا کا قیام رہتا تھا۔ اس کمرہ میں وہ چارپائی اب بھی موجود ہے جس پر مولانا الیاس صاحب آرام کرتے تھے۔ جب مجھے یہ بات معلوم ہوئی تو میں اس چارپائی (ڈھلا) پر جاکر لیٹا اور کچھ دیر تک تاریخ کے پچھلے اوراق کو تصور کی نگاہوں سے پڑھتا رہا۔

نوح میں پہلے مسلمانوں کی ۵۰ ہزار آبادی تھی۔ مگر ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں قصبہ اس طرح برباد ہوا کہ اب مشکل سے ۵۰ خاندان مسلمانوں کے یہاں بستے ہوں گے۔

میں نے رات یہاں مدرسہ معین الاسلام میں گذاری۔ یہ مدرسہ تقریباً ۵۰ سال سے قائم ہے۔ پہلے مکتب کی شکل میں تھا اب یہاں دورۂ حدیث تک تعلیم کا انتظام ہے۔ تقریباً پونے دوسو طالب علم اور ایک درجن اساتذہ ہیں۔ یہ میوات میں عربی کا سب سے بڑا مدرسہ ہے۔

مدرسہ کی پھیلی ہوئی عمارت اور تعمیر مسجد کا وسیع نقشہ بتاتا ہے کہ میوات کے دیگر مدارس کے

برعکس معین الاسلام کے وسائل غیر تسلی بخش نہیں ہیں مگر اس پررونق اور آباد دنیا میں ترتیب اور نظم کے اعتبار سے وہی روایتی مشرقیت نظر آئی جس کو بدقسمتی سے اسلام سمجھا جانے لگا ہے ۔

مختلف لوگوں کی زبانی مولانا الیاس صاحبؒ کے ملفوظات سنے ۔ ان میں سے چند یہ ہیں ۔

۱ جب مدرسے کچے تھے تو تعلیم پکی تھی ۔ جب مدرسے پکے ہوئے تو تعلیم کچی ہو گئی (مولانا محمد عیسیٰ)

۲ پہلے عوام میں طلب تھی اب نہیں رہی ۔ اس لئے علماء کو اب کنواں بن کر نہیں رہنا چاہیئے بلکہ بادل بن کر برسنا چاہیئے ۔ (مولانا محمد اسحٰق)

۳ مولانا محمد صدیق صاحب نے بتایا کہ ایک بار کلکتہ کے کوئی صاحب نظام الدین آئے ۔ مولانا یوسف صاحبؒ کی گفتگو سن کر انھوں نے کہا " معلوم ہوتا ہے حضرت جی اخبار بہت پڑھتے ہیں " مولانا نے سنا تو فرمایا :

ایسا نہیں ہے ۔ اصل میں اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کچھ کلیات کھول دئے ہیں ۔ جب بھی کوئی جزئی واقعہ میرے سامنے آتا ہے ، خواہ وہ کسی کی گفتگو سے معلوم ہو یا خط وغیرہ کے ذریعہ تو میں اس جزئیہ کو اس کلیہ سے جوڑ دیتا ہوں ۔

۴ مولانا الیاس صاحب نے علماء کے لئے ے چلے (نو مہینے) کا تبلیغی کورس رکھا تھا ۔ مولانا یوسف صاحبؒ نے اس کو تین سال کر دیا اور اس کی حکمت یہ بتائی کہ ایک سال ہندستان میں رہ کر یہ لوگ دعوت کے اصول سیکھیں گے ۔ پھر ایک سال عرب جاکر صحابہ والے اخلاق کی تربیت حاصل کریں گے اور پھر یورپ میں جاکر ایک سال تک تبلیغ کریں گے ۔ مولانا کا خیال تھا کہ مشرقی ممالک مغرب کے اتنے مقلد ہو چکے ہیں کہ جب مغرب کے لوگ یہاں آئیں گے اسی وقت وہ تبلیغ کی طرف مائل ہوں گے ۔

۵ میاں جی محمود خاں نے بتایا کہ مولانا الیاس صاحب سے میاں جی دین محمد گوالدہ نے دریافت کیا " یہ تبلیغ اور جمعیۃ ایک ہی بات ہے یا دو ہیں " مولانا الیاس صاحب نے فرمایا ۔ " کیا سمجھنا چاہتے ہو ۔ " انھوں نے جواب دیا ۔ ہاں ۔ فرمایا " وہ حکومت کی لائن سے دین کی خدمت کر رہے ہیں اور ہم نبوت کی لائن سے ۔ بات ایک ہی ہے ۔ "

مدرسہ معین الاسلام میں مولانا محمد عیسیٰ صاحب ایک بے لوث شخصیت ہیں ۔ ان کے انتظام میں یہ

مدرسہ انشاء اللہ اور ترقی کرے گا۔

۷ر جنوری کی صبح کو ہریانہ روڈویز پر ہم نوح سے دہلی کے لئے سوار ہوئے۔ اس وقت ۶ بجے تھے اور ابھی میوات کا یہ تاریخی قصبہ آخری شب کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہماری بس میوات کی سب سے بڑی شاہراہ پر دوڑ رہی تھی اور افق پر دھیرے دھیرے صبح کی سفیدی نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ سورج نکل آیا اور ساری فضا نئے آفتاب کی روشنی سے جگمگا اٹھی۔

دل نے کہا میوات میں بھی کچھ دردمند لوگوں نے اسی طرح سفر کا ارادہ کیا ہے۔ بظاہر امکانات بے حد تاریک ہیں۔ پھر بھی ایک آنے والی صبح کی امید میں وہ راستہ ٹٹول رہے ہیں۔ کاش وہ صبح آئے، کاش یہ تاریکی بھی اسی طرح روشنی میں تبدیل ہو جائے جس طرح رات نے دن کی صورت اختیار کی ہے۔

چھٹا سفر

۲۴ دسمبر ۱۹۷۰ء کو قصبہ پہاڑی (ضلع بھرت پور، راجستھان) جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں مدرسہ عربیہ رحیمیہ (قائم شدہ ۱۹۶۰ء) واقع ہے، اس کو میں نے دیکھا تو ایسا محسوس ہوا گویا میں اینٹ اور گارے کے مجموعے کی شکل میں ہندستانی مسلمانوں کی تصویر دیکھ رہا ہوں۔ جو کبھی عالی شان قوم کی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر آج ایسے کھنڈر کی شکل میں پڑی ہوئی ہے کہ اس کے اندر یہ حوصلہ بھی نہیں کہ قدیم ٹوٹی پھوٹی بنیادوں پر نئی تعمیر کی اینٹیں رکھ سکے۔

پہاڑی ایک تاریخی قصبہ ہے جس کے چاروں طرف قبروں اور قدیم عمارتوں کے پتھر اس طرح بکھرے ہوئے ہیں جیسے وہ سنگی کتاب کے اوراق ہوں جس کو زمانہ کے بے رحم ہاتھوں نے منتشر کر دیا اور اب وہ کسی دیوانہ کا انتظار کر رہے ہوں جو آئے اور ان کو دوبارہ جمع کر کے قدیم کھنڈروں کے نشانات پر نئی تعمیر کھڑی کرے۔

تقسیم سے قبل پہاڑی کے قصبہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ یہاں کی سرداری اور یہاں کا زمینداره سب ان کے قبضہ میں تھا۔ مگر تقسیم کے بھونچال نے یہاں کی مسلم آبادی کو اس طرح اجاڑا کہ ان کی بیشتر تعداد پاکستان جانے پر مجبور ہوگئی۔ آج پہاڑی کی زمین پر ایک نیا قصبہ آباد ہے۔ قدیم طرز کے گھروندوں کی جگہ جدید عمارتیں کھڑی ہوگئی ہیں۔ سڑک اور بجلی نئے تمدن کے لوازمات کو قصبہ میں پہنچا رہے ہیں۔ بس سروس، اسکول، اسپتال، ڈاک خانہ، واٹر ورکس قائم ہوگئے ہیں۔ نئے مواقع سے فائدہ اٹھا کر لوگ تجارتوں کو فروغ دے رہے ہیں۔ مگر ان ترقیوں میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ قصبہ پر اور قصبہ کی تمام سرگرمیوں پر نئے آبادکاروں کا غلبہ ہے۔ مسلمان بے حیثیت ہو کر کونوں اور گوشوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ نئے انقلاب نے ان سے صرف قدیم مواقع ہی نہیں چھینے بلکہ وہ جدید مواقع جن کو وجود میں لانے میں وہ بھی ٹیکس دہندہ کی حیثیت سے برابر کے شریک ہیں ان سے استفادہ میں ان کا حصہ نہیں۔ قصبہ میں جگہ جگہ مسلمانوں کی قبریں نظر آتی ہیں۔ جن کے اوپر پتھر کی بڑی بڑی سلیں اس طرح جمائی ہوئی ہیں جیسے وہ ان کی حفاظت کی ضامن بنا کر رکھی گئی ہوں ایسے سنگی مزارات سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جب میں ان سنگی قبروں کو دیکھتا ہوں تو مجھ پر

عجیب تاثر ہوتا ہے ۔ میں سوچتا ہوں کہ وہ لوگ بھی کیسے عجیب تھے، جنہوں نے اپنی لاشوں کو محفوظ کرنے کے لئے سنگی ضمانتیں قائم کر دیں مگر آنے والی زندہ نسلوں کے لئے موہوم تمناؤں کے سوا کچھ نہیں چھوڑا ۔ اگر کوئی چیز ہے تو وہ ماضی کے قائدین کے شاندار تقریری الفاظ ہیں ۔ جن کو یہ بدنصیب قوم اب بھی اس طرح سینہ سے لگائے ہوئے ہے جیسے وہ بنی اسرائیل کا مقدس تابوت ہو ۔ وہ الفاظ جو اپنی معنویت کو آخری حد تک کھو چکے ہیں، یہ بے خبر قوم ان پر اب بھی اس طرح ایمان رکھتی ہے جیسے یہ الفاظ اچانک کسی روز تاریخ کے پراسرار غار سے نکلیں گے اور دنیا میں معجزاتی انقلاب برپا کر دیں گے ۔

قصبہ پہاڑی میں ایک مسجد ہے جس پر سن تعمیر ۱۰۶۰ھ کندہ ہے ۔ مگر یہاں اس سے زیادہ پرانی عمارتیں ہیں ۔ قصبہ کی سب سے قدیم عمارت جو قصبہ کے سب سے زیادہ نمایاں اور اہم مقام پر کھڑی ہوئی ہے ۔ وہ "داداصاحب خاں پیر" کی خانقاہ ہے جو نواب ہونے کے علاوہ بزرگ درویش بھی تھے ۔ اور انہوں نے مسجد اور خانقاہ کی صورت میں ذکر و عبادت کا ایک بڑا مرکز تعمیر کیا تھا ۔ یہ خانقاہ اب انتہائی خستہ ہو چکی ہے ۔ جب کہ مذکورہ بالا مسجد بالکل اچھی حالت میں ہے ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خانقاہ مذکورہ بالا مسجد سے بھی پہلے غالباً دسویں صدی ہجری میں تعمیر کی گئی ہوگی ۔

مولانا محمد رحیم شاہ صاحب جو قصبہ پہاڑی کے قدیم باشندے ہیں، انہوں نے بتایا کہ خانقاہ آزادی سے قبل ہی کھنڈر ہو چکی تھی ۔ دن کے وقت وہاں جانور پناہ لیتے تھے ۔ اور رات کے وقت چور اور اچکّے وہاں چھپ کر مشورے کرتے تھے ۔

۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں جب پہاڑی سے مسلمانوں کا انخلاء ہوا تو قصبہ کی جامع مسجد اور دوسری مسجدوں پر غیر مسلموں کا قبضہ ہو گیا ۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ جامع مسجد پر جو غیر مسلم قابض تھا اس کی بیوی (مقامی اصطلاح میں لُگائی) کو کوئی اغوا کر لے گیا مولانا محمد رحیم شاہ صاحب یہاں دعا تعویذ کے لئے بہت مشہور رہیں ۔ کسی نے مشورہ دیا کہ مولانا کے پاس جاؤ ۔ وہ دہلی آکر مولانا سے ملا ۔ مولانا نے مسجد پر قبضہ کا ذکر کیا ۔ اس نے کہا کہ میری بیوی مجھ کو مل گئی تو میں مسجد خالی کر دونگا ۔ مولانا نے دعا کی اور تعویذ لکھ کر دی ۔ خدا کے فضل سے اس کی بیوی اس کو واپس مل گئی اس کے بعد اس نے مسجد خالی کر دی ۔ یہ بھی اسلام کا ایک معجزہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں ایسی مخفی تاثیرات

رکھ دی ہیں کہ جب اہل اسلام کے ہاتھ میں کسی قسم کی کوئی مادی طاقت نہ رہ گئی ہو اس وقت بھی وہ کلام الٰہی کی معجزانہ کرامتوں کو دکھا کر نہ صرف عوام بلکہ خود قاہر و غالب طاقت کا دل جیت سکتے ہیں۔

اسلام اس وقت بھی ایک طاقت ہے جب ساری دنیا کے عقلاء یہ فیصلہ کر چکے ہوں کہ اسلام کے پاس کوئی طاقت نہیں رہی۔

رات کے وقت ایک مقامی ہندو چودھری مولانا رحیم شاہ صاحب سے تعویذ لینے کے لئے آیا۔ باتوں باتوں میں اس نے کہا :

"مولوی جی اس درگاہ کو تو چمن بنا دو آپ۔"

میں نے یہ سنا تو میرے سامنے دینی اداروں کی تصویر پھر گئی، جو آج کی متمدن دنیا میں ہر جگہ تیسرے درجہ کا حلیہ لئے ہوئے کھڑے ہیں۔ میں نے سوچا، کاش یہ ممکن ہوتا کہ دینی ادارے ہر جگہ دینی چمنستان کی طرح نظر آتے۔ وہ نہ صرف آج کے تمدنی معیار پر پورے اترتے بلکہ اپنے حقیقی معنی اور مقصد کے اعتبار سے بھی ایسا چمن ہوتے جہاں لوگوں کو خوشبو اور رنگت ملتی۔ ان کو دیکھنے والا یہ نہ کہتا کہ "مولوی جی اس کو چمن بنا دو"، بلکہ اس کی زبان سے یہ نکلتا :

"مولوی جی تم نے تو خوب ہی چمن بنایا ہے
میں تو اس کی خوشبو سے سرمست ہو گیا"۔

قصبہ پہاڑی میں داد اصاحب خاں پیر کی خانقاہ جو اب "مدرسہ عربیہ رحیمیہ" بننے کی جدوجہد کر رہا ہے، جائے وقوع کے اعتبار سے بہترین جگہ پر واقع ہے۔ سڑک کے مشرقی جانب بلندی پر قصبہ کی عمارتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ مغربی جانب خانقاہ ہے اور اس کے بعد ہموار کھیت ہیں جو دور پھیلی ہوئی پہاڑیوں تک چلے گئے ہیں۔ کھیتوں میں سرسوں کی فصل بسنتی پھولوں کے ساتھ کھڑی ہے جن میں جگہ جگہ ابھرے ہوئے درخت فطرت کے اس حسن میں مزید اضافہ کر رہے ہیں۔ میں مدرسہ کی عمارت کے باہر کھڑا ہوا تو ایسا محسوس ہوا جیسے ایک طرف تمدن کے مظاہر ہیں اور دوسری طرف فطرت کا ازلی حسن، اور درمیان میں مدرسہ عربیہ دونوں کے سرے ملانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس قسم کے مدارس میوات میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ جو قوم ان مدارس کی وارث ہے اگر وہ زندہ قوم ہوتی تو وہ ان کو اس طرح مرصع کرتی کہ وہ سیرگاہ کی شکل اختیار کر لیتے، اور اسی کے ساتھ اپنی ہیئت سے اس بات کا درس بن جاتے کہ یہ ذہنی سرگرمیوں کا وہ مرکز

ہے جہاں انسان فطرت اور تمدن کی دوئی کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جہاں ایسے انسان تیار کئے جا رہے ہیں جو عالم حیات کے اس تضاد کو ختم کریں کہ تمدن کا رشتہ فطرت سے چھوٹ جائے اور اس کی ترقیاں بالآخر اس کو تباہی کے خندق میں گرانے کا سبب بن جائیں۔

آہ وہ قوم جو ماضی کے کھوئے ہوئے امکانات کے لئے رو رہی ہو اور حال میں جو امکانات اسے حاصل ہیں ان کو استعمال نہ کر سکے۔

ساتواں سفر

جنوری ۱۹۷۱ کے تیسرے ہفتے کے چند روز میرے میوات میں گذرے ۔ میوات کوئی ضلع یا ریاست نہیں بلکہ ایک خاص جغرافی خطے کا نام ہے جہاں مسلمانوں کی وہ نسل بستی ہے جس کو میو کہتے ہیں ۔ میوات، راجستھان اور ہریانہ اور کچھ پنجاب کے علاقوں پر مشتمل ہے ۔

۲۲ر جنوری کی شب اور دن کے کچھ گھنٹے میرے نگینہ (ضلع گوڑ گاؤں، ہریانہ) میں گذرے ۔ نگینہ ایک قصبہ ہے جو علاقہ میوات کے وسط میں ہے ۔ نگینہ کے چاروں طرف ۲۵ ـ ۲۶ میل کے مربع میں میوات واقع ہے ۔

ہریانہ ہندستان کی واحد ریاست ہے جس کے گاؤں گاؤں میں بجلی پہنچائی جا چکی ہے ۔ ریاست کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا گاؤں بھی ایسا باقی نہیں جہاں بیسویں صدی بجلی کے قمقموں کے ساتھ طلوع نہ ہو چکی ہو ۔ مگر اسی علاقہ میں ایک ایسی قوم بھی بستی ہے جو زمانہ سے اتنا پیچھے ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے ابھی تک بیسویں صدی میں قدم ہی نہیں رکھا ۔ یہ وہی قوم ہے جس کو عرف عام میں "میو" کہا جاتا ہے ۔

نگینہ ۸۵ دیہاتوں کے درمیان ہے ۔ ان دیہاتوں کے لوگ یہاں بازار کرنے آتے ہیں جن کی ۹۰ فی صد تعداد مسلمان ہوتی ہے ۔ مگر بازار میں کوئی مسلمان دوکان نہیں ۔ صرف ایک "کھوکھا" تھا، وہ بھی میں نے دیکھنا چاہا تو معلوم ہوا کہ بند ہو چکا ہے !

اقتصادی شعور سے یہ محرومی موجودہ زمانہ میں خودکشی سے کم نہیں ۔ یہ تمام فسادات سے زیادہ تباہ کن ہے ۔ مگر کس قدر عجیب بات ہے کہ مسلم قیادت کو اس کی خبر تک نہیں ۔ اس کے لئے کچھ کرنا تو درکنار ۔

یہاں "دار العلوم" کے نام سے ایک مدرسہ قائم ہے جو مدرسہ سے زیادہ پناہ گزینوں کا بسیرا معلوم ہوتا ہے ۔ بدقسمتی سے ہمارے مدرسہ چلانے والوں کو "چندہ" مانگنے کے سوا کوئی اور ذریعہ نہیں معلوم ۔ ورنہ اگر نگینہ میں کوآپریٹو بنایا جائے اور بازار کی مسلم خریداری کو منظم کر لیا جائے تو کسی سے ایک پیسہ لئے بغیر صرف اس اجتماعی نظم کی بدولت اتنی زیادہ آمدنی ہو گی کہ موجودہ چھپر پوش مدرسہ کی جگہ ایک عالی شان دار العلوم کھڑا ہو جائے ۔

۲۲ر جنوری کو ۱۱½ بجے ہم گوبند گڑھ (راجستھان) پہنچے ۔ بستی میں داخل ہوئے تو ایک جگہ کچھ ہندو

لڑکے کھڑے تھے۔ "کیا تم پاکستانی ہو" ایک لڑکے نے پوچھا۔ یہ طنز نہیں محض سادہ سا سوال تھا۔ اسی طرح ایک بار ہم میو بستی سے گزرے تو لڑکوں نے ہمیں دیکھ کر کہا تھا "ملاجی! کہیں جلسو ہے" گویا اس علاقہ میں مذہبی حلیہ اور شیروانی اور پاجامہ میں آدمی ہو تو وہ غیر مسلم بچوں کی نظر میں "پاکستانی" اور مسلم بچوں کی نظر میں "تبلیغی ملا" ہے۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ یہ علاقہ ابھی زمانہ سے کس قدر پیچھے ہے۔

گوبند گڑھ کے مغرب کی جانب قصبہ کے آخری کنارہ پر دو بوسیدہ دیواروں کے دوش ناتواں پر ایک چھپر رکھا ہوا ہے اور اس پر لکھا ہے:

مدرسہ عربیہ زینت العلوم

اگر مدرسہ کے نام کو اس کے قائم کرنے والوں کے ارادہ کا مظہر سمجھا جائے تو اس کا شکستہ ڈھانچہ اس کے وسائل و ذرائع کا آئینہ دار ہوگا۔ اور اگر اس نمونہ کو اور وسیع کر دیجئے تو اس میں پوری ملت اسلامیہ ہند کی کہانی عکس ریز ہوتی ہوئی دکھائی دے گی۔ لفظی ناموں اور القاب کے اعتبار سے دیکھئے تو ہم نے امامت و قیادت کا کوئی مقام اپنے سوا دوسرے کے لئے نہیں چھوڑا ہے۔ مگر حقیقت کی دنیا میں جو چیز ہمارے حصہ میں آئی وہ ایک ایسا "مدرسہ" تھا جس کا نام تو "زینت العلوم" ہو مگر جس کا عملی وجود ایک شکستہ چھپر کے سوا اور کسی چیز پر قائم نہ رہے۔ مولانا رحیم شاہ صاحب کے الفاظ میں نام کے اعتبار سے "زینت العلوم" اور حقیقت کے اعتبار سے "زینت الچھپر"۔ یہ ایک مدرسہ نہیں بلکہ پوری قوم کی کہانی ہے۔

۲۲ جنوری کی شام کو ۵ بجے ہم الگھانی پہنچے اور وہاں رات گزاری۔ راستہ میں حد نظر تک سرسوں کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ نہایت شاداب فصل بسنتی پھولوں کا تختہ بنی ہوئی کھڑی تھی۔ یہاں آب پاشی کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر سرسوں بوتے ہیں جو پانی کے بغیر خوب فربہ ہو جاتی ہے۔ سوکھے کھیتوں میں جس طرح سرسوں کی شاداب فصل کھڑی تھی اس سے اندازہ ہوا کہ زمین نہایت زرخیز ہے، اور اگر آب پاشی کا انتظام ہو جائے تو گیہوں اور دوسری چیزیں نہایت عمدہ پیدا کی جا سکتی ہیں۔

الگھانی میں گاؤں کے باہر ایک مدرسہ قائم ہے۔ یہ مدرسہ بھی مٹی کی دیواروں کے اوپر چھپر کی شکل میں کھڑا ہے۔ مگر مدرسہ کے بانیوں نے شوق ترقی میں اس کے نام کے لئے بھی "زینت العلوم" پسند کیا ہے!

۲۳ جنوری کی سہ پہر کو ہم مبارک پور (ضلع الور) پہنچے اور دو گھنٹہ وہاں قیام کیا۔ قصبہ کا بازار خریداروں سے بھرا ہوا تھا۔ جدید تمدنی لوازم وہاں پہنچ کر لوگوں کو ترقی کے نئے نئے مواقع دیتے ہوئے نظر

آرہے تھے۔ مگر اس میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ بستی میں پانچ مسجدیں ہیں جن میں سے ایک میں پرائمری اسکول قائم ہو چکا ہے۔ تین مسجدوں میں وقف بورڈ کے تالے پڑے ہوئے ہیں اور ایک مسجد آباد ہے جس میں چھوٹا سا مدرسہ بھی ہے۔

مسجد میں عصر کی نماز کے لئے پہنچا تو وہاں ایک مجمع اکٹھا تھا۔ ایک صاحب سوٹ میں ملبوس کوئی افسر نظر آتے تھے اور بقیہ نصف درجن مسلمان تھے۔ باہم بحث جاری تھی۔

قصہ یہ تھا کہ مسجد کے عقبی دروازہ کی طرف مسلمانوں نے ایک معمولی سا چھپر ڈال لیا تھا۔ افسر صاحب جو دراصل مقامی سرپنچ تھے یہ کہہ رہے تھے کہ کئی لوگوں نے شکایت کی ہے کہ مسلمان مسجد کے باہر نکل کر چھپر ڈال رہے ہیں، اس سے انھیں روکا جائے اور چھپر کو ہٹایا جائے۔ مسلمان اس کے جواب میں مختلف باتیں کہہ رہے تھے، مثلاً "یہ قبرستان ہے" اور مسجد سے متعلق زمین ہے" وغیرہ۔

میں نے سرپنچ صاحب سے کہا کہ آپ جو چھپر ہٹانے کے لئے کہہ رہے ہیں تو اس کی وجہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا یہ راستہ پر ہے۔ میں نے جائے وقوع کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ سڑک کے پاس "راستہ" کی جو چوڑائی ہے اور آگے جو چوڑائی ہے، وہی تو درمیان میں ہوگی۔ پھر کون سی سواری آپ یہاں سے گزاریں گے جو ادھر اور ادھر تو دس فٹ ہو اور بیچ میں پہنچے تو بیس فٹ ہو جائے۔

پھر میں نے کہا کہ یہاں پتھر کی قبریں موجود ہیں، پھر یہ کیسا راستہ ہے جہاں قبریں درمیان میں کھڑی ہیں۔

سرپنچ صاحب نے کہا کہ یہ پنچایت کی زمین ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تو صاف طور پر قبرستان ہے اور قبرستان اور مسجد دونوں وقف بورڈ کے ہوتے ہیں نہ کہ پنچایت کے۔ آزادی کے بعد ہماری انتظامیہ کے اسی مزاج نے ملک کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔

قصبہ مبارک پور میں تقسیم سے پہلے "خان زادے" آباد تھے، جو یہاں لینڈ لارڈ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی بڑی بڑی حویلیاں اور بیر کے بڑے بڑے (۵۰ بیگھ تک کے) باغات اب بھی ان کی نشانی کے طور پر موجود ہیں۔ مگر اسی مبارک پور میں آج مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ مسجد کی خود اپنی زمین پر چھپر اٹھانے کی بھی اجازت نہیں۔ کیسی عجیب ہیں ماضی کی وہ کامیابیاں جنھوں نے ہمیں اس ناکام حال تک پہنچایا ہے۔

۲۳ر جنوری کی شام کو ننگلہ چراؤ نڈا (ڈاک خانہ مبارکپور ضلع الور) پہنچے۔ یہ کوئی گاؤں نہیں، بلکہ ایک خاندان کی نجی بستی ہے۔ عبدالغفار صاحب اور ان کے بھائی یہاں اپنے کھیتوں پر معمولی مکان بنا کر آباد ہو گئے ہیں۔

یہ لوگ پہلے رسواڑہ کے بڑے زمیندار تھے۔ مبارکپور سے ایک میل کے فاصلہ پر واقع اس قصبہ میں اب بھی واحد پختہ حویلی اپنی بلند عمارتوں کے ساتھ کھڑی ہوئی بتا رہی ہے کہ ان کا ماضی کیا تھا۔ عبدالغفار صاحب کا خاندان پہلے اسی حویلی میں رہتا تھا اور اس کے آس پاس کی پونے دو سو بیگھ بہترین زمین ان کے قبضہ میں تھی۔ مگر تقسیم کے ہنگامہ میں وہ اپنی زمین اور اپنے مکان کو چھوڑ کر گوڑ گاؤں چلے گئے۔ واپس آئے تو ان پر شرنارتھی قابض ہو چکے تھے۔ عبدالغفار صاحب کے خاندان کو حکومت نے دو میل کے فاصلہ پر ۵۵ بیگھ زمین دی ہے جو سابق زمین کے مقابلہ میں تیسرے درجہ کی بھی نہیں۔ وہاں ان لوگوں نے کچی دیواروں پر چھپر ڈال کر رہائش گاہ بنا لی ہے، جس میں گھر کے تمام مرد اور عورت رات دن زندگی کی جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں۔

عبدالغفار صاحب اور ان کے بھائیوں کی چھپر پوش کالونی (ننگلہ چراؤ نڈا) دو پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے۔ مشرق اور مغرب میں دور تک پھیلے ہوئے پہاڑی سلسلے قدرت کی سنگین لکیروں کی طرح کھڑے ہیں اور ان کے درمیان عبدالغفار صاحب کا خاندان جو خود اپنے ہی وطن میں پناہ گزیں بنا دیا گیا ہے، خاموش بسا ہوا اپنے نوشتۂ تقدیر کا انتظار کر رہا ہے۔

اس طرح کی مثالیں اس علاقے میں بہت ملیں گی۔ یہ دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ نئی دہلی کے حکمراں نعرہ لگا رہے ہیں کہ وہ ملک کی بدحالی کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر بدحالی کا خاتمہ دستور میں تبدیلی یا پریوی پرس کے خاتمہ سے نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کا راستہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ حق داروں کو ان کے حقوق دیئے جائیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے الفاظ میں ضعیف اس وقت تک حکومت کی نظر میں قوی ہو جب تک اس کا حق نہ دلا یا جائے اور قوی اس وقت تک حکومت کی نظر میں ضعیف ہو جب تک اس سے دوسرے کا حق وصول نہ کر لیا جائے۔ ملک کو برائی سے پاک کرنے اور اس کی بدحالی کو دور کرنے کا واحد راستہ یہی ہے باقی جو کچھ ہے، وہ سب نعرے بازی ہے۔

۲۴ر جنوری کی صبح کو میں رسواڑہ گیا اور وہاں شری کلونت سنگھ (۲۵ سال) سے ملاقات کی، جو

عبدالغفار صاحب کی سابق زمین اور مکان پر بسے ہوئے ہیں۔ یہ ہائر سکنڈری تک تعلیم حاصل کئے ہوئے ہیں۔ اس وقت ان کے پاس ۲۰ ایکڑ بہترین زمین ہے۔ انھوں نے آب پاشی کے لئے پمپ بھی لگایا ہے۔ انھیں ایک کامیاب کسان کہا جا سکتا ہے۔

"ملک میں غلّہ کی کمی کیوں ہے" میں نے کلونت سنگھ سے سوال کیا۔

"بے ایمانی" انھوں نے فوراً جواب دیا۔ ان کا خیال ہے کہ گورنمنٹ نے کسانوں کے لئے جو سہولتیں جاری کی ہیں، وہ محض دھوکا ہیں۔ کیونکہ رشوت خور اور نااہل عملہ کی وجہ سے اس کا فائدہ عام کسانوں کو نہیں پہنچتا۔ البتہ عام کسانوں کے نام پر بڑے بڑے نیتا اور وزیروں کے رشتہ دار خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ "میں تو خود اپنے اوپر بھروسہ کرتا ہوں۔ میں نے انجن اپنے پیسہ سے خریدا ہے، گورنمنٹ سے قرض نہیں لیا۔ اگر میں گورنمنٹ کے قرض کے چکر میں پڑتا تو دو ہزار کی چیز چار ہزار میں پڑتی۔" انھوں نے کہا۔

ہندستان میں گھومتے ہوئے اکثر میں ایک عجیب احساس سے دوچار ہوتا ہوں۔ عوامی مقامات ہوں یا سرکاری دفاتر، ہر جگہ ایک ہی شکایت سننے میں آتی ہے اور وہ وہی ہے جس کو مسٹر کلونت سنگھ نے "بے ایمانی" سے تعبیر کیا ہے۔ میں سوچتا ہوں اگر ہر شخص کو بے ایمانی کی شکایت ہے تو وہ کون ہے جو بے ایمانی کر رہا ہے۔ اگر سب بے ایمانی کا شکار ہیں تو وہ کون ہے جو سب کو شکار بنا رہا ہے۔

۲۴ جنوری کو ہم یہاں سے واپس ہوئے تو بالقصد میں نے سڑک کا راستہ چھوڑ کر پہاڑی کا راستہ اختیار کیا تاکہ براہ راست اس دنیا کا تجربہ کرسکوں جو کیمرہ کی نگاہ میں بے حد حسین، مگر عملی زندگی کے لئے انتہائی پر مشقت ہے۔

یہاں مسافر جب نیچی گھاٹیوں، اونچی چٹانوں اور ناہموار راستوں میں گم ہوتا ہے، تو اس کے لئے صرف ایک ہی حسین اور مسطح چیز باقی رہتی ہے اور وہ سر کے اوپر پھیلا ہوا نیلا آسمان ہے۔ دیوی کے کنڈ پر بیٹھ کر جب میں نے آس پاس کی دنیا پر نظر ڈالی تو حد نظر تک کہیں بھی تمدن کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔ ہم پانچ انسانوں کا قافلہ پتھروں کی اس سنسان دنیا میں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہم زمین پر نہیں، بلکہ چاند یا مریخ پر ہیں، جہاں خاموش فطرت کے سوا کوئی ہمارا استقبال کرنے والا نہیں۔

پہاڑیوں کے دامن میں جگہ جگہ سوکھے کنوئیں اور گری پڑی دیواروں کی شکل میں قدیم بستیوں کے نشانات نظر آتے ہیں۔ یہ ختم شدہ آبادیاں نہیں ہیں، بلکہ وہ آبادیاں ہیں جن کے باشندے پہاڑ

سے اتر کر میدانوں میں آباد ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے ان کی زندگی کا ذریعہ بھیڑ بکریاں تھیں جن کی پرورش کے لئے پہاڑی مقامات زیادہ موزوں تھے۔ مگر زمانہ کی تبدیلی سے جب ان کے اندر کھیتی باڑی کا شوق پیدا ہوا تو وہ میدانوں میں اتر آئے۔

اگر کوئی چاہتا کہ تقریریں کر کے ان کو پہاڑوں سے اتار دے تو یہ ناممکن تھا۔ مگر زندگی کے حقائق نے جب زور کیا تو کسی قانون اور کسی تقریر کے بغیر وہ اپنے مالوف گھروں کو چھوڑ کر ہموار میدانوں میں آبسے۔

پُرمشقت چڑھائی کے بعد ہم قدرت کے اس سنگی مینار کے اوپر پہنچ گئے جس کو مقامی زبان میں "کالا پہاڑ" کہتے ہیں۔ یہاں بیٹھ کر راجستھان کے وہ میدان ہمارے سامنے تھے جو حد نظر تک بنجر پڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آزادی کا انقلاب بھی ان کو سرسبز نہ کر سکا۔

پہاڑی پر لڑکے اور لڑکیاں لکڑی کے گٹھر سر پر لئے ہوئے نیچے اترتے ہوئے نظر آئے۔ ڈیڑھ دو روپیہ کی لکڑی ان کی پوری دن بھر کی کمائی تھی۔ یہاں وقت کتنا سستا ہے۔ جو لوگ "پتھر" کی اس دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں ان کے متعلق یہ امید کرنا کہ وہ زندگی کے کسی شعور سے بہرہ مند ہوں گے، محض ایک لاحاصل امید ہے۔

"کالا پہاڑ" کی آخری بلندی پر پہنچنے کے بعد پہاڑ کا احساس ختم ہو جاتا ہے، یہاں لگ بھگ تین میل کی چوڑائی اور تقریباً ۵ ۲ میل کی لمبائی میں پھیلا ہوا ہموار میدان ہے جس کے اوپر اگے ہوئے جنگلی درخت ہی پہاڑ کا احساس دلاتے ہیں۔ چاروں طرف آسمان کے سروں تک ہموار میدان پھیلا ہوا ہے۔

اس میدانی چوٹی پر بہت سے بڑے بڑے کام کئے جا سکتے ہیں ۔ فارسٹ کالج۔ جڑی بوٹیوں کی ریسرچ کا سنٹر، اسپتال، صحت گاہ، شہد کی مکھیاں پالنے کا فارم، پولٹری فارم وغیرہ اور ان کے ذریعہ سے یہاں کے ہزاروں لوگوں کو روزگار دلا کر اس پچھڑے ہوئے علاقہ کو بلند ترین ترقی کے مقام پر پہنچایا جا سکتا ہے۔ مگر یہ سب کام کون کرے۔

پہاڑ کی اس "پشت" پر ایک چھوٹی سی بستی آباد ہے جس کا نام ہے ڈھڈیاتی۔ یہاں ڈیڑھ درجن "گوال" ہیں جن کی پانچ چھ سو گائیں آباد ہیں۔ برسات میں جب چارہ زیادہ ہو جاتا ہے تو گایوں،

بھینسوں کی تعداد ڈیڑھ دو ہزار تک پہنچ جاتی ہے ۔ یہاں ڈھاک کے پتوں کے بنے ہوئے مویشی گھروں کے طویل سلسلے کے سامنے میں نے دیکھا کہ گوبر کا ڈھیر پڑا ہوا ہے ۔ ہر سال یہاں سینکڑوں ٹرک کھاد تیار ہوتا ہے ۔ مگر سب کا سب ضائع ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ پہاڑ کی بلندی سے نیچے اتارنے کا کوئی ذریعہ نہیں ۔ صرف گدھے یا اونٹ کے ذریعے ان کو نیچے لے جایا جا سکتا ہے جو بہت مہنگا پڑتا ہے ۔ چنانچہ اس کھاد کا انجام یہ ہے کہ وہ یا تو برسات میں بہہ جاتی ہے یا گوالوں کے کبھی ختم نہ ہونے والے الاؤ میں جلتی رہتی ہے جو کھانا پکانے کے علاوہ سردیوں میں تاپنے کا کام دیتے ہیں اور گرمیوں میں دیا سلائی کا ۔

مویشیوں کی کھاد انتہائی قیمتی کھاد ہوتی ہے ۔ مگر یہاں ہر سال سینکڑوں ٹرک کھاد اس طرح مسلسل ضائع ہو رہی ہے جیسے اس کی کوئی قیمت ہی نہیں ۔

کالا پہاڑ کو عبور کر کے اور تقریباً ۸ میل کی پر مشقت مسافت طے کر کے ہم دوسری طرف ہریانہ کے میدان میں اترے ۔ یہاں پہاڑ کے دامن میں بسے ہوئے ایک گاؤں حسن پور بلونڈا میں رات گزاری ۔ یہ میوؤں کا گاؤں ہے ۔ یہاں بجلی آچکی ہے اور میوؤں کے سات ٹیوب ویل لگے ہوئے ہیں ۔ عام طور پر لوگ اچھی کھیتی کرتے ہیں ، گاؤں کو جدید زراعت کے دور میں داخل کرنے کا سہرا زیادہ تر محمد یوسف خاں صاحب کے سر ہے ۔ جنھوں نے بجلی آنے کے بعد سب سے پہلا ٹیوب ویل لگایا اور نئے طریقوں کو استعمال کر کے معیاری کھیتی کر رہے ہیں ۔

میوات میں پردہ کا کوئی تصور نہیں ۔ ہل جوتنے کے سوا تمام معاملات میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش کام کرتی ہیں ۔ اگر آپ کسی کے یہاں مہمان ہوں تو آپ کو تعجب نہ کرنا چاہئے اگر آپ کا میزبان آپ کو زنان خانہ کے عین اس مقام پر لے جا کر کھانا کھلائے جہاں قریب ہی ایک کھلی کوٹھری میں عورتیں کھانا پکانے میں مشغول ہوں ۔ بستی کے اندر اور گھروں کے باہر عام طور پر عورتیں کام کاج کے لئے ادھر ادھر آتی جاتی نظر آتی ہیں اور یہ صرف غریب خاندانوں کا حال نہیں بلکہ خوشحال خاندانوں کا حال بھی یہی ہے ۔ اگر عریانی اور جسمانی نمائش کو مستثنیٰ کر لیا جائے تو یورپ کی عورت اور میوات کی عورت میں کوئی فرق نہیں ۔

مگر عام طور پر سماجی زندگی میں اس سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی ۔ عورتوں کا انتہائی سادہ بلکہ غیر خوش وضع لباس اور اسی کے ساتھ ان کا مکمل طور پر ڈھکا چھپا ہونا اور ان سب پر غض بصر ، یہ

چیزیں مل کر پردہ کی ضرورت کو اس حد تک پورا کر دیتی ہے کہ مشکل ہی سے کسی واقعی خرابی کی امید کی جا سکتی ہے۔

۲۵ جنوری کی صبح کو جب کہ ہم بلونڈا میں آگ کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے، ایک چرواہا بکریوں کا ریوڑ لے کر نکلا۔ اس کو دیکھ کر ایک میو نے کہا:

"بنیا کا بیاج بکری روکتی ہے۔"

یہ جملہ میوؤں کی زندگی کی بہت عمدہ تصویر ہے۔

میوؤں کے یہاں اقتصادیات کا روایتی مفہوم صرف یہ ہے کہ ضروریات کے لئے بنیا سے سودی قرض لیتا رہے اور جب اصل اور سود کی رقم مل کر اتنی بڑھ جائے کہ اس کا قدیم طرز کا "زمیندارہ" بھی اس سے گلو خلاصی کے لئے ناکافی ہو تو وہ اپنے ایک لڑکے کو بکریوں پر لگا دے، اور وہ جنگلوں میں بکریاں پال کر قرض کی ادائگی کرے۔ یہی صورت کسی اور قوم میں ہوتی تو شاید مثل یوں ہوتی کہ "بکری دولت ہے۔" مگر سادہ لوح میو کو بیاج کی ادائگی کے سوا اقتصادیات کا کوئی اور مفہوم نہیں معلوم۔ اس کے یہاں بکری اپنی مثبت ترقی کا ذریعہ نہیں بلکہ بنیا کے بیاج سے چھٹکارا پانے کا ذریعہ ہے کیسا عجیب ہے زندگی کا یہ تصور۔

محمد یوسف خاں صاحب نے بتایا کہ ایک سو بکری اگر پالی جائیں تو ایک سال میں لگ بھگ چار ہزار روپے منافع دے گی اور سو بکری کی اصل تعداد پھر بھی باقی رہے گی۔ لطف یہ کہ اس نفع بخش کاروبار پر ایک "چرواہہ" کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ چارہ کی تمام ضرورت پہاڑوں کے ذریعہ حاصل ہو جاتی ہے۔ صبح سویرے "چرواہہ" بکریوں کا ریوڑ لے کر پہاڑ پر چڑھ جاتا ہے اور سارے دن چراتا رہتا ہے۔ شام کو سورج ڈوبتے ڈوبتے واپس آ کر انھیں باڑہ میں بند کر دیتا ہے۔

ان چرواہوں کی صحتیں بہترین ہوتی ہیں، کیونکہ جنگل میں دن کا کھانا اور پانی کے لئے ان کے پاس بافراط بکریوں کا دودھ ہوتا ہے۔ پہاڑوں کی اہرامی ڈھلوان پر اور درختوں کے جھرمٹ میں رنگ برنگی بکریوں کا گزرنا، اور چرواہے کی طرح طرح کی آوازیں عجیب رومانوی منظر پیدا کر دیتی ہیں اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے قدرت کی وسیع "اسکرین" پر کوئی حسین فلم دکھائی جا رہی ہو۔

میو قوم اگر شادیوں کی فضول خرچی اور قرض اور سود کے چنگل سے نکل آئے تو اپنی محنت اور اپنے جغرافیہ سے فائدہ اٹھاکر زبردست اقتصادی قوم بن سکتی ہے مگر ابھی تک وہ شعوری اعتبار سے اتنا پیچھے ہے کہ اسے خود اپنے امکانات کا حال نہیں معلوم۔

۲۵ جنوری ۱۹۷۱ کی شام کو میں دہلی واپس آگیا۔

آٹھواں سفر

مالب ، دلی ۔ الورروڈ پر واقع ایک بڑا قصبہ ہے ۔ ۱۲ جون ۱۹۶۹ کو یہاں جمعیۃ علماء گوڑگاؤں کی مجلس عاملہ کا اجتماع تھا۔ ارکان عاملہ کے علاوہ ضلع کے مختلف مقامات سے دیگر علماء کو بھی خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ مدرسہ فیض الاسلام کی وسیع اور پرفضا مسجد میں نماز عشاء کے بعد نشست ہوئی ۔

تلاوت قرآن کے بعد جناب مولانا نیاز محمد صاحب نے افتتاحی تقریر فرمائی۔ اس کے بعد مجھ سے فرمائش کی گئی کہ میں اپنے خیالات پیش کروں۔

میں نے کہا کہ اہل علم کے اس مجمع میں میری سعادت تو یہ تھی کہ میں سننے والوں میں ہوتا۔ مگر حکم ہے کہ میں سنانے والوں میں بنوں اور معلوم ہے کہ جب " ادب" اور " امر" میں ٹکراؤ ہو تو فوقیت امر کو دینی پڑتی ہے ۔ تاہم اس وقت میں جو کچھ کہوں گا اس کا مقصد آپ کو کچھ بتانا نہیں ، بلکہ اپنے خیالات کو آپ کو سامنے رکھنا ہے تاکہ اگر میں صحیح ڈھنگ پر سوچ رہا ہوں تو آپ اس کی توثیق و تائید فرمائیں اور اگر میں غلط سوچ رہا ہوں تو اس کی تصحیح فرمائیں۔

اس کے بعد میں نے ہندستانی مسلمانوں کے مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ پہلی بات مجھے یہ ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ہم اپنے مصائب کے لئے دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرانے کا ذہن ختم کر دیں۔ میں نے کہا کہ حال کو ماضی سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اگر ہمیں مستقبل میں اپنے کو ناکامی سے بچانا ہے تو ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہماری ماضی کی غلطیوں نے ہمارے موجودہ نتائج پیدا کئے ہیں تاکہ اب ہم اپنی اصلاح کر کے نئی جد وجہد صحیح لائنوں پر شروع کر سکیں۔ اسی طرح دوسری بات جس کو اچھی طرح جان لینا چاہئے وہ یہ کہ ہر دور کی کچھ طاقتیں ہوتی ہیں جو اس زمانہ میں مؤثر ہوتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ زمانہ کے معیار کے مطابق اپنے کو طاقت ور بنایا جائے۔ جب تک آپ ان طاقتوں کے مالک نہ ہوں جو زمانہ میں طاقت کا مقام حاصل کر چکی ہیں۔ اس وقت تک کوئی بھی دوسری تدبیر آپ کو عزت و سربلندی دینے کے لئے کارگر نہیں ہوسکتی۔

پھر میں نے کہا کہ ملّت کو سربلند کرنے کے لئے سب سے پہلے خود ملّت کو بنانے کی ضرورت ہے۔ ہمارے یہاں عالم یہ ہے کہ ایک شخص کو کسی معاملہ میں ذرا سا بھی کسی سے اختلاف پیدا ہوتا ہے تو وہ اس کا جانی دشمن بن جاتا ہے۔ جب تک ہمارے افراد میں کیرکٹر نہ ہو اور انہیں مل کر رہنا نہ آتا ہو کوئی اجتماعی کام سرے سے انجام نہیں دیا جاسکتا۔ پھر جب یہ ابتدائی چیز ہی ہمارے درمیان موجود نہیں ہے تو ہم کوئی اگلا کام کس طرح کرسکتے ہیں۔

پھر میں نے کہا کہ یہ بھی ہمیں اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ ملّت کی تعمیر کا کام شاخ گاڑنا نہیں بلکہ بیج بو کر باغ تیار کرنے کا کام ہے، اس میں صبر اور انتظار کا حوصلہ درکار ہے۔ اگر ہمارے اندر جلد بازی ہو تو ہم کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

اس موقع پر ایک ہی جگہ میوات کے کئی مقامات کے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔

ہماری واپسی سوہنا کے راستہ سے ہوئی۔ سوہنا دراصل ضلع گوڑ گاؤں کا ایک قصبہ ہے۔ وہ دہلی سے تقریباً پچاس کیلو میٹر پر واقع ہے۔ اور مجوزہ قومی دار السلطنت کا حصہ ہے۔ دہلی کی آبادی کو لگ بھگ پچاس لاکھ تک محدود رکھنے کے لئے اس کے آس پاس کی ریاستوں (اتر پردیش، ہریانہ، راجستھان) کے ۷ ضلعوں کو قومی دار السلطنت میں شامل کیا گیا ہے۔ تقریباً دو ارب روپے خرچ کرکے ان ضلعوں کو ترقی دی جائے گی تاکہ دہلی کی فاضل آبادی کو وہاں کھپایا جائے۔ نیز صنعتی اداروں کو پھیلایا جاسکے۔

سوہنا، ایک تاریخی قصبہ ہے جو دہلی سے تقریباً پچاس کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے یہ مقام مسلمانوں کا مرکز تھا۔ اطراف کے دیہاتوں میں اب بھی مسلمان (میو) کثرت سے آباد ہیں۔ مگر قصبہ کی مسلم آبادی منتشر ہو چکی ہے۔ قدیم دور کی یادگار کئی مسجدیں اور عمارتیں بھی موجود ہیں مگر اب وہ تقریباً غیر آباد حالت میں پڑی ہوئی ہیں۔ چھ سو سال پہلے شہنشاہ اکبر (۱۶۰۵-۱۵۴۲) کے زمانہ میں راجہ سانول سنگھ نے یہاں موجودہ بستی بسائی۔ اکبری عہد میں سوہنا (Sohna) ضلع دہلی کا ایک حصہ تھا۔ آج بھی وہ قومی دار السلطنت میں شامل ہے۔

سوہنا، موجودہ ریاست ہریانہ کے علاقہ میوات میں واقع ہے۔ یہ علاقہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی کا مرکز تھا۔ میوؤں نے انگریزوں کے مقابلہ میں غیر معمولی

بہادری دکھائی۔ مگر انھیں شکست ہوئی۔ اس جنگ میں ہزاروں میو قتل ہوئے، ان کے گاؤں جلا دئے گئے۔ ان کی فصلیں ویران ہوگئیں، سہنا کی بارہ کھمبا مسجد کو انگریزوں کا ریسٹ ہاؤس بنا دیا گیا۔ انگریزوں کے مقابلہ میں میووں کے شکست کی وجہ، ایک میواتی مورخ کے الفاظ میں، یہ تھی کہ " انگریزوں کے پاس نئے اور بہتر قسم کے ہتھیار تھے اور میوؤں کے پاس پرانے قسم کے ہتھیار"۔ (میو قوم اور میوات، ۱۴۳)

آج بھی مسلمانوں کی بنیادی کمزوری یہی ہے۔ ضرورت ہے کہ یہاں ماضی کے کھنڈروں پر دوبارہ ایک ایسا مرکز قائم کیا جائے جو مسلمانوں کو ذہنی پس ماندگی کے دور سے نکالے اور ان کو اس قابل بنائے کہ وہ جدید دور میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرسکیں۔

دہلی سے سہنا جائیں تو بستی کے باہر سب سے پہلے ایک قلعہ نما مسجد آپ کا استقبال کرتی ہے۔ اس کا بلند جائے وقوع پس منظر میں اراولی پہاڑ، ایک طرف آبادی اور دوسری طرف حد نظر تک پھیلے ہوئے کھیت، قدرتی مناظر کی دنیا میں ہوتے ہوئے سڑک اور تمدنی سہولتوں سے قریب، ان چیزوں نے اس مسجد کو غیر معمولی حسن اور عظمت عطا کر دی ہے۔ پتھروں سے بنی ہوئی یہ مسجد چھ سو سال قبل ۱۳۸۱ء میں تعمیر کی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک قدیم طرز کی بارہ دری بھی ہے۔ اسی نسبت سے اس کا نام بارہ کھمبا کی مسجد ہے۔

تاہم اس وقت مسجد کافی خستہ حالت میں ہے۔ اس کی ماضی کی عظمت کو از سر نو واپس لانے کے لئے اس میں کافی تعمیری کام کرنے ضروری ہیں:

۱. مسجد کے چاروں طرف احاطہ بندی۔ مسجد کے اطراف کی خالی زمین کا بڑا حصہ مسجد کے قبضہ سے نکل چکا ہے۔ اب اس کی بچی ہوئی زمین کو محفوظ کرنے کے لئے پہلا کام یہ ہے کہ اس کے چاروں طرف مضبوط دیوار بنا دی جائے۔

۲. مسجد کی مرمت۔ سیکڑوں برس سے مسجد کی کوئی مرمت نہیں ہوسکی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اندر سے پلاسٹر اور باہر سے ٹیپ کرا دی جائے تاکہ اس کی مضبوطی اور استحکام کی ضمانت ہوسکے۔

۳. مسجد سے متصل چند کمروں کی تعمیر، جہاں کتب خانہ اور اصلاح و دعوت کے دوسرے

شعبے قائم ہوں اور کارکنوں کے قیام کا انتظام کیا جاسکے۔

۴. فرش پوری مسجد میں سائبان سے لے کر صحن تک۔

۵. مسجد کے کنارے اس کے اونچے پشتے مسلسل کٹ رہے ہیں اور مسجد کی بنیاد کو کمزور کر رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کو درست کر کے درخت لگا دیے جائیں تاکہ اس کی بنیادیں مضبوط ہو جائیں۔

نواں سفر

گوڑگاؤں کی شان دار جامع مسجد کے بالمقابل ایک دو منزلہ مکان کے سامنے ایک چھوٹا سا بورڈ لٹک رہا ہے جس پر لکھا ہوا ہے:

چودھری طیب حسین خان (ایم، ایل، اے) ایڈوکیٹ۔ یہ چودھری محمد یٰسین خاں صاحب کے صاحب زادے ہیں جو میوات کے علاقہ میں قومی اصلاحی کام کے سلسلے میں ایک ممتاز نام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۸ ستمبر ۱۹۶۹ء کی صبح کو مولانا عبدالرحیم کی معیت میں چودھری طیب حسین خاں سے میری پہلی ملاقات ہوئی اور تین گھنٹے تک جاری رہی۔

چودھری طیب حسین خاں ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے نوح میں ہائی اسکول پاس کیا۔ اس کے بعد علی گڑھ اور پنجاب یونی ورسٹی سے بی۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ انھوں نے جس خاندان میں آنکھ کھولی وہ شروع سے سماجی خدمت اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ چنانچہ طالب علمی ہی کے زمانہ سے سیاست میں حصہ لینے لگے۔ ۱۹۶۱ء میں جب انھوں نے تعلیم سے فراغت حاصل کی تو وہ اپنے گاؤں کے سرپنچ بن چکے تھے۔ ۱۹۶۲ء میں وہ نوح بلاک کے چیرمین تھے اور اسی سال پہلی بار فیروز پور جھرکہ سے کانگرس کے ٹکٹ پر پنجاب کے الکشن میں کھڑے ہوئے۔

چودھری طیب حسین خاں سے زیادہ تر میوات کے مسائل پر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ میو قوم شعور کے اعتبار سے زمانہ سے بہت پیچھے ہے۔ مثلاً وہ نہیں جانتے کہ موجودہ زمانہ میں تعلیم کی کیا اہمیت ہے۔ اسی طرح وہ زراعت کے سوا کسی اور ذریعہ معاش کو نہیں جانتے۔ وہ ابھی تک اس واقعہ سے "بے خبر" ہیں کہ زمانے نے زراعتی دور سے نکل کر صنعتی دور میں قدم رکھ دیا ہے۔ آج بھی وہ یہی سمجھتے ہیں کہ معاش کا سب سے بڑا اور اصلی ذریعہ زمین ہے۔ میں نے کہا کہ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ میو قوم کا سب سے بڑا حصہ مفلس ہے۔ کیوں کہ زمینی پیداوار کے علاوہ بے شمار چیزیں جن کو انھیں بازار سے خریدنا ہوتا ہے، ان کا سارا کاروبار دوسروں

کے قبضہ میں ہے اور اس طرح ان کی زمینی پیداوار کی کمائی بازار کی خریداری کے راستے دوسروں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔

طیب حسین خاں صاحب کے والد چودھری یٰسین خاں صاحب بھی اس وقت گفتگو میں موجود تھے۔ انھوں نے کہا "اصل بات یہ ہے کہ دین کا کوئی کام ہو یا دنیا کا، دونوں کی گاڑی جس پہیہ سے چلتی ہے وہ پیسہ ہے۔"

چودھری طیب حسین خاں صاحب نے کہا کہ اصل مسئلہ یہی ہے۔ بیشتر میو خاندانوں کا یہ حال ہے کہ ان کے پاس پیسہ نہیں ہے جس سے وہ اپنے بچوں کو تعلیم دلا سکیں یا ان کو تجارت پر لگا سکیں۔ ان کی زمین کا حال یہ ہے کہ اس کا سارا انحصار آسمانی بارش پر ہے۔ اگر بارش ہوگئی تو کام چل گیا اور بارش نہ ہوئی تو میو کسان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ مہاجن سے سودی قرض لے کر اپنی ضرورتیں پوری کرے۔

ان کا خیال ہے کہ میواتیوں کے مسئلہ کا حل یہ ہے کہ ان میں دست کاری کو رواج دیا جائے۔

درمیان ملاقات میں ایک اور صاحب آگئے۔ تعارف کے بعد معلوم ہوا کہ یہ ولی محمد صاحب ہیں، جو قصبہ نوح میں وکالت کرتے ہیں اور میو ہائی اسکول کے آنریری سکریٹری ہیں۔ ان سے بھی مفید باتیں رہیں۔ یہ ہفت روزہ الجمعیۃ بہت شوق سے پڑھتے ہیں اور اس کے قدر دانوں میں سے ہیں۔

اپنی روایتی شرافت اور سماجی خدمات کی وجہ سے چودھری طیب حسین خاں کے خاندان کا سیاسی ریکارڈ شاندار رہا ہے۔ ان کے والد چودھری یٰسین خاں ۱۹۵۲ء میں ریاستی اسمبلی کے انتخاب میں بلا مقابلہ کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۵۷ء کے الکشن میں وہ ۱۵ ہزار ووٹوں سے جیتے۔ ۱۹۶۲ء کے الکشن میں ان کے لڑکے چودھری طیب حسین خاں نے اپنے حریف کو دس ہزار ووٹوں سے ہرا کر کامیابی حاصل کی۔

۱۹۶۲ء کے الکشن میں کامیابی کے بعد چودھری طیب حسین خاں کیروں منسٹری میں صحت اور پی ڈبلیو ڈی کے محکمہ کے وزیر ہوئے اس وقت چودھری صاحب کی عمر صرف ۲۶ سال تھی۔ اور وہ ملک کے سب سے کم عمر وزیر تھے۔

میوات کے علاقہ کے سفر کے دوران میں نے محسوس کیا کہ چودھری صاحب کے بارہ میں عام طور پر لوگوں کی اچھی رائے ہے۔ اس کی وجہ جیسا کہ لوگوں نے بتایا، یہ ہے کہ چودھری صاحب نہ صرف یہ کہ شریف آدمی ہیں، بلکہ وہ مسلم دوست آدمی ہیں۔ معاملات میں کسی مصلحت کا خیال کئے بغیر ایک "پٹھان" کی طرح حق کی حمایت کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی مختصر دس ماہہ وزارت کے دوران بہت سے سماجی کام کئے۔ مثلاً سوہنا سے نوگانوں تک سڑک چوڑی کرائی۔ کئی اسکول اور اسپتال بنوائے۔ وغیرہ۔

مگر یہ بھی عجیب قصہ ہے کہ پچھلے دو الکشنوں میں انھیں شکست اٹھانا پڑی۔

"جب آپ کا بیک گراؤنڈ اتنا اچھا ہے تو پھر شکست کی وجہ کیا تھی" میں نے چودھری صاحب سے اپنی ملاقات میں دریافت کیا۔

"کچھ نہیں۔ بس چینج (تبدیلی) کی خواہش۔ مجھ پر کس قسم کی نا اہلی کا کوئی الزام نہیں مگر ہماری قوم کے لوگ یوں سوچتے ہیں "کیا ہمیشہ ایک ہی ایم ایل اے رہے گا" بس اس قسم کے خیالات ہیں جنھوں نے مجھے شکست دی۔

چودھری صاحب اگرچہ الکشن ہار گئے ہیں مگر اب بھی اہل حاجت ضروریات کے لئے انھیں کے پاس آتے ہیں۔ میری تین گھنٹہ کی ملاقات کے دوران چودھری صاحب کو بار بار اٹھنا پڑا۔ کیوں کہ کبھی کہیں سے ٹرنک کال آرہا ہے۔ کبھی کوئی ملنے کے لئے آیا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چودھری صاحب کے متعلق لوگوں کا احساس ہے کہ وہ ملت کا درد رکھتے ہیں۔ ان کے اندر جذبہ ہے کہ لوگوں کے مسائل حل کریں۔ اسی کے ساتھ اثر و رسوخ کے اعتبار سے بھی میوات کے مسلمانوں میں وہ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

میوات میں ایک مثل مشہور ہے۔

" میوُ مرا جب جانیو جب تیجا ہو جائے"

یہ میوُ قوم کی صحیح تصویر ہے۔ میوُ ایک بے حد بہادر اور جفاکش قوم ہے۔ بڑی سے بڑی مار اور بڑے سے بڑے مصائب کو سہہ کر نکل آتا ہے۔ اگر اس قوم کی قوتوں کو استعمال کیا جاسکے تو اس سے اسی طرح کی ایک جاندار قوم ابھر سکتی ہے جیسے کہ جاپانی یا چینی یا جرمن

قوم۔

اس علاقہ میں سڑک اور بجلی کے پھیلاؤ نے نئے نئے کام پیدا کر دئے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس سرمایہ ہے وہ ٹیوب ویل اور ٹریکٹر اور دوسری مشینیں لگا رہے ہیں۔ مگر اس ترقی نے بے سرمایہ لوگوں کے لئے بھی نئے نئے کام فراہم کر دئے ہیں۔ خاص طور پر مشینوں کے پھیلاؤ نے مکینک کی ضرورت بہت بڑھا دی ہے، اس علاقہ کے نوجوان ٹکنیکل ٹریننگ حاصل کریں تو وہ علاقے میں بہترین معاش کے مواقع پا سکتے ہیں۔

کھدری جمال پور سے زکوپور جاتے ہوئے میں نے دیکھا کہ سڑک کے دونوں طرف مختلف کھیتوں میں ایک خاص طرح کے پودے اُگے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ "ڈھینچا" کہا جاتا ہے۔ شروع بارش میں جولائی کے زمانہ میں اسے بوتے ہیں۔ وہ تیزی سے بڑھتا ہے اور چند مہینے میں قدآدم برابر ہو جاتا ہے۔ دسمبر میں اسے کاٹ لیتے ہیں۔

مجھے بتایا گیا کہ اس کا خاص فائدہ یہ ہے کہ وہ بے کار اور نکمی زمین کو زرخیز بناتا ہے اور کھیت کو طاقت ور کر دیتا ہے۔ اس کے درخت کے کئی استعمالات ہیں۔ لیکن اگر اس پر ہل چلا کر کھیتوں میں اسے چھوڑ دیا جائے تو کھیت کی زرخیزی میں غیر معمولی اضافہ ہوتا ہے۔ تاہم اس کی کاشت مجھے صرف میوات میں نظر آئی۔

دہلی میں ایک بزرگ "پیر برنا" کے نام سے مشہور ہیں۔ یہاں صدر بازار کے علاقہ میں ایک گلی برنا ہے، اس گلی میں، پچھلے تقریباً ۲۰ سال سے مقیم رہنے کی وجہ سے ان کا یہ نام چل پڑا ہے۔ یہ مولانا رحمت اللہ صاحب بھرت پوری ہیں۔ جو اپنے مخصوص اوصاف کی بنا پر ہر فرقہ کے لوگوں کا مرجع بنے ہوئے ہیں۔ اگر آپ صبح کے وقت برنا گلی میں جائیں تو حاجت مندوں کا جوق در جوق ہجوم اس چھوٹی سی مسجد کا طواف کرتا نظر آئے گا جس کے ایک حجرہ میں مولانا رحمت اللہ صاحب مقیم ہیں۔ اس ہجوم میں اکثریت غیر مسلموں کی ہوتی ہے۔

مولانا رحمت اللہ صاحب میواتی ہیں۔ ہفت روزہ الجمعیۃ میں میوات کے سفر کی جو روداد یں شائع ہو رہی ہیں اس کے خصوصیت سے قدرداں ہیں۔ ایک ملاقات میں انھوں نے کہا:

"ضرورت ہے کہ میوات کے ہر چوراہہ اور ہر بس اڈہ پر لاؤڈ اسپیکر لگا دیا جائے اور

ان مضامین کو پڑھ کر سنایا جائے"۔

انھوں نے کہا کہ اگر یوں اخبار میں دیا جائے تو وہ لوگ کم ہی مطالعہ کی طرف مائل ہوں گے"۔اخبار والے تو لکھتے ہی رہتے ہیں، یہ کہیں گے اور اخبار ایک طرف ڈال دیں گے۔ لیکن اگر ان قیمتی باتوں کو لاؤڈ اسپیکر کی آواز بنا دیا جائے تو ہر سننے والا متوجہ ہوگا۔ انھوں نے اپنی میواتی زبان میں کہا، اس کو سُن کر میو کہیں گے:

" دیکھو! ریڈیو بول رہو ہے میون کے لئے ای قوم پھر بھی بیدار نا ہووے"۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کی زبان سے یہ الفاظ سُن کر میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ انھوں نے سادگی کے ساتھ ایک ایسی بات کہہ دی جس کے اندر بہت بڑی تبلیغی تدبیر چھپی ہوئی ہے۔

موجودہ زمانہ میں یہ طریقہ عام ہے کہ بڑے بڑے کاروباری لوگ اپنی باتوں کو ریکارڈ میں بھر دیتے ہیں اور پھر اس کو مختلف طریقوں سے بجا کر عوام کے کانوں تک پہنچاتے ہیں۔

یہی طریقہ کسی قوم کو بیدار کرنے کے لئے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مؤثر انداز میں پیغام عمل دینے والے مضامین ریکارڈ کرالئے جائیں اور پھر دکانوں چوراہوں، اسٹیشنوں اور دوسرے اجتماعی مقامات پر ان کو بجا کر سنایا جائے۔ اخبار یا کتاب میں چھپے ہوئے الفاظ کے مقابلے میں انسانی آواز کو لاؤڈ اسپیکر کی آواز بنا دیا جائے تو اس کی تاثیر کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ ریڈیائی لہروں کا یہ فائدہ آج کاروباری اور سیاسی اغراض کے لئے کثرت سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ کاش ہم ملت کے احیاء کے لئے بھی اسے استعمال کر سکیں۔

۱۰ دسمبر کی صبح کو ایک صاحب مجھ سے ملنے کے لئے آئے"۔ آپ میوات سے تشریف لائے ہیں"۔ ان کے ساتھی نے کہا جو نابینا ہونے کی وجہ سے ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔

یہ مولانا عبدالسلام صاحب (پیدائش ۱۹۳۵ء) گوبانہ، ڈاک خانہ نگینہ (میوات) تھے۔ پیدائش سے نابینا ہیں۔ ان کا معمولی حلیہ، نیز بینائی سے محرومی کی بنا پر ابتداءً مجھے گمان ہوا کہ بس سیدھے سادے میواتی ہیں۔ اور یہ تو وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں گے۔ مگر گفتگو کے دوران مسلسل محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے جملے پڑھے لکھے انسان کے جملے ہیں۔

میں کچھ دیر تک ان کو نظر انداز کرتا رہا، مگر بالآخر ان کی عمدہ علمی زبان اور ذہانت کی باتوں نے مجبور کیا کہ میں ان سے تفصیلی حالات معلوم کروں۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اگرچہ آپ بچپن سے نابینا ہیں۔ مگر اپنے شوق علم کی بنا پر پہلے قرآن ناظرہ اور حفظ پڑھا۔ اس کے بعد شکراوہ کے دارالعلوم میں عربی کی تعلیم شروع کی یہاں تک کہ باقاعدہ درس نظامیہ سے فراغت حاصل کی۔

ان کے ساتھی نے بتایا کہ آپ عربی رسائل اور عربی کتب پڑھوا کر سنتے ہیں اور اس درجہ عبور ہے کہ پڑھنے والا اگر اعراب کی غلطی کر جائے تو فوراً ٹوک دیتے ہیں۔

"میں مسلکاً اہل حدیث ہوں" انھوں نے دوران گفتگو میں کہا۔ "لیکن اگر اسلامی مفاد کے لئے ان گروہ بندیوں کو توڑنا ہو تو میں پہلا شخص ہوں گا۔ میں اہل حدیث، حنفی، شافعی، حنبلی وغیرہ لکھنا پسند نہیں کرتا۔ میں تو بس وہی سماکم المسلمین کا قائل ہوں۔ سید الانبیا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہمیں جو نام دیا تھا، اس سے بہتر کوئی نام نہیں۔"

"ہماری ماؤں کی گودیں اچھی ہوں، اور پھر مدارس میں انھیں عمدہ نصاب اپنی تعلیم کے لئے حاصل ہو تو اس وقت ملت اسلامیہ کے گلشن میں بہار آسکتی ہے۔"

ایک گھنٹہ کی گفتگو میں وہ اسی طرح کے جواہر ریزے بکھیرتے رہے اور میں خود بولنے سے زیادہ ان کی باتوں کو سنتا رہا۔ ان کا پیار بھرا انداز تخاطب، عمدہ علمی زبان، معاملات پر مفکرانہ رائے زنی کو دیکھ کر خیال ہوا کہ کیسے کیسے موتی ہماری امت میں دبے ہوئے ہیں۔ مگر ان کو موقع نہیں ملا کہ اپنی شخصیت کا اظہار کر سکیں۔

امریکہ کی ہیلن کلر اور مصر کے طٰہٰ حسین نے نابینا ہونے کے باوجود بڑے بڑے کام کئے۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں کہ وہ فطرت سے اعلیٰ صلاحیت لے کر پیدا ہوئے تھے۔ بلکہ اس کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کو وہ حالات ملے جس میں وہ اپنی فطری استعداد اور شوق کو بروئے کار لا سکیں۔

مولانا عبدالسلام اس وقت دارالعلوم شکراوہ میں مدرس ہیں۔ قرآن کے علاوہ جلالین۔ ابن ماجہ، مشکوٰۃ وغیرہ پڑھاتے رہے ہیں۔ عربی، فارسی، اردو، ہندی میں اچھی استعداد رکھتے ہیں۔

وہ کچھ دیر رہ کر واپس چلے گئے اور میں سوچتا رہا ـــــــ "کاش امت کے ان جواہر کے لئے وہ حالات فراہم ہوسکیں جن میں وہ اپنے شوق اور اپنی صلاحیت کو پوری طرح بروئے کار لاسکیں۔ امت میں کتنے ایسے لوگ ہیں جو بظاہر نا قابل لحاظ معلوم ہوتے ہیں حالاں کہ وہ بڑے بڑے کام انجام دے سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ امت ان کے لئے کام کے مواقع مہیا کر دے"

جس وقت میں ارولی پہاڑ کی بلندی پر کھڑا ہو کر خواجہ موسیٰ کی درگاہ کا منظر دیکھ رہا تھا تو مجھ پر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ ایک طرف پہاڑ، دوسری طرف وسیع پھیلا ہوا میدان جس میں کہیں کہیں کیکر کے درخت اور فصلیں کھڑی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ کہیں کہیں بجلی کے کھمبوں پر دوڑتے ہوئے تار اس قدیم سرزمین کو جدید بنانے کی جدوجہد میں مصروف دکھائی دیتے تھے۔

اس ماحول میں درگاہ کی عظیم خاموش کھڑی ہوئی عمارت کو میں اس طرح دیکھ رہا تھا گویا ہندوستان میں اسلام کی تمثیل کو دیکھ رہا ہوں۔ اگر کیمرہ ہوتا تو میں اس منظر کی تصویر لے لیتا" بے اختیار میری زبان سے نکلا" اور اپنی روداد سفر کو اس تصویر کے ساتھ اخبار میں شائع کرتا"

مگر ہماری اردو صحافت کے پاس نہ ایسے اخبار ہیں نہ ایسے صحافی۔ صحافت موجودہ زمانہ میں ذہنی بیداری کا بہترین ذریعہ ہے۔ ایک ہفت روزہ جو ملی خوراک سے بھرا ہو، ہر ساتویں روز قوم کے تمام افراد تک پہنچے اور ان کو ذہنی غذا دینے اور ان کے جذبات کو جھنجھوڑنے کا کام کرے تو چند برسوں میں انشاء اللہ زبردست نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ مگر اس کام کے لئے ایسے اخبار کی ضرورت ہے جس کی اشاعت لاکھوں میں ہو، اسی وقت وہ کروڑوں کے درمیان پہنچ سکتا ہے۔ وہ آفسٹ میں چھپتا ہو تاکہ جدید معیار کی چھپائی نیز تصویروں اور نقشوں کے ساتھ اسے زیادہ سے زیادہ مزین کیا جاسکے۔ اس کے ایڈیٹر کو ہر قسم کے جدید ترین ذرائع حاصل ہوں۔ وہ ہر جگہ فوری طور پر پہنچ سکے۔ دنیا بھر کی معلومات اپنی میز پر جمع کرنے کی پوزیشن میں ہو۔ مواد کی ترتیب ـــــ اور فراہمی میں وہ جدید آلات ووسائل سے پوری طرح مدد لے سکتا ہو۔

اس قسم کی ملی صحافت وجود میں لانے کے لئے اقتصادی وسائل کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ ہماری قوم آج بھی اس پوزیشن میں ہے کہ وہ اس قسم کے اقتصادی وسائل فراہم کر سکتی ہے۔ مگر ہمارے پاس اپنے اقتصادی وسائل کا مصرف شادیوں کی دھوم ہے یا جذباتی اور ہنگامی نمائشے، کسی ٹھوس تعمیری کام کے لئے قوم سے اس کی امید نہیں کی جا سکتی۔ ایک عظیم امکان کے عین درمیان کھڑے ہوئے ہم اس امکان کو حاصل کرنے سے محروم ہیں۔

میوات کے سفر میں پونہانا سے بڈیڈ جاتے ہوئے میں نے ایک کنواں دیکھا اس کی تعمیرات بول رہی ہیں کہ منصوبہ کے اعتبار سے یہ غیر معمولی طور پر ایک بہت بڑا کنواں تھا، مگر آج وہ بے کار ہے، کیوں کہ اس کا بھاری بھرکم گولا گلاتے وقت ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ اب وہ ایک عظیم ٹیڑھے مینار کی طرح زمین کی گہرائیوں میں اٹکا پڑا ہوا ہے۔

کنویں کے معاملات کے کسی ماہر سے آپ پوچھیں تو وہ بتائے گا کہ کنویں کا گولا جب زمین میں دھنسایا جاتا ہے تو یہ ایک بہت نازک کام ہوتا ہے اور اکثر معمولی واقعات اس کو ٹیڑھا کر دینے کے لئے کافی ہوتے ہیں جب کہ ایک بڑے کنویں کا پتھر کا گولا ایک لاکھ من تک کا ہو سکتا ہے۔

جب گولے پر دباؤ ڈال کر نیچے دھنساتے ہیں تو اس کو اندر کی جانب سیدھا سفر کرنے کے لئے نیچے چاروں طرف یکساں حالات ضروری ہیں اگر گولے کے نیچے ایک طرف معمولی مٹی ہو اور دوسری طرف ایک پونڈ کا ایک کنکرا آجائے تو یہ چھوٹا سا کنکر پورے ایک لاکھ من وزن کے گولے کو ٹیڑھا کر دے گا۔

اگر آپ دیکھیں تو یہی بات قوموں کی تاریخ میں بھی نظر آئے گی۔ ماضی میں اور آج بھی ایسی مثالیں ہیں کہ ایک چھوٹا گروہ اپنے سے بڑے گروہ پر اثر انداز ہونے اور بالادستی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ البتہ اس غیر معمولی نتیجہ کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ حکمت و دانش مندی سے اپنے آپ کو اس موافق مقام پر لے جائیں جہاں قدرت نے چھوٹے سے کنکر کو پہنچایا تھا۔

دسواں سفر

یہ میوات کے لئے میرا دسواں سفر تھا۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۷۱ء کی صبح کو دہلی سے جانا ہوا اور ۲۷ ستمبر کی صبح کو واپسی ہوئی۔

میوات شمالی ہند کے اس خطہ میں واقع ہے جہاں امسال سیلاب نے زبردست نقصانات پہنچائے ہیں۔ میرا سفر میوات کے ہریانہ کے حصہ میں تھا۔ میں جن مقامات سے گزرا اور جہاں جہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا، ان کے نام حسب ذیل ہیں:

گوڑگاؤں، نوح، سوہنا، برکلی، نگینہ، ہپگواں، فیروزپور جھرکہ۔ بلونڈا، بیواں، بڈیڈہ، پوناہانہ، شاہ چوکھا۔

میں نے دیکھا کہ اب بھی اس بدقسمت علاقہ میں پانی بھرا ہوا ہے۔ نہ صرف کھیتوں میں بلکہ آبادیوں میں بھی پانی گھسا ہوا تھا "آزادی کے چوبیسویں سال میں بھی ہم اس مصیبت سے نجات نہ پاسکے۔" میں نے سوچا "جب کہ ہماری قومی حکومت نے سیلاب کنٹرول کے نام سے ایک بہت بڑا محکمہ قائم کر رکھا ہے۔ اور اس پر غریب عوام کے ٹیکسوں کے اربوں روپئے خرچ ہوتے ہیں۔"

اور جلد ہی مجھے اس کا جواب مل گیا۔

ہماری گاڑی دہلی۔ جے پور روڈ پر تیزی سے پھسل رہی تھی۔ سامنے حد نظر تک آسمان کو چھوتی ہوئی پہاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس کے دامن میں ہر طرف ہریالے درخت اور درختوں کے جھنڈ میں کہیں کہیں ابھری ہوئی بستیاں۔ ان مناظر کے درمیان پانی کی پھیلی ہوئی سفید چادر اس کے حسن میں اضافہ کر رہی تھی ——— سیلاب ایک قدرتی عذاب ہے مگر یہ عذاب اس کے لئے ہے کہ جو اس سے دوچار ہو۔ جو شخص اس کا دور سے مشاہدہ کرے، اس کے لئے وہ ایک حسین منظر ہے۔ الا یہ کہ اس کے پہلو میں وہ دردمند دل ہو جو دوسروں کے غم کو اپنا غم بنا لیتا ہے۔

بس یہی میرے سوال کا جواب تھا، وہ لوگ جو سیلاب کنٹرول کرنے کے محکمہ کے مالک

ہیں، ان کے لئے سیلاب صرف " ہیلی کاپٹر کا ایک منظر" ہے۔ وہ ہوائی جہاز پر سوار ہو کر سیلاب کا طائرانہ مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا خارجی مشاہدہ یا میکانیکل معائنہ کرنے والوں کو کیا خبر ہو سکتی ہے کہ سیلاب کس قیامت خیز مصیبت کا نام ہے۔ اور جب ذمہ داروں کو مصیبت کی ہولناکی کا احساس ہی نہ ہو تو وہ اس کے دفعیہ کی کیا کوشش کریں گے۔

اب صرف ایک چیز اس کی ضمانت بن سکتی تھی کہ وہ سیلاب پر کنٹرول کے سلسلہ میں اپنی واقعی ذمہ داریوں کو ادا کریں اور وہ یہ کہ ان کے دل میں مصیبت زدہ عوام کا درد ہوتا۔ مگر خیریت سے اس قسم کی کوئی چیز سرے سے وہاں موجود نہیں ہے۔ مجھے حال میں ایک مقام پر جانے کا اتفاق ہوا، جہاں ڈیڑھ ارب روپیہ کی لاگت سے ڈیم اور بجلی گھر وغیرہ کی اسکیم زیر تکمیل ہے۔ حالیہ سیلاب میں وہاں کا ایک باندھ ٹوٹ گیا۔ ایک شخص اس پر درد و غم کا اظہار کر رہا تھا کہ دوسرا شخص بولا: ——— "اجی غم کیسا، یہ تو ان لوگوں کی لاٹری کھل گئی"۔ یعنی اب نیا باندھ بنے گا۔ اور اس میں متعلق لوگوں کو دوبارہ کمانے کا موقع مل جائے گا۔ ظاہر ہے کہ جہاں درد کی کمی کا یہ عالم ہو وہاں کسی بہتر نتیجہ کی امید کیا کی جا سکتی ہے۔

سیلاب تو ایک وقتی مصیبت ہے جو آتی ہے، اور گزر جاتی ہے۔ مگر میوات کا اس سے بھی زیادہ بڑا سیلاب یہ ہے کہ یہاں کے سادہ لوح لوگ اب بھی ہزاروں برس پہلے کے روایتی ماحول میں رہتے ہیں، جب کہ حصول معاش کا اصل ذریعہ صرف زراعت تھا۔ وہ بھیڑوں کے غول کی طرح گردن جھکائے اپنے " زمینداره" میں مشغول ہیں۔ انھیں خبر نہیں کہ ان کے گرد و پیش کے ذرائع معاش پر صنعت و تجارت کا قبضہ ہو چکا ہے اور جب تک یہاں اپنی جگہ نہ بنائی جائے زمیندارہ پر بھی اپنا قبضہ بحال نہیں رہ سکتا۔

میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں کسی نئے آغاز کے لئے یہاں کے دینی مدارس بہت اچھا رول ادا کر سکتے ہیں۔ دینی مدارس نے تمام تر عوامی چندوں پر انحصار کر رکھا ہے۔ جن میں ان کے اساتذہ اور طلبہ سب مشغول رہتے ہیں۔ لیکن اگر وہ شعور اور حوصلہ سے کام لیں تو ایسے امکانات موجود ہیں جو انھیں چندہ کی "ذلت" سے بھی نجات دلا سکتے ہیں، اور خود قوم کے لئے بھی نئی زندگی کا پیش خیمہ بن سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر اس سفر میں ۲۴ ستمبر کی صبح کو میں نگینہ گیا۔ نگینہ تجارتی اعتبار سے ایک بے حد موزوں مقام ہے۔ دہلی سے جو قومی شاہراہ جے پور اور احمد آباد ہوتی ہوئی بمبئی کو جاتی ہے۔ یہ مقام اس کے کنارے بر لب سڑک کے پاس واقع ہے۔ نگینہ کے اطراف میں چاروں طرف بچاسی گاؤں آباد ہیں جہاں ۹۵ فی صد میو بستے ہیں۔ ان ۸۵ بستیوں کا واحد مارکٹنگ مرکز نگینہ ہے، جہاں کوئی ایک بھی میئو دکان دار نہیں۔ یہ بازار روزانہ میو خریداروں سے بھرا رہتا ہے۔ اگر فی گاؤں بچاس روپیہ کی خریداری کا بھی اوسط لگایا جائے، جب بھی یہاں روزانہ چار پانچ ہزار روپیہ کی خریداری ہوتی ہے۔ وقتی خریداریاں اس کے علاوہ ہیں مثلاً شب برات میں لوگوں کے اندازہ کے مطابق، تمام بستیوں میں کم از کم ایک لاکھ روپے کا سامان جاتا ہے، اسی طرح محرم میں۔ اور عید، بقرعید میں تو اس کی دگنی خریداری ہوتی ہے۔ گویا ان ۸۵ بستیوں کے سادہ لوح زمیندار کم سے کم اندازہ کے مطابق بھی ہر سال کم و بیش دس لاکھ روپیہ یہاں لاکر ڈھیر کر جاتے ہیں۔

نگینہ میں عین شاہراہ کے کنارے ایک مدرسہ قائم ہے جس کا نام دارالعلوم ہے۔ میں نے پیمائش کرائی تو معلوم ہوا کہ سڑک کے کنارے اس کی جو زمین ہے وہ سو اسو گز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں تین درجن دکانیں بن سکتی ہیں اور ان کے اوپر بھی کمرے بنائے جاسکتے ہیں۔

میں نے مدرسہ والوں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ آپ لوگ ایک کوآپریٹو سوسائٹی بنائیے۔ اور اطراف کی ۸۵ بستیوں میں یہ تحریک چلائیے کہ لوگ اس میں فنڈ اکھٹا کریں۔ اور اس کے بعد صرف سوسائٹی کی رقم سے یا امداد لے کر یہاں سڑک کے کنارے ایک بازار تعمیر کیجئے۔ دکانوں کے منافع میں سوسائٹی کے تمام ممبران شریک ہوں گے۔ بازار تعمیر کرکے آپ لوگ خود بھی اس میں دکانیں کھولئے اور ۸۵ بستی کے لوگوں کو بھی آمادہ کیجئے کہ وہ یہاں مختلف چیزوں کی دکانیں قائم کریں۔ چند سال میں انشاء اللہ یہاں ایک زبردست مارکیٹ قائم ہو جائے گا جو نہ صرف ۸۵ بستیوں کے لوگوں کی خوش حالی کا سبب ہوگا بلکہ خود مدرسہ کے اخراجات بھی بڑی حد تک اس سے نکل آئیں گے۔

اس اسکیم کا یہی ایک پہلو نہیں ہے کہ اس سے ایک پس ماندہ اور مفلوک الحال قوم کو

ترقی میں شریک کیا جاسکتا ہے بلکہ اس کے اور بہت سے مفید پہلو ہیں۔ مثلاً موجودہ زمانہ میں مدارس چندہ پر انحصار کرنے کی وجہ سے سماج کے اندر اپنا حقیقی رول ادا نہیں کر پاتے۔ دینی مدرسے حقیقۃً اصلاح امت کے مراکز ہیں مگر چندوں کی وجہ سے ملت کے اندر وہ اتنے بے وقعت بنے رہتے ہیں کہ دعوت و اصلاح کا کام موثر طور پر ادا نہیں کر سکتے۔ ان کے مبلغین کے مواعظ بھی چندہ کی اپیلوں کے ہم معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر وہ کسی بھی درجہ میں خود کفیل ہو جائیں تو ان کو از سر نو ایک وقار حاصل ہو جائے گا اور وہ اپنے مقصد قیام کو زیادہ موثر طور پر ادا کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

اس قسم کے بے شمار مدارس نہ صرف میوات میں بلکہ سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر یہ مدارس اپنے روایتی خول سے باہر آجائیں اور کوآپریٹو سوسائٹی اور کوآپریٹو اسٹور کی قسم کی اقتصادی اسکیمیں چلانے لگیں تو نہ صرف یہ کہ وہ باعزت معاش حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں گے بلکہ بالواسطہ طور پر خود اس دینی مقصد کے لئے بھی کثیر فوائد حاصل ہوں گے جس کے لئے یہ مدارس قائم کئے گئے ہیں۔

اس کام کی اقتصادی تقویت کے لئے مسلم کوآپریٹو بینک یا مسلم فنڈ قائم کئے جاسکتے ہیں جن میں لوگوں کی بچتیں جمع ہوں اور ان کو قابل اعتماد تجارتوں میں لگایا جائے۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اگر اس قسم کے بینک یا فنڈ چلائے جائیں تو ان میں کثیر روپیہ جمع ہو سکتا ہے۔ اور بڑی بڑی اقتصادی اسکیمیں زیر عمل لائی جاسکتی ہیں۔ البتہ ضرورت ہے محنت کی، دیانت داری کی اور حالات زمانہ کے فہم کی۔

میوات میں میوؤں کا حال سن کر کلیجہ دہل جاتا ہے۔ زمین پر انحصار اور سودی قرضوں کے رواج نے اس قوم کی کمر توڑ دی ہے۔ بیشتر میوؤں کی زمینیں رہن پر چڑھی ہوئی ہیں۔ کتنے ایسے ہیں جن کی زمینیں قرض اور سود کے چکر میں تمام کی تمام مہاجن کے پاس جا چکی ہیں۔ یہاں کا مہاجن میو قوم کی سادہ لوحی سے پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔

جہالت اور اقتصادی بدحالی نے اب نئے نئے نقصانات پیدا کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ مثلاً آج کل اس علاقہ میں نس بندی کی تحریک تیزی سے کامیاب ہو رہی ہے۔ ۲۰ روپے

نقد، ایک کمبل اور ۵۰۰ روپے بیل کے لئے تقاوی کی خوشنما پیش کش میوؤں کے لئے کافی پرکشش ثابت ہو رہی ہے۔ کیوں کہ فاقہ کشی اور قرضوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے میو کے لئے اتنا بھی بہت ہے۔

"اگر یہی حالت رہی" ایک شخص نے کہا "تو میو قوم ۲۰۔ ۲۵ سال میں خانہ بدوش ہو جائے گی۔ کیونکہ زمینیں اس کے پاس سے نکل جائیں گی یا اتنی کم ہو چکی ہوں گی کہ زمینوں سے گزر نہیں ہوگا اور وہ مجبور ہوں گے کہ ادھر ادھر جاکر مزدوری تلاش کریں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ میوؤں کی بے شعوری مستقبل میں ان سے وہ آخری چیز بھی چھین لینے والی ہے جو سب کچھ لٹانے کے بعد ابھی ان کے پاس باقی رہ گئی ہے، اور وہ ان کا "ملک" میوات ہے۔ میوات وہ علاقہ ہے جہاں میو اب بھی عددی اکثریت رکھتے ہیں۔ اور اس بنا پر اس علاقہ میں بہت سے معاشی اور سماجی کام کرنے کے خصوصی مواقع انھیں حاصل ہیں۔ مگر اقتصادی تباہی کا جو عمل ان کے درمیان جاری ہے وہ بالآخر ان کی آبادی کو منتشر کر دینے والا ہے۔ اس لئے شدید خطرہ ہے کہ یہ قوم اگر نہیں جاگی تو مستقبل کے حالات اس کے لئے ایسا معاشی دباؤ ثابت ہوں گے جن کو وہ برداشت نہ کر سکے گی۔ اور اپنے محبوب وطن سے نکلنے پر مجبور ہو جائے گی، تاکہ ملک کے دیگر شہروں میں جاکر اپنے لئے محنت مزدوری کا کام تلاش کرے۔

اس طرح موجودہ علاقہ میں ان کی عددی اکثریت کا افسانہ بھی ختم ہو جائے گا اور خود میو قوم کا فسانہ بھی۔ کیوں کہ فاقہ زدہ اور منتشر قوم کی کوئی قومیت نہیں ہوتی۔ جب کہ وہ جہالت کی وجہ سے اپنا خودی کا شعور بھی کھو چکی ہو۔

میو قوم کی سادگی کا عالم یہ ہے کہ فصل میں ایک شخص کے یہاں پانچ ہزار روپے آئے تو وہ ان کو لے جاکر لالہ جی کے یہاں رکھ دے گا اور کہے گا کہ ان کو تو بس الگ رکھو۔ اور پھر انھیں لالہ جی کے یہاں سے کپڑا اور بیج اور ضرورت کی چیزیں ادھار خرید کر لائے گا۔ جس کی قیمت لالہ جی سود کے ساتھ وصول کرتے رہیں گے، اسی طرح وہ سال بھر سودی قرض لیتا رہے گا اور اپنے پانچ ہزار روپے کو لالہ جی کے یہاں "محفوظ" رکھے گا۔ اس کو یہ بھی نہیں معلوم کہ اگر روپیہ

کو محفوظ رکھنا ہی ہے تو زیادہ بہتر شکل یہ ہے کہ اس کو ڈاک خانہ یا بینک میں رکھ دیا جائے۔

فیروز پور میں ایک میو کی ماں سڑے ہوئے انگوروں کا ایک خوشہ خرید کر ریزگاری گن رہی تھی، اس کے پاس چھ سال کی ایک بچی کھڑی ہوئی تھی جس کے دونوں کانوں میں سات سات پیتل کی بالیاں گندھی ہوئی تھیں۔ پورا کان پک کر سوج رہا تھا۔ میں نے اس کے بھائی (تخمیناً ۱۲ سال) سے پوچھا۔ اس کا نام کیا ہے۔ "رئیسن" اس نے جواب دیا۔ گھر کہاں ہے۔ "گھاٹو"

اس ایک واقعہ میں پوری میو قوم کی تصویر چھپی ہوئی ہے۔

۲۴ ستمبر کو سہ پہر کا کچھ وقت فیروز پور میں گزرا۔ فیروز پور جھرکا کی آبادی تقریباً ۱۰ ہزار ہے جس میں ۹۹ فی صد سے زیادہ غیر مسلم آباد ہیں۔ پورا مارکیٹ انھیں کے قبضہ میں ہے۔ مگر خریدار ۷۵ فی صد میو ہوتے ہیں جو روزانہ بڑی تعداد میں اطراف کی بستیوں سے آتے ہیں، بازار سے گزرتے ہوئے یہ منظر بڑا عجیب تھا کہ تقریباً ہر دوکان پر داڑھی رکھے ہوئے سادہ لوح میو خریداری کر رہے ہیں اور روپیہ گن گن کر دے رہے ہیں۔ ان کے دبلے چہرے اور میلے اور پھٹے ہوئے لباس بتا رہے تھے کہ ان کی یہ خریداری اور روپیہ شماری کسی خوش حالی کی علامت نہیں۔ وہ صرف ان کی بدحالی کا نشان ہے جس کو وہ نہایت مہنگی قیمت پر خرید رہے ہیں۔

فیروز پور کسی وقت نواب شمس الدین خاں کا دار السلطنت تھا۔ مگر اب اس دور کی علامت صرف دو چیزیں باقی رہ گئی ہیں۔ ایک اس کی شکستہ شہر پناہ اور دوسرے مسجد جس کے بلند مینارے دور سے نظر آتے ہیں۔ مسجد کے صدر دروازہ پر ایک قطعۂ تاریخ ہے جس میں شاعر کو "ہاتف" نکتہ داں نے "خوشا مسجدے لطیف و عجیب" کے الفاظ میں اس کی تاریخ بتائی تھی جو ۱۲۴۲ھ ہوتی ہے۔

ڈیڑھ سو سال قدیم مسجد کا طول و عرض ایک طرف اس کے ماضی کی عظمت کو بتا رہا ہے دوسری طرف اس کا ناہموار فرش اور پھٹی ہوئی دریاں بتا رہی ہیں کہ وہ کون سا حال ہے جو آج اس کی وراثت میں آیا ہے۔

فیروز پور جھرکا کے پس منظر میں مشہور "کالا پہاڑ" ہے جو دہلی سے راجستھان تک تقریباً ۸۰ میل کی لمبائی میں پھیلا ہوا ہے۔ یہاں جگہ جگہ پہاڑ کے اوپر چھوٹی چھوٹی مسجدیں دکھائی دیتی

ہیں، جن کا موجودہ حال یہ ہے کہ چھت ابابیلوں کا مسکن اور فرش چڑیوں کی بیٹ سے بھرا ہوا ہے۔ پہاڑ کی دراڑوں نے پر اسرار کہانیوں کی شکل اختیار کرلی ہے۔ "یہاں جنات بستے ہیں"۔ ایک ساتھی نے کہا "ان گپھاؤں میں ان کے شہر کے شہر آباد ہیں"۔

فیروز پور سے پانچ کیلو میٹر کے فاصلہ پر "شیو مندر" ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ پراچین بھارت سے قائم ہے۔ وہاں ایک بورڈ لٹک رہا ہے جس پر درج ہے کہ جیون لال نامی ایک تحصیل دار نے ۱۷۷۶ میں اس کے اوپر پختہ عمارت تعمیر کرائی تھی۔ اب سڑک اور بجلی یہاں تک پہنچادی گئی ہے۔

میرے ساتھی مجھے اس قسم کی کہانیاں سنا رہے تھے۔ اور میں سبز پوش پہاڑوں کو دیکھ رہا تھا جو میرے چاروں طرف حد نظر تک پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا "قدرت نے پتھر کی چٹانوں میں درخت اور سبزے اگاکر ان پہاڑوں کو عظیم علامت کی شکل میں کھڑا کر دیا ہے۔ یہ سنگی بلندیاں زبان حال سے کہہ رہی ہیں کہ اگر ہمت اور دانش مندی ہو تو قدرت نے یہاں یہ امکان بھی رکھا ہے کہ آدمی سنگلاخ چٹانوں سے زندگی کا سبز باغ اگا سکے۔ مگر قدرت کی اس عظیم پکار کے دامن میں میو قوم کا حال یہ ہے کہ اس کی زرخیز زمینیں بھی اس کے لئے صرف افلاس اور مفلوک الحالی کی فصل اگا رہی ہیں۔

میوات کا نصف سے زیادہ حصہ ہریانہ میں واقع ہے۔ ہریانہ ہندستان کی واحد ریاست ہے جہاں حال میں ہر گاؤں میں سڑک اور بجلی پہنچائی گئی ہے۔ میں نے دیکھا کہ اگرچہ ٹیڑھے کھمبے اور غیر مستقیم لائنوں کو درست کرنے پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے، مگر بجلی ہر جگہ پہنچا دی گئی ہے۔ اور سڑک بھی خواہ جس شکل میں ہو، ہر چھوٹے بڑے گاؤں تک جا ملی ہے۔

ہریانہ کی اس ترقی نے لوگوں کو کام کرنے کے زبردست مواقع فراہم کر دئے ہیں۔ مگر سڑکوں کی کثرت کے باوجود میو قوم کی گاڑی ابھی منزل کی طرف رواں دواں نہیں ہوئی۔ اور بجلی کے قمقمے ہر جگہ پہنچ جانے کے باوجود ان کی زندگی کے گوشے ابھی روشن نہیں ہوئے۔ ان کی زراعت سیلاب کا شکار ہے اور ان کی زندگیاں آپس کی لڑائیوں کی نذر ہو رہی ہیں۔

۲۵ ستمبر کو ظہر کی نماز ہم نے میوات کی "بڑی درگاہ" میں ادا کی۔ یہاں ایک بہت بڑی

مسجد اپنے شکستہ در و دیوار کے ساتھ کھڑی ہوئی ہے۔ مسجد کے اندر ایک مدرسہ قائم ہے۔ ٹوٹے ہوئے فرش پر املی کے درخت کے نیچے کچھ بچے بیٹھے ہوتے تھے۔ ان کے میلے اور پھٹے ہوئے کپڑے ان کی معاشی حالت کا اعلان کر رہے تھے۔ ایک چھوٹا بچہ بلند آواز سے پڑھ رہا تھا:

ب الف زبر با ن زبرنَ = بان

ب و پیش بو ن زبرنَ = بونَ

ب ی زیر بی ن زبرنَ = بین

مسجد اور اس سے متعلق عمارتوں کی وسعت اپنی ماضی کی عظمت کو بتا رہی تھی اور بچوں کا "مدرسہ" حال کی زبوں حالی کا مرثیہ خواں تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ مسجد اور درگاہ شاہ جہاں کے دور کے بنے ہوئے ہیں۔

درگاہ کے سامنے ایک کافی بڑا تالاب ہے۔ اگر اس میں مچھلی پالی جائے تو صرف اسی کی آمدنی مسجد اور مدرسہ کی ضروریات کے لئے کافی ہو جائے۔ درگاہ کے اطراف میں اس کی کافی زمینیں خالی پڑی ہوتی ہیں جہاں سبزی اور درخت اگائے جا سکتے ہیں۔ مجموعی رقبہ تقریباً پندرہ بیگھہ ہوگا۔

درگاہ اور مدرسہ کے لوگوں سے بات کیجئے تو غیر ضروری باتوں کا ان کے پاس انبار ملے گا۔ مثلاً :

فلاں نواب نے ۵۲ قلعے فتح کئے۔

یہاں دو دو سو گھوڑے بندھے رہتے تھے۔

حوالیہ منکل فج عمیق کا یہ کتبہ فلاں بزرگ نے لکھا تھا۔

اس کے تحت ۲۲ خانقاہیں چلتی تھیں۔

وغیرہ۔ مگر ضروری سوالات کا جواب ان میں سے کسی کو نہیں معلوم۔

"اس عمارت کا سن تعمیر کیا ہے" "زمین کا کل رقبہ کتنا ہے" "یہ ٹکڑا درگاہ کے نام ہے یا گرام پنچایت کے نام" اس قسم کے سوالات جو عمارت کی اصل تصویر بنانے کے لئے ضروری ہیں، اس کا جواب انھیں نہیں معلوم۔ "بس جی آپ تو کچھ اندازہ نہیں" میرے سوال کے جواب

میں ایک بزرگ نے کہا۔ دوسرے نے جواب دیا:

"یا بات کا کوئی پتو نا ہے۔"

میں نے کہا کہ چاروں طرف چہاردیواری کیوں نہیں آپ لوگ بنا لیتے ـــــ جواب ملا" اجی مرن بھی نا ہو پائے، چہاردیواری کا پیسہ کہاں سے آئے۔"

اب میں ہریانہ کی سرحد پر گوڑ گاؤں کے مشرقی کنارے پہنچ چکا تھا۔ یہاں اس وقت عجیب منظر تھا۔ مغرب میں بڈیڈ کی پہاڑیاں ہیں اور جنوب میں راجستھان کا۔ بند، مشرق میں اجینہ ڈرین کا ریگولیٹر۔ آپ اگر راجستھان باڈر پر کھڑے ہوں تو ان کے بیچ میں حدنظر تک پانی ہی پانی نظر آئے گا۔ فصلیں ڈوبی ہوئی، بستیوں میں پانی گھسا ہوا، غرض عجیب اندوہناک منظر ہے جس کی لفظوں میں لفظ کشی نہیں کی جاسکتی۔

حکومت نے پونے چار کروڑ روپے کے خرچ سے ایک نہر نکالی تھی تاکہ اس علاقے کا پانی راجستھان اور یو پی میں ہوتا ہوا جمنا میں جاگرے۔ مگر اس قیمتی نہر کے بعد سیلاب کی مصیبت اور بڑھ گئی۔ اب ریاست راجستھان نے بند باندھ رکھا ہے۔ بند کے جنوبی سمت (راجستھان میں) خشک کھیت ہیں اور بند کے شمالی جانب ہریانہ میں پانی بھرا ہوا ہے۔ ایک مرتبہ لوگوں نے کوشش کی کہ بند کاٹ دیں تاکہ پانی دوسری طرف پھیل جائے۔ مگر اس کے بعد راجستھان گورنمنٹ نے بند پر پولیس کا ایک مستقل کیمپ لگا دیا۔ شام کو ۵ ½ بجے جب میں وہاں سے گزرا تو پولیس کے لوگ سبزی کاٹنے میں مشغول تھے۔ یہ منظر دیکھ کر ایسا نظر آیا جیسے ہریانہ اور راجستھان دو الگ الگ ملک ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف سنگینیں تانے کھڑے ہیں۔

۲۶ ستمبر کی صبح کو میں بڈیڈ کے پہاڑ پر چڑھا تاکہ بلندی سے سیلاب کا منظر دیکھ سکوں۔ مشرق کی جانب رخ کر کے میں کھڑا ہوا تو میرے بائیں جانب دور تک خشک زمین پھیلی ہوئی تھی۔ یہ کسی قدر بلندی کی وجہ سے سیلاب کے پانی سے محفوظ تھی۔ مگر یہ دوسری شدید تر بدقسمتی کا شکار ہے۔ یہ پوری زمین شور ہوگئی ہے اور یہاں سفیدی کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔ سامنے اور دائیں جانب کا علاقہ حدنظر تک زیر آب ہے۔ یہ قابل کاشت زمین تھی، مگر غلط فہمی نہ ہو۔ یہ گنے اور باجرے کے کھیت نہیں تھے، بلکہ یہ یہاں کی زبان میں "ڈھنڈان" کی فصل تھی جو

پانی میں خراب نہیں ہوتی اور مویشیوں کے یا ایندھن کے کام آتی ہے۔

صبح چھ بجے، ایک طرف انسانی آفت کے یہ الم ناک مناظر تھے، دوسری طرف سورج کا سنہری چمک دار گولا سامنے سے بلند ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سبک خرامی کے ساتھ مجھے چھوتے ہوئے گزر رہے تھے، میں نے سوچا "قدرت کا نظام کتنا حسین ہے، مگر انسان نے اپنی نادانیوں سے اس کو کتنا الم ناک بنا دیا ہے"۔

میوات کی تاریک تقدیر کے اندر کچھ روشن پہلو بھی نمایاں ہو رہے ہیں۔ مثلاً پونا ہانہ میں پچھلے دو سال کے اندر تقریباً ۲۰ دکانیں میوؤں کی کھل گئی ہیں اور کامیاب ہیں۔ یہاں وہ لوگ ایک صنعتی ادارہ بھی کھول رہے ہیں جس میں میو بچوں کو مختلف صنعتی چیزیں سکھائی جائیں گی۔ سویا ہوا میوات جاگ رہا ہے۔ اگرچہ بہت آہستہ آہستہ، اگرچہ بہت دیر کے بعد۔

عبدالکریم (۳۰ سال) سے میں نے پوچھا آپ کیا کام کرتے ہیں۔ "اجی اس وقت تو کچھ نہیں۔ مزید دریافت کے بعد انہوں نے جو کہانی بتائی اس سے یہاں کے لوگوں کی مشکلات کا اندازہ ہوگا۔

عبدالکریم میواتی کے پاس زمین نہیں، کوئی جائداد نہیں، پھر وہ کیا کریں، انھوں نے طے کیا کہ دودھ کا کام کریں گے۔ وہ روزانہ گاؤں سے دودھ خریدتے اور اس کو لے جاکر "دہلی ملک اسکیم" کے پونا ہانہ ڈپو میں بیچتے تھے۔ سائیکل پر بالٹی نما چار ڈبے لٹکے ہوئے۔ ہر ڈبہ میں ۲۰ کیلو دودھ۔ ڈبے سمیت ان کا وزن ایک سو کیلو۔ اس حلیہ میں ایک روز سڑک پر جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک ٹریکٹر آگیا۔ سائیکل سنبھل نہ سکی اور بچانے کی کوشش میں الٹ گئی۔ ایک ڈبہ چھوٹ گیا اور اس کا پیندا عبدالکریم میواتی کے پاؤں پر عین ایڑی کے پاس آکر گرا جس سے ایڑی کے پاس کی شہ رگ کٹ گئی۔

اب ضرورت تھی کہ ان کو کسی اسپتال میں داخل کیا جائے۔ مگر ان کے ساتھی پونا ہانہ کی ڈسپنسری میں مرہم پٹی کرا کر ان کو گھر اٹھا لائے اور گھر پر علاج ہوتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا پاؤں اب مستقل طور پر کمزور ہوگیا۔ وہ زیادہ بھاری بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ نہ زیادہ سائیکل چلا سکتے۔

وہ اردو، ہندی، دینیات اور ابتدائی حساب پڑھا سکتے ہیں۔

گیارہواں سفر

۳ فروری ۱۹۷۲ء کی صبح کو دو روز کے لیے میوات کے سفر پر روانہ ہوا۔ ایک درجن کے قریب میوات کا سفر کرنے کے بعد غالباً اب قارئین کے لیے میوات کے رودادِ سفر میں کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ میں اس میں اتنا اور اضافہ کروں گا کہ خود مسافر کا حال بھی اس معاملہ میں کچھ مختلف نہیں ہے۔ دوستوں کے اصرار پر کیے جانے والے اس سفر میں ذاتی دل چسپی کا جزء صرف اتنا تھا کہ شاید میوات اب جاگ اٹھا ہو اور کچھ ایسے مشاہدات سامنے آئیں کہ مسافر کو اپنی ڈائری کے بجائے "میوات کی ڈائری" لکھنے کی سعادت نصیب ہو۔ مگر سفر کی تکمیل کے بعد معلوم ہوا کہ ابھی میوات نے اپنا سفر شروع نہیں کیا۔ ابھی قارئین کے لیے یہی مقدر ہے کہ وہ مسافر کی رودادِ سفر پڑھیں۔ میوات کے اپنے سفر کی داستان سننے کا وقت ابھی ان کے لیے نہیں آیا۔

فیروزپور جھرکہ ہماری پہلی منزل تھی۔ صبح کی روشنی میں قصبہ کے نو تعمیر مکانات جھلک رہے تھے۔ پشت پر "کالا پہاڑ" کی دیواریں دور تک چلی گئی تھیں۔ سامنے سڑک تک ہرے بھرے کھیت سرسوں کے بسنتی پھولوں کے ساتھ رنگین مخملی فرش کا منظر پیش کر رہے تھے۔

اس علاقہ میں فیروزپور جھرکا سب سے بڑا تجارتی مرکز ہے۔ مگر اس میں "میووں" کا حصہ صرف اتنا ہے کہ چند کھوکے انہوں نے بھی لگا رکھے ہیں جن میں سے کسی میں حجام کی دکان ہے اور کسی میں چائے اور کھانے کا ہوٹل۔ جو اکثر اوقات سنسان پڑا رہتا ہے۔ ہمارے یہاں ابھی تک تجارت اس کا نام ہے کہ حجامت خانہ کھول لیا جائے یا کوئی ہوٹل قائم کر دیا جائے۔ تجارت کا جدید مفہوم ابھی تک ہمیں نہیں معلوم۔

فیروزپور جھرکا سے پہاڑی تک پورا راستہ پہاڑیوں کے درمیان طے ہوتا ہے۔ ہم آگے بڑھے تو راستہ میں میو اپنے روایتی حلیہ میں جگہ جگہ نظر آرہے تھے۔ ایک جگہ دو میو سڑک پر چل رہے تھے۔ جسم کے نچلے حصے میں سفید رنگ کی دھوتی کی طرح بندھی ہوئی تہمد جو میلے پن کی

پہاڑی سے اتر کر ہم دوبارہ قصبہ نوح کی طرف واپس ہوئے تو چودھری امید خاں نمبردار سے ملاقات ہوئی، جو قریب ہی موضع سونکھ میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں سب زمینیں مسلمانوں کی تھیں۔ غیر مسلم لوگ زیادہ تر ہریجن یا مزدور اور خدمت گار قسم کے تھے۔ مالک زمین اور صاحب حیثیت زیادہ تر مسلمان تھے۔ تقسیم کے بعد بیشتر مسلمان پاکستان چلے گیے۔

"آپ یہاں کیسے رہ گیے" میں نے نمبردار سے پوچھا۔

"فساد کے زمانے میں ہم موضع سوہنا چلے گیے تھے" انھوں نے جواب دیا، سات روز ہم وہاں پڑے رہے۔ اس کے بعد چودھری یٰسین خاں اور مولانا حفظ الرحمٰنؒ وغیرہ آئے۔ انھوں نے تقریریں کیں اور کہا کہ اپنے مکانوں میں چلو، ہم نے انتظام کر لیا ہے۔ حکومت تمہاری مدد کرے گی۔ چنانچہ ہم دوبارہ واپس آئے، یہاں ہم کو اپنی زمین اور مکانات مل گئے۔"

"خان بہادر بھگانے میں تھے، چودھری یٰسین جمانے میں" میرے دوسرے ساتھی نے کہا خاں بہادر یہاں کے مسلم لیگی لیڈر تھے اور چودھری یٰسین کانگریسی خیال کے آدمی تھے۔ علاقہ میں اکثریت مسلم لیگی لوگوں کے ذہن کی تھی۔ جب ملک تقسیم ہوگیا، تو مسلم لیگ کے لیڈروں نے زور و شور کے ساتھ "پاکستان چلو" کی تحریک شروع کی۔ اس کے برعکس جمیعۃ علماء اور کانگریس کے لیڈر جمانے اور ٹھہرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ سیاسی خیالات انسان کی زندگی سے کتنا گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ جن لوگوں نے پاکستان کو اپنا ذہنی نشانہ بنا رکھا تھا وہ پاکستان بننے کے بعد بھارت میں اپنے کو بے جگہ محسوس کرنے لگے۔ ان کی سمجھ میں اس کے سوا کوئی بات نہیں آتی تھی کہ وہ خود بھی اسی خطہ ارضی میں چلے جائیں جہاں ان کے ذہنی خوابوں نے عملی شکل اختیار کی ہے، اس کے برعکس جو لوگ پورے ملک کو اپنا وطن سمجھ کر ملکی سطح پر سوچتے تھے ان کے لیے تقسیم ملک سے اس قسم کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ یہاں رہیں یا کہیں اور چلے جائیں۔

اس ذہنی فرق نے ہندستانی مسلمانوں کی زندگی میں زبردست نتائج پیدا کیے ہیں۔ ایک طرف مسلم لیگی ذہن نے بھگدڑ کا رجحان پیدا کیا، جس کو اسلامی رنگ دینے کے لیے ہجرت کا خوش نما عنوان دیا گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تقسیم کے بعد ہندستانی مسلمانوں کی جو تعداد پاکستان گئی ہے اس کی بہت بڑی اکثریت وہی ہے جو پاکستانی خیالات سے متاثر تھی، دوسری طرف جمیعۃ علماء اور

آخری حد کو پہونچ چکی تھی۔ اوپر ایک میلا سا کُرتا اور گردن میں کالے رنگ کی چادر، کندھے سے ایک گٹھڑی لٹکی ہوئی۔ اس حلیہ پر جو آخری اضافہ تھا وہ یہ کہ وہ اپنے سینے تک اٹھے ہوئے ہاتھ میں ایک تسبیح سنبھالے ہوئے تھا۔ اور اپنے ساتھی سے بات کرتا ہوا تسبیح بھی پڑھتا جا رہا تھا۔

آگے بڑھے تو گھاٹا اور لبسیٔ نامی بستیاں سامنے تھیں۔ یہاں ہریجنوں اور کمہاروں نے سڑک کے کنارے پختہ مکانات اور دکانیں تعمیر کر لی ہیں۔ دوسری طرف نظر آیا کہ پہاڑ کے کنارے ٹرک کھڑے ہوئے ہیں اور میو اور میو نیاں پتھر توڑ توڑ کر ٹرک پر لاد رہے ہیں۔

"ان لوگوں کا نظریہ،" میں نے سوچا "شاید یہ ہے کہ دین کے لیے تسبیح پڑھ لو اور دنیا کے لیے پتھر توڑ لو۔"

اسلام کا یہ تصور بھی کتنا عجیب ہے جو ان کی زندگیوں میں کسی دیکھنے والے کو نظر آتا ہے۔

مگر یہ صرف بے چارے میوؤں کا حال نہیں، بلکہ ساری ملّت اسی بربادی کا شکار ہو رہی ہے۔ اور ان کا بھی کیا قصور، جب کہ ان کے قائدین نے ان کو یہی بتایا ہو تو وہ اس کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔

پچھلے چند سالوں میں میں نے مسلسل میوات کا سفر کیا ہے اور لوگوں کو متوجہ کیا ہے کہ وہ زمانہ کو سمجھیں اور گہری بنیادوں پر اپنی ترقی کی منصوبہ بندی کریں۔ مگر اس قسم کی آواز میں لوگوں کے لیے کوئی کشش نہیں۔

اس دور میں ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ طویل مدت تک غلط راہوں میں دوڑنے کی وجہ سے ساری قوم کا مزاج بگڑ گیا ہے۔ ہمارے ذہن ایسی روایات کے درمیان پرورش پا کر تیار ہوئے ہیں کہ اب اس سے ہٹ کر سوچنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا ہے۔ ہماری قوم کو یا تو ان لوگوں کی آواز بس اپیل کرتی ہیں جو مذہب کے نام پر مستی گولیاں تقسیم کرتے ہوں یا اس کے لیے ان لوگوں کے اندر کشش ہے جو سیاست کے نام پر جذباتی نعرے بلند کرتے ہوں۔ آپ دیکھیں تو اس مردہ قوم کے اندر نہ صرف میوات میں بلکہ سارے ملک میں زبردست سرگرمیاں نظر آئیں گی۔ مگر ان سرگرمیوں کی حقیقت حرکت مذبوحی سے زیادہ نہیں۔ کیوں کہ یہ یا تو پُر اسرار گولیوں کی خاطر ہے یا اس لایعنی جوش و خروش کی پیدا کردہ ہے جس کو یہ بے خبر قوم ملّی سیاست کا نام دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب و سیاست کے نام پر عام طور پر ہمارے یہاں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ نہ

مذہب ہے اور نہ سیاست۔ مذہب انسانی شخصیت میں ایک عظیم تغیر کا نام ہے۔ اور اسی طرح سیاست ایک نہایت گہری دوررس منصوبہ بندی ہے۔ مگر آپ کو نہ کہیں یہ تغیر نظر آئے گا اور نہ یہ منصوبہ بندی۔

اگر جماعتوں اور شخصیتوں کو دیکھئے تو ہر ایک اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں کی انسائیکلو پیڈیا یائی فہرست اپنے ساتھ لیے ہوئے ہے۔ اگر مذہب اور سیاست کے میدانوں میں فی الواقع ہمیں یہ کامیابیاں اور کامرانیاں ملی ہوتیں جو ہماری جماعتوں اور شخصیتوں کی فہرست میں درج ہیں تو اب تک ہم سارے عالم میں چھا چکے ہوتے اور ایورسٹ کی چوٹی سے لے کر چاند کی سطح تک کوئی میدان نہ ہوتا جو ہمارے قدموں سے پامال نہ ہو رہا ہو۔

۱۰ بجے ہم پہاڑی پہونچے۔ مدرسہ میں پہونچتے ہی لڑکوں کا ایک غول نکلا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر یہ معصوم بچے صرف اتنا جانتے ہیں کہ جب کوئی "حضرت" تشریف لائیں تو یہ اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر اس سے مصافحہ کرلیں۔ یہ لوگ مصافحہ کرکے خاموش اپنے کلاس میں چلے گئے، جو پیال بچھے ہوئے ایک فرش پر قائم تھا۔

اب بچوں کے پڑھنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ جھوم جھوم کر خوش الحانی کے ساتھ اشعار دہرا رہے تھے۔ میں نے دو لڑکوں کو بلایا کہ وہ اپنی کتاب سے کچھ سنائیں۔ انھوں نے کتاب کا ایک باب کھولا جس میں آسمان اور اس کی چیزوں کا بیان ہے۔ جو اشعار انھوں نے سنائے، اس میں سے ایک شعر یہ تھا:

تارے جو پھرتے ہیں خود سیارہ ہیں
اور ثوابت باقی اے ماہ پارہ ہیں

یہ ہے وہ علم الافلاک جو بیسویں صدی میں ہمارے مدرسہ کے بچوں کو پڑھایا جاتا ہے۔

پہاڑی کے مدرسہ کے اوپر کھڑے ہوں تو مشرق کی طرف قصبہ اپنی نئی عمارتوں کے ساتھ ابھرتا ہوا نظر آئے گا۔ دوسری طرف مغرب میں ہریالے کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ کھیتوں کے درمیان جگہ جگہ متفرق درخت ہری مخمل کے فرش پر ابھرے ہوئے پھول کی مانند بکھرے ہوئے ہیں۔ اس کے آگے شمال سے جنوب تک پہاڑ کی دیواریں حد نظر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان مناظر کے اوپر آسمان کی چھت اور اس میں تیرتے ہوئے سفید بادل عجیب آفاقی حسن کا منظر پیش کر رہے ہیں۔

"قدرت کتنی حسین ہے" میری زبان سے نکلا۔ مگر اس کے بعد جب میری نظر اس قوم کی طرف گئی جو گویا دنیا میں اس قدرت کی نمائندہ ہے تو میرے رنج و غم کی کوئی انتہا نہ تھی۔ کیوں کہ یہ قوم اپنے ٹوٹے

چھوٹے مدرسوں اور اپنی غربت دجہالت کے ساتھ ایک ایسی نمائندہ تھی، جو آفاقی حسن رکھنے والی قدرت کے اوپر صرف ایک بدنما دھبہ کہی جاسکتی ہے۔

کس قدر نادان ہیں وہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ اس حسین قدرت کی نمائندگی ایک ایسی قوم بھی کر سکتی ہے جس کو دائمی طور پر جہالت اور غربت کی خندق میں ڈال دیا گیا ہو۔

"بزرگوں" کی زیارت کرنے، ان کو نفلی حج ادا کرانے اور اگر وہ مر جائیں تو ان کی قبر کو زیارت گاہ بنا کر اس پر یہ قوم کروڑوں روپے خرچ کرسکتی ہے مگر اس کے لیے یہ ممکن نہیں کہ ایک ایسا ادارہ قائم کرے جہاں ایسے لوگ تیار کیے جائیں جو زمانہ کو سمجھیں اور وقت کے مطابق قوم کی رہنمائی کریں۔ اس بدنصیب قوم کا حال یہ ہے کہ قرآن کے نسخہ پر اگر ہدیہ کے بجائے "قیمت" لکھ دیجئے تو لوٹنے کے لیے تیار ہو جائے گی، مگر وہ یہ نہیں کر سکتی کہ قرآن کے لیے کوئی بڑا فنڈ فراہم کرے کہ دیگر اقوام کی زبانوں میں قرآن کے سستے ترجمے تیار کر کے پھیلائے جائیں۔ یہ قوم ہر سال کروڑوں اربوں روپے دوسروں کی دکانوں پر انڈیلتی ہے۔ مگر یہ نہیں کرسکتی کہ خود اپنی تجارتیں قائم کرے۔ اس یک طرفہ گردش دولت کا معاملہ یہاں تک پہونچا ہے کہ اب ہمارے تمام اخبارات، تمام چندہ وصول کرنے والے ادارے تمام دینی و ملی اجتماعات نادانستہ طور پر گویا اغیار کی اقتصادی ایجنسی بن گئے ہیں۔ کیوں کہ مختلف طریقوں سے قوم کی جیب سے جو پیسہ وہ جمع کرتے ہیں وہ سب بالآخر دوسروں کی جیب میں پہونچ جاتا ہے۔

ظہر کی نماز ہم نے گلبارگہ میں ادا کی۔ یہاں مجھے ایک بزرگ کی قبر کے بارے میں بتایا گیا جن کا انتقال تقریباً سو سال پہلے ہوا ہے۔ ایک روز انھوں نے اپنے مریدوں سے کہا کہ میرا وقت آگیا ہے۔ اب میرے لیے قبر کھود دو اور کفن کا انتظام کرو۔ جب سب کچھ ہو گیا تو حاضرین سے السلام علیکم کہا اور چارپائی پر لیٹ کر اپنے اوپر کپڑا ڈھک لیا۔ لوگوں نے دیکھا تو روح عالم بالا کو پرواز کر چکی تھی۔

یہ بھی بزرگی کا کیسا عجیب تصور ہے کہ ہم نے ایسی دوررس نگاہیں پیدا کیں جو چاند سورج کے پرے عالم بالا کے نوشتوں کو پڑھ سکتی تھیں۔ مگر انھیں اس کی خبر نہ ہو سکی کہ جس دنیا میں وہ ہیں اس کے اندر کتنی تبدیلیاں ہوئی ہیں اور جدید تبدیلیوں کے لحاظ سے قوم کو کس نہج پر تیار کرنا چاہیے۔

گلبارگہ میں ظہر کی نماز کے لیے وضو کر رہا تھا کہ ایک نوجوان میرے سامنے آکھڑا ہوا۔ ٹوٹی ہوئی سائیکل ایک چادر تہمد کی جگہ پہنے ہوئے اور دوسری چادر پھٹے ہوئے کرتے کے اوپر لپیٹے ہوئے سر پر

ڈالے ہوئے۔ چہرہ چیچک کے نشانات سے داغدار۔ اس نے میرے ہاتھ میں ایک خط دیا۔ یہ مدرسہ میل کھیڑا کے صدر مدرس کا دعوت نامہ تھا کہ ایک دن میں میل کھیڑا میں گزاروں۔

"آپ کی ایک آنکھ کیسے جاتی رہی"، میں نے نووارد کو دیکھ کر پوچھا۔

"سیڈ سے" (یہاں چیچک کو سیڈ کہتے ہیں)

"آپ طالب علم ہیں"

"جی ہاں"

"کیا پڑھتے ہیں"

"میزان منشعب"

یہ مدرسہ اسلامیہ میل کھیڑا کے طالب علم عبد الحمید (۱۸) تھے۔

۴ فروری کی دوپہر ہم نے اس مدرسہ میں گزاری۔ اس مدرسہ میں پچھلے سال ہندی کا درجہ بھی شروع ہو گیا ہے۔ اس بنا پر اس کو کہا جاتا ہے کہ "یہ تو دنیاداروں کا مدرسہ ہے"، اسی طرح یہاں طلبہ کے لیے والی بال کا انتظام ہے اس کے لیے بھی انھیں سننا پڑتا ہے کہ "دنیا کے کھیل کھیلتے ہیں۔ یہ کیسا مدرسہ ہے۔" سمجھ میں نہیں آتا کہ جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں ان کا تصورِ دین کیا ہے۔ وہ مسلمانوں کو کس کام کے لیے تیار کرنا چاہتے ہیں اور انھیں کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔

مٹی کی دیواروں پر چھپر کی چھت ظاہر کر رہی تھی کہ اس مدرسہ کے وسائل و ذرائع زیادہ نہیں، مگر اس بے سروسامانی کے باوجود صفائی ستھرائی اور ہر چیز مناسب جگہ پر رکھنے کا اہتمام بتا رہا تھا کہ ان کے اندر کام کرنے کا سلیقہ ہے۔

اس مدرسہ کے لوگ اپنے یہاں صنعتی شعبہ بھی کھولنا چاہتے ہیں۔

"ہماری قوم تو جی" میواتی صدر مدرس نے کہا، "سب کی سب سودی قرضوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سودی قرضوں پر اٹھنے والی قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ اس لیے ہم اپنے یہاں صنعتی شعبے کھولنا چاہتے ہیں اور قوم کے اندر صنعتی و تجارتی مزاج پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ قوم جو زمینداری کے سوا کچھ اور نہیں سوچتی، وہ معیشت کے دوسرے ذرائع کو اپنائے اور سودی قرضوں کے جال سے نجات حاصل ہو۔"

یہاں ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ یہ حسن خاں (پیپرولی، ۴۰) تھے۔ نہایت سیدھے، ہر مفید بات

ماننے کے لیے تیار۔ میرا خیال ہے کہ میووں کا اصل مزاج یہی ہے، مگر غلط رہنمائی نے ان کو بگاڑ دیا ہے۔

ککرالا جاتے ہوئے راستہ میں ایک بوڑھی مسلمان عورت (میونی) ملی۔ اس کے ساتھ ایک ۷ سالہ بچی تھی۔

"تم کہاں رہو ملّا جی" ،عورت نے کہا "یہ چھوری کا نکس دے دو۔ روے بہت بھاری ہے"

(مولوی صاحب تم کہاں کے رہنے والے ہو، اس لڑکی کو نقش دے دو۔ یہ بہت روتی ہے)

میں نے دیکھا تو چھوٹی سی بچی کے دونوں کان سات سات بالیوں سے بوجھل ہو رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بطور سزا کانوں کو چھید کر ان میں بوجھ لٹکا دیا گیا ہو۔ آنکھیں بالکل سفید ہو رہی تھیں جو اس بات کی علامت تھی کہ جسم میں خطرناک حد تک خون کی کمی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ میو قوم (بلکہ ساری مسلم قوم) کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ اس کو جاہل رکھا گیا اس جہالت کا نتیجہ ہے کہ وہ یا تو نقش تعویذ والے مذہب کی طرف دوڑتی ہے یا ظاہر فریب جذباتی نعروں کی طرف۔ اس سے آگے کوئی گہری بات وہ سوچ ہی نہیں سکتی۔

ککرالا کی آبادی ڈیڑھ سو گھروں پر مشتمل ہے۔ میں باہر کھیتوں کی طرف نکلا۔ ہر طرف سرسوں کے کھیت نظر آرہے تھے۔ یہاں کی زمین اچھی ہے۔ مگر امسال فصل بہت خراب ہوگئی۔ اندازہ ہے کہ صرف چوتھائی فصل حاصل ہوگی۔ یعنی بیگھہ میں اگر دس من ہوتی تو صرف ڈھائی من ہوگی۔

"چیپا ایک مرُو سو جنا ورہے وہ نے سُکھا دیئے" ، ایک میو نے کہا جو میرے قریب اپنی ڈاڑھی کے بالوں پر لاٹھی ٹکائے ہوئے کھڑا تھا۔

"دوا نہیں چھڑکتے آپ لوگ" میں نے کہا۔

"دوا پھوا تو نا چھڑکی"

یہ علاقہ سرسوں کی فصل کے لیے خاص ہے، مگر اس سال پورے علاقہ میں سرسوں کی فصل تباہ ہوگئی ہے گورنمنٹ نے ہیلی کاپٹر بھیجا تھا تاکہ دوا چھڑکے۔ مگر اس کا آنا بھی کچھ سودمند نہیں ہوا۔ کیوں کہ ایک شخص کے بقول :

گورنمنٹ کا حال تو یہ ہے کہ آگ لگے چھ مہینہ پہلے،

اور سرکار اس کو بجھادے چھ مہینہ بعد۔

حاجی مل خاں (گلپاڑہ) نے بتایا کہ قصبہ نگر کے پاس ایک گاؤں ہے دھن سنگھ کا ننگلا۔ وہاں مَن پھول خاں نے بر وقت توجہ کی اور پانچ سو روپے کی دو ابیں خرید کر کئی کئی بار اپنے کھیتوں پر چھڑکاؤ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے پچاس بیگھہ کی سرسوں بچالی۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے یہاں ۱۰ — ۱۲ من بیگھہ کی پیداوار ہوگی یا اس سے زیادہ۔

نگرالا میں رات کو نماز عشا کے بعد مسجد میں میں نے ایک تقریر کی جس میں دین کے تقاضے بیان کیے۔

اگلے دن صبح سویرے رسول پور گیے۔ فضا کے اوپر کہر چھایا ہوا تھا جس میں مزید اضافہ اس دھوئیں سے ہو رہا تھا جو جگہ جگہ "پور" (آگ) کے جلنے کی وجہ سے اٹھ رہا تھا گھروں سے چکی چلنے کی آوازیں عورتوں کی صبح کی پہلی مصروفیت کا اعلان کر رہی تھیں۔ اور مرد نماز فجر سے فارغ ہو کر پور کے کنارے بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔

"یہاں کوئی مدرسہ ہے" میں نے گاؤں کے پیش امام سے پوچھا۔

"ہاں ایک مکتب ہے"

"کیا پڑھائی ہوتی ہے اس میں"

"کلام پاک، اردو"

"اسکول بھی کوئی ہے"

"نا، اکثر کرکے یہاں ہندی پر زور نا دیوے کوئی،، بس اردو، کلام پاک پڑھیں،

چھجو خاں کے دروازے پر ایک درجن بیل بندھے ہوئے تھے، سب کے سب دُبلے نظر آرہے تھے۔

"یہ بیل اتنے دبلے کیوں ہیں"

"چارہ کی کمی سے"

"وہ کیسے"

"ایک جھگڑا ہو گیا ہمارا آپس میں۔ اس میں ہم کمزور ہو گیے ورنہ پہلے ہمارے بیل ایسے نہ تھے"

مزید دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ چار سال پہلے راستہ کے معاملہ پر آپس میں جھگڑا ہوا۔ اس کے بعد کھیت کاٹے گیے۔ پھر فوجداری ہوئی جس میں ایک شخص قتل ہو گیا اس کے بعد ساڑھے تین سال تک مقدمہ چلتا رہا۔ گھر کے آٹھ قابل کار آدمی حوالات میں بند رہے جس کی وجہ سے کھیتی کا کام بھی تین سال تک معطل رہا۔ ہائی کورٹ

تک مقدمہ بازی ہوئی۔ صرف ایک فریق کا پندرہ ہزار خرچ ہوگیا۔ اب یہ عالم ہے کہ بیلوں کو کھلانے کے لیے دانہ نہیں ایک گھر مقدمہ بازی سے پہلے بنایا تھا۔ میں نے دیکھا تو پتھر کی دیواروں کے اوپر معمولی چھپر پڑا ہوا ہے کیوں کہ چھت ڈالنے کے لیے پیسہ نہیں۔

سارا میوات اسی قسم کے لڑائی جھگڑوں میں تباہ ہو رہا ہے اور اس میں دین دار اور داڑھی والے مسلمان بھی ٹھیک اسی طرح شریک ہیں جس طرح غیر دیندار مسلمان (اگرچہ میوات میں غیر دیندار مسلمان کوئی نہیں)

میں وہاں پہونچا تو ایک پرانا ٹرانسسٹر بج رہا تھا۔ حاجی مل خاں (گل پاڑہ) نے بتایا کہ ہمارے میو لوگ جاہل ہیں، کوئی بات نہیں پکڑتے۔ ورنہ ریڈیو میں سرکار بڑے کام کی باتیں بتاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ریڈیو نے ایک بار بتایا کہ کل کے دن پالا پڑے گا جس سے فصل کو بہت نقصان ہوگا۔ اس سے بچنے کی آسان ترکیب اس نے یہ بتائی کہ گاؤں کے لوگ اپنے کھیتوں کے کنارے گھاس پھوس وغیرہ جمع کر کے شام کو آگ لگادیں کہ رات بھر کھیتوں کے اوپر دھواں پھیلا رہے۔ اس سے ان کے کھیتوں پر اوس نہیں پڑے گی اور ان کی فصل پالے سے بچ جائے گی۔

انھوں نے کہا کہ اس کو بہت سے لوگوں نے سنا ہوگا لیکن نگر کے پاس دھن سنگھ کا نگلا والوں نے فوراً اس کو پکڑلیا۔ ان کے یہاں سرسوں کا بہت سا ڈنٹھل پڑا ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے کھیتوں کے چاروں کونوں پر ڈھیر کر کے عشار کے بعد آگ لگادی۔ رات بھر دھواں کھیتوں پر پھیلا رہا۔ ان کی فصل پالے سے بچ گئی۔

نوگاؤں ہوتے ہوئے شام کو ہم مبارک پور پہونچے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہاں پانچ مسجدیں ہیں۔ میں نے چل کر تمام مسجدوں کو دیکھا۔ ایک مسجد جس سے ملی ہوئی ٹھڑی بھی تھی۔ وہاں ٹھڑی کو گوردوارہ میں تبدیل کردیا گیا ہے۔ اور متصل مسجد کے دروازے بند کر کے اس کے اندر گوردوارہ کا سامان رکھا ہوا ہے۔ دوسری مسجد میں لڑکیاں اور استانیاں نظر آرہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ یہ اب "راجکیہ کنیا پرتھمک ودیالہ ہے۔ دو اور مسجدیں خالی پڑی ہوئی تھیں۔ جن میں غلاظت اور کوڑے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ پانچویں مسجد آباد ہے اور اس میں مدرسہ قائم ہے۔ جہاں باہر کے لڑکے آکر ابتدائی دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ میں اندر داخل ہوا تو ایک شکستہ اور غیر صاف عمارت کے اندر میو بچے موٹی موٹی روٹیاں لیے ہوئے گڑ کے ساتھ کھا رہے تھے۔ یہ ان کا کھانے کا انٹرول تھا۔

ہمارے مدرسوں میں جہاں قوم کے نوجوانوں کو یہ تربیت دی جاتی ہے کہ " وہ دنیا کے کسی کام کے نہ رہیں "، اگر ان کے اندر وقت کے مطابق اقتصادی مزاج پیدا کیا جاتا اور ان کو دستکاریاں بھی سکھائی جاتیں تو یہ خالی مسجدیں آج دینی مراکز بن سکتی تھیں ۔ وہ یہاں آکر قیام کرتے ۔ مسجد کو آباد کرتے اور یہاں بستی میں کسی دستکاری اور کسی اقتصادی اسکیم کو اختیار کرکے اپنی روزی کماتے مگر ان لوگوں کو اس کے سوا کوئی اور کام نہیں معلوم کہ وہ ایک مدرسہ قائم کرکے چندہ جمع کریں اور پھر دوسرے مدارس کے دشمن بن جائیں ۔ کیوں کہ انھیں اندیشہ ہوتا ہے کہ ان کی چندے کی مارکیٹ پر وہ قبضہ کرلیں گے ۔

مبارک پور کی آبادی تقریباً ڈھائی ہزار ہے ۔ یہ اس علاقہ کا تجارتی مرکز ہے ۔ اطراف کی تقریباً بیس بستیوں کے لوگ یہاں سے لین دین کرتے ہیں ۔ ان کا غلہ بھی یہیں کی مارکیٹ میں آکر فروخت ہوتا ہے ۔

"یہاں مسلمان کتنے ہیں" میں نے پوچھا ۔

" کوئی نہیں " پیش امام نے جواب دیا جو باہر سے آکر یہاں کی ایک مسجد آباد کیے ہوئے ہیں " صرف ایک گھر ہے جوگیوں کا جو مندر جھاڑتا ہے "

" اس سے ملاقات ہوسکتی ہے "

" رات میں ہوسکتی ہے ۔ مگر دن میں نہیں ۔ کیوں کہ دن میں وہ آٹا مانگنے کے لیے دیہاتوں میں نکل جاتا ہے ۔

یہاں مسلمان بڑی تعداد میں آباد تھے ۔ مگر تقسیم کے ہنگامہ میں وہ یہاں سے چلے گئے ۔ اب شکستہ مسجدیں اور بنفڑی صرف ان کی یادگار رہ گیے ہیں ۔

مولوی نصیرالدین صاحب (ادمرہ ضلع گوڑگاؤں) ایک بار ایک مسجد کو خالی کرانے کے لیے مزید پانچ آدمیوں کے ساتھ گیے تو ان کے الفاظ میں " جھگڑے کی شکل پیدا ہوگئی " اور انھیں ناکام واپس آنا پڑا ۔ وہ ملک جو ساری دنیا میں قبضۂ غاصبانہ کو ختم کرنے کے لیے اپنے کو خدائی فوجدار سمجھتا ہے ، وہ خود اپنے لیے قبضۂ غاصبانہ کو عین جائز سمجھتا ہے ۔

رات کو ہم چراونڈا پہونچے ۔ یہ معروف معنوں میں کوئی بستی نہیں ۔ مشرق و مغرب کے طویل پہاڑی سلسلوں کے درمیان چھ میل چوڑی اور اس سے زیادہ لمبی ایک دنیا ہے جس میں جگہ جگہ چھپر پوش چھوٹے چھوٹے مکانات نظر آتے ہیں ۔ کھیت کے مالکوں نے اپنے اپنے کھیت کے ساتھ معمولی رہائش گاہیں بنائی ہیں اور کتے

اور مویشیوں کے ساتھ وہاں اپنے کھیتوں میں مشغول رہتے ہیں اور رات کو چھپر کے نیچے سو جاتے ہیں۔ تمدنی سرگرمیوں سے دور اس دنیا میں آدمی اپنے کو قدرت سے قریب محسوس کرتا ہے۔ لہلہاتے ہوئے کھیت جن میں درخت جگہ جگہ سبز پوش سنتری کی طرح کھڑے ہیں۔ پہاڑ کی خاموش دیواریں، سر پر آسمان کے نیلے شامیانے میں تیرتے ہوئے بادل، اور پھر ان سارے مناظر کے درمیان چڑیوں کے چہچہے، یہ سب چیزیں اس مقام کو قدرت کی آفاقی شان کا نمونہ بنا رہی ہیں۔ تیتروں کی غوں غوں کی آوازیں مسلسل اس طرح آ رہی تھیں جیسے وہ قدرت کی طرف سے کسی خاص اعلان کے لیے مقرر کیے گیے ہوں۔

زرعی علاقوں میں زندگی کی یہ صورت حال مجھے انتہائی فطری اور کار آمد نظر آتی ہے کہ ہر خاندان کے تمام کھیت ایک جگہ ہوں، وہیں اس کا مکان اور مویشی ہوں اور اس کی رہائش اور اس کی زراعت دونوں ایک اکائی کی صورت اختیار کر گیے ہوں۔ اس طریق زندگی کے بے شمار زرعی فائدے ہیں۔ خود پیداوار بڑھانے کی یہ سب سے زیادہ کار آمد فطری صورت ہے۔ مگر عمومی طور پر عمل کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اس طرح متفرق طور پر بسے ہوئے خاندان اپنے آپ کو چوروں اور ڈاکوؤں سے محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ یہ ملک جو ساری دنیا میں امن و انصاف کا ذمہ دار ہے، خود اپنے اندر وہ اس کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ ان کسانوں کی جان و مال محفوظ رہے گی۔

ننگلہ چراونڈا ہم لوگ رات کو دیر سے پہونچے، رات کا کھانا کچی دیواروں کے ایک چھپر پوش کمرہ میں کھایا گیا جس میں ایک طرف عورتیں کھانا تیار کرنے میں مشغول تھیں اور دوسری طرف ہمارے لیے چادر کا دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ سارے میوات کا یہی حال ہے۔ یہاں مروجہ پردہ کہیں نظر نہیں آتا۔ صبح کو اٹھنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ چھپر کے اوپر ایک سوراخ سے آنے والے اجالے نے بتایا کہ سویرا ہو چکا ہے۔ میں جلدی سے اٹھا فراغت کی۔ وضو کیا اور باہر پڑی ہوئی ایک چارپائی پر بیٹھ کر پاؤں دھونے لگا۔ گھر کے مرد ابھی نہیں اٹھے تھے۔ اتنے میں گھر کی خاتون پیچھے سے آئیں: "یہ سے پونچھ لو مولانا صاحب" انھوں نے تولیہ دیتے ہوئے کہا۔ ہمارے علاقہ میں یہ بات عجیب سی معلوم ہوگی۔ مگر یہاں کے لیے یہ کوئی عجیب چیز نہیں۔

میوات کے رواجات اکثر غیر اسلامی ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہاں کی کم از کم ایک چیز ضرور ایسی ہے جو ہمارے علاقوں کے مقابلہ میں اسلام سے زیادہ قریب تر ہے اور وہ یہاں کا "پردہ" ہے۔ یہاں کی بے پردہ عورتیں حقیقی معنوں میں اس سے کہیں زیادہ باپردہ ہوتی ہیں جو ہمارے علاقہ کے دین دار

گھرانوں میں پایا جاتا ہے۔

دن بھر موٹے کاموں میں مشغول رہنے والی عورتیں جن کو ساری زندگی میں کبھی موقع نہیں آتا کہ وہ اپنے ہاتھ منھ کو صابن سے دھوئیں (میک اپ کا تو کوئی سوال ہی نہیں جس کا اہتمام ہمارے دیندار گھرانوں میں بھی اتنا ہی ہوتا ہے جتنا بے دین گھرانوں میں) سارا جسم نہایت معمولی اور ضرورت سے زیادہ ڈھیلے کپڑوں سے ڈھکا ہوا، قدرتی اور مصنوعی ہر قسم کی جاذبیت سے خالی یہ عورتیں مردوں سے الگ اپنے اپنے کاموں میں اس طرح مشغول رہتی ہیں کہ وہاں نہ بے پردگی کا کوئی اندیشہ ہے اور نہ کسی فتنہ کا۔ یہاں کی دنیا میں زندگی اس قدر سادہ اور عملی ہے کہ مرد و زن کا فرق اور اس قسم کے تعلقات غالباً ایک خشک اور غیر جذباتی ذمہ داری کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ شاید یہی وہ عورتیں ہیں جن کے لیے فقہا نے وَجْہ اور کفین کو پردہ سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

عظیم خاں نیواڑہ (۳۵) سے میں نے پوچھا۔ میو لوگ دوسری قوموں سے پیچھے کیوں ہیں۔ انھوں نے کہا میرا تو خیال ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تعلیم میں پیچھے ہیں۔ پھر وہ تعلیم کی طرف شوق کیوں نہیں کرتے اس کے جواب میں انھوں نے اپنا ایک قصہ بتایا۔ وہ گھاسولی گئے۔

"تمہارا بچہ جو آوارہ پھر رہا ہے" انھوں نے وہاں کے لوگوں سے کہا "اس کو اسکول میں کیوں نہیں بھٹلاتے۔"

جواب ملا:

"ہم بھی پڑھ جائیں اور ہمارے لڑکے بھی پڑھ جائیں تو یہ ڈھور کون چرائے اور زمیندارہ کون کرے۔"

میں نے پوچھا، دوسری قومیں جو پڑھ رہی ہیں، ان کا زمیندارہ کا کام کیا بگڑ گیا ہے۔

"خوب بڑھیا بن رہے ہو جی" عظیم خاں نے جواب دیا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میو لوگ زمانہ سے کس قدر پیچھے ہیں۔ زمانہ کے مطابق چلنا تو درکنار، وہ ابھی جانتے بھی نہیں کہ زمانہ کیسا ہے اور آج کے حالات کس قسم کے عمل کا تقاضا کر رہے ہیں۔

یہ صرف میو قوم کی بات نہیں بلکہ تمام مسلمان کسی نہ کسی طور پر اس میں مبتلا ہیں۔ اور اس کی وجہ وہ غلط قسم کے لیڈر اور رہنما ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو ایک ایسے قناعت اور توکل کا سبق دیا جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اور اسلام کی حقیقی تعلیمات میں جس کا کوئی ماخذ پیش نہیں کیا جا سکتا۔

ایک بار جب ملک میں بڑے زور وشور سے یہ غلغلہ بلند ہوا تھا کہ یہاں ایٹم بم بنایا جائے۔ کچھ بڑے لوگوں نے کہا کہ ہم بھوکے رہیں گے، مگر ایٹم بم بنائیں گے۔ اس کے جواب میں جے پرکاش نرائن نے ایک بیان دیا تھا جس میں انھوں نے کہا:

"بھوکے رہ کر ایٹم بم بنانے کی بات وہی لوگ کرتے ہیں جن کے پیٹ بھرے ہوئے ہیں۔"

یہی بات ہمارے بہت سے رہنماؤں پر بھی صادق آتی ہے۔ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ ہم دینی مدارس میں ایسے انسان پیدا کرنا چاہتے ہیں جو دنیا کے کسی کام کے نہ رہیں، جو یہ کہتے ہیں کہ دین کو دنیا کمانے سے کیا مطلب، جو یہ سبق دیتے ہیں کہ بس اللہ اللہ کرو، باقی سب کام اپنے آپ ہو جائے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اپنے تمام مسائل حل ہو چکے ہیں۔ جنھیں معلوم ہے کہ ان کے پھٹے ہوئے ٹاٹ مخملی گدوں سے بھی زیادہ سیم و زر کھینچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جن کے چاروں گوشے اس طرح مکمل ہیں کہ ایک لمحہ کے لیے بھی انھیں اندیشہ نہیں کہ ان کی کوئی حاجت اٹکی رہ سکتی ہے اور جہاں کہیں ذرا سا بھی شبہ ہوتا ہے کہ ان کو یا ان کے کسی رشتہ دار کو "مسئلہ" پیش آسکتا ہے۔ وہاں وہ عام دنیا داروں سے بھی زیادہ دنیا دار بن جاتے ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جو مسلمانوں کو سبق دے رہے ہیں کہ بس دیندار بن جاؤ۔ دنیا کے لیے تمھیں کچھ کرنے یا سیکھنے کی ضرورت نہیں لطف کی بات یہ کہ اگر ان سے پوچھیے کہ دین کا یہ راہبانہ تصور تم نے کہاں سے اخذ کیا ہے تو ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوگا۔

یہ سفر مندرجہ ذیل اصحاب کی ہمراہی میں ہوا۔

۱۔ عبدالرحیم صاحب، بڈیڈ، ضلع گوڑگاؤں۔

۲۔ عبدالغفار خاں صاحب، ننگلہ جراونڈا، ڈاک خانہ پاٹا، ضلع الور۔

۳۔ محمد یوسف صاحب حسن پور بلونڈا، ڈاک خانہ فیروز پور، گوڑگاؤں۔

۴۔ اشرف خاں صاحب، حسن پور بلونڈا، فیروز پور، گوڑگاؤں۔

۵۔ صوفی شیر خاں صاحب۔ ککرالا۔ ڈاک خانہ گلپاڑہ، ضلع بھرت پور۔

۶۔ نصرالدین صاحب۔ مبارک پور، الور۔

۵ فروری کی شام کو میں دہلی واپس آگیا۔

بارھواں سفر

دلی کے قریب " نوح " ایک تاریخی قصبہ ہے جو ہریانہ کے ضلع گوڑگاؤں میں واقع ہے۔ ۱۶ اگست ۷۲ ۱۹ کو چند گھنٹے کے لئے میرا یہاں آنا ہوا۔ یہاں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا نیاز محمد صاحب رہتے ہیں۔ ان کا مدرسہ قاسم العلوم (قائم شدہ ۱۹۶۵ء) میں نے پہلی بار تین سال پہلے دیکھا تھا، اس وقت یہ مدرسہ صرف ایک چھوٹی سی خستہ مسجد اور ایک معمولی چھپر پر مشتمل تھا۔ اب خدا کے فضل سے مسجد سے متصل اس کی عمارت بن گئی ہے اور مدرسہ ترقی پر ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔

مولانا نیاز محمد صاحب، حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے رفقاء میں سے رہے ہیں۔ آپ نے بتایا کہ حضرت مولانا فرمایا کرتے تھے کہ میں دو چیزوں کو زندہ کرنا چاہتا ہوں ـــــــ طرز اور ترتیب۔ طرز سے مراد وہ منہاج نبوت ہے جس پر آنحضور نے اسلامی دعوت چلائی اور ترتیب سے مراد یہ ہے کہ الاھم فالاھم کے اصول کے مطابق دین کے اجزاء کو بتدریج زندہ و قائم کیا جائے۔

طرز کی مثال یہ ہے کہ اپنے قدموں کو "گرد آلود" کر کے لوگوں تک پہونچنا اور زبانی طور پر دین کا پیغام لوگوں تک پہونچانا۔ ترتیب کی مثال یہ ہے کہ دین میں کلمہ اولین اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے اولین مرحلہ پر یہ درکار ہے کہ کلمہ کو لوگوں کے ذہن نشین کرایا جائے۔

روزنامہ الجمعیۃ ۱۰ اگست ۱۹۷۲ء میں ناظرین نے ایک خبر پڑھی ہوگی ـــــــ " باعزت بری ہوگیے "۔ خبر یہ تھی۔

" مولانا محمد یوسف صاحب (حسن پور بلونڈا) اور ان کے ساتھی مولانا فتح محمد صاحب عدالت فوجداری گوڑگاؤں سے ۷ اگست کو باعزت بری ہوگیے۔ ان حضرات پر بوجہ عداوت ایک شخص نے دفعہ ۳۲۵/۵۰۰ کے تحت مقدمہ دائر کیا تھا۔ بفضلہ تعالیٰ دونوں حضرات عدالت سے باعزت بری ہو گیے۔"

اتفاق سے ۷ اگست کو مجھے بلونڈا (ضلع گوڑگاؤں) جانا ہوا اور وہاں لوگوں سے ملاقات ہوئی، جو حالات معلوم ہوئے اس میں بڑی نصیحت ہے۔ یہ حالات آج تقریباً تمام دیہاتوں میں ہماری زندگی کا المناک جزء بن چکے ہیں۔ اگر مسلمان صرف اسی ایک چیز کی اصلاح کر لیں تو ان کی طاقت میں سو گنا اضافہ ہو جائے۔

۱۸ اپریل ۱۹۷۰ کا واقعہ ہے۔ ایک شخص نے گاؤں کے ایک آدمی کو کسی ذاتی رنجش کی بنا پر لاٹھیوں سے مارا۔ رات کا وقت تھا۔ زخم خوردہ شخص راستہ میں نڈھال پڑا ہوا تھا۔ کچھ لوگوں کو معلوم ہوا تو اس کو اٹھا کر گاؤں میں لائے۔ اور پھر رات ہی کو تھانہ فیروز پور جھرکا لے گیے تاکہ پولیس میں رپورٹ درج کرا دیں۔ مگر اس آدمی نے احسان کا بدلہ یہ دیا کہ مدد کرنے والوں اور اٹھا کر لے جانے والوں ہی کو تھانہ میں لکھوا دیا کہ انھوں نے ہم کو مارا ہے۔ دو سال کے مقدمہ کے بعد عدالت نے ماخوذین کو مکمل طور پر بری قرار دیا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ یہ الزام سراسر غلط تھا۔ مگر اس میں نقصان کتنا ہوا۔

۱۸ اپریل ۱۹۷۰ء کو مقدمہ شروع ہوا تھا، اور ۷ اگست ۱۹۷۲ء کو ختم ہوا۔ اس مدت میں ۶۲ پیشیاں ہوئیں اور ماخوذین کے پانچ ہزار روپئے خرچ ہو گئے (مدعی کا صرفہ اس کے علاوہ ہے) یہی نہیں۔ جب یہ قصہ شروع ہوا، تو یہاں کے رواج کے مطابق برادری کی پنچایت ہوئی اور ماخوذین پر "ڈنڈ" لگایا گیا جس کی مقدار ۵۱۰۱ روپے تھی۔ کہا گیا کہ اگر تم عدالت کے مجرم ثابت ہوئے تو روپیہ ضبط کر لیا جائے گا، اور اگر بری قرار پائے تو واپس کر دیا جائے گا۔ یہاں کا برادری کا رواج یہی ہے۔ مگر پنچایتوں کے چودھری عام طور پر مدعا علیہ پر "ڈنڈ" لگانے کے بعد مدعی سے مل جاتے ہیں تاکہ مدعا علیہ کو مجرم ثابت کر کے جمع شدہ رقم کو ہضم کرنے کا بہانہ پیدا کر سکیں۔ مذکورہ بالا واقعہ میں مدعا علیہم اگرچہ عدالت سے بری الذمہ ہو گئے۔ مگر ان کا جمع شدہ روپیہ چودھریوں نے کچھ مدعی کو مقدمہ کے لئے دیا تھا اور بقیہ خود کھا گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عدالت سے بری الذمہ ہونے کے بعد بھی ان کی رقم انھیں واپس نہ مل سکی۔

اس طرح ایک مقدمہ میں صرف ایک فریق کا دس ہزار روپیہ نقد، ۶۲ پیشیوں میں تقریباً چار مہینے کا وقت ضائع ہوا، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مسلمانوں کے اندر باہم نفرت اور عداوت بھڑک اٹھی اور ایسا انتشار پیدا ہوا جو نسلوں تک ختم ہونے والا نہیں۔

یہی صورت آج تمام دیہاتوں کی ہو رہی ہے۔ ہر جگہ باہم لایعنی قسم کے مقدمے لڑے جا رہے ہیں۔ جنھوں نے نہ صرف مسلمانوں کی اقتصادیات کو برباد کر رکھا ہے بلکہ انھیں اس طرح پھاڑ دیا ہے کہ کہیں بھی ان کی کوئی طاقت باقی نہیں رہی ہے۔

میل کھیڑلا (ضلع بھرت پور) دلّی سے ندوئی جانے والی سڑک پر دلّی سے ۱۳۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر

واقع ہے۔ یہاں سڑک کے کنارے کھلے میدان میں ایک مدرسہ میں جو پانچ سال پہلے قائم ہوا تھا، مجھے ایک شب گزارنے کا موقع ملا۔ چھپروں کی یہ بستی نظم اور سلیقہ کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ روایتی دینی تعلیم کے علاوہ دیگر چیزوں کا ذوق بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً جسمانی ورزش، تقریر و تحریر، ہندی، حساب وغیرہ۔

مختلف مدارس اور دینی اداروں کا قریب سے مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہماری دینی و ملی سرگرمیاں عام طور پر بس ایک کام تک محدود ہیں۔ اور وہ ہے "تحفظ"۔ حتیٰ کہ تحفظ کا یہ ذہن سیاسیات تک بھی پہنچ گیا ہے۔ دینی، تعلیمی، سیاسی، معاشی، غرض جس پہلو کو دیکھئے۔ ہر جگہ ہم تحفظ ڈھونڈتے ہوئے نظر آئیں گے۔

یقیناً تحفظ کسی گروہ کی ناگزیر ضرورت ہے۔ مگر صرف تحفظ ہمارے لئے زندگی کی ضمانت نہیں بن سکتا۔ زمانہ ایک سیلاب کی طرح چاروں طرف سے انڈا چلا آرہا ہے۔ وہ ہماری ملی عمارت کی دیواروں سے مسلسل ٹکرا رہا ہے۔ چاروں طرف سے ہم اس زمانی سیلاب کے نرغہ میں ہیں۔ ایسی صورت میں یہ ناممکن ہے کہ ہم صرف بچاؤ کی تدابیر سے سیلاب کا مقابلہ کرسکیں۔ سیلاب کا مقابلہ صرف جوابی سیلاب سے کیا جاسکتا ہے۔

مدارس کے نصاب میں دینیات کے ساتھ معقولات کا جوڑ اسی غرض سے لگایا گیا تھا۔ اول الذکر کا مقصد علم دین کو محفوظ رکھ کر اس کا تسلسل باقی رکھنا ہے۔ اور ثانی الذکر کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو عقلی اور فکری طور پر اس کے لئے تیار کیا جائے کہ وہ اسلام کے داعی بنیں اور اقوام عالم کے سامنے دین حق کے علم بردار بن کر کھڑے ہوں۔

دہلی سے الور جانے والی شاہراہ پر ۴۰ میل چلنے کے بعد ایک سڑک مغربی سمت میں نکلتی ہے۔ یہاں بورڈ پر حسب ذیل الفاظ لکھے ہوئے ہیں:

نورح ــــــ تاوڑو روڈ

اس نوتعمیر سڑک پر دو میل چلئے تو آپ ایک ایسی جگہ پہنچیں گے جہاں شمالاً جنوباً پہاڑ کی پھیلی ہوئی دیواریں کھڑی ہیں۔ آپ کی سڑک ان پہاڑوں کے اوپر بل کھاتی ہوئی دوسری طرف نکل جاتی ہے۔ یہاں پہاڑ سے متصل ایک قلعہ نما عمارت ہے، جس کے "کھنڈرات" میں ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم ہے۔ یہ حضرت خواجہ موسیٰ رح (وفات ۷۳۳ھ) کی درگاہ ہے جو حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے خلیفہ تھے۔ یہ مقام

ہندوستان کے سب سے چھوٹے مگر سب سے زیادہ زندہ صوبہ ہریانہ کے ضلع گوڑگاؤں میں واقع ہے۔ آپ کے مزار پر حسب ذیل قطعہ تاریخ کندہ ہے:

موسیٰ کہ بودیم عنایت
بوداست بہ پلہ ہدایت
تاریخ وفات او خرد گفت
کو صاحب سلسلہ ولایت

۷۳۳ ھ

اگست کی ۱۶ تاریخ ہے اور ۱۰ ½ بجے کا وقت۔ یہاں میں پہاڑی پر چڑھ کر ایک درخت کے سایہ میں بیٹھا ہوا ہوں۔ میرے سامنے درگاہ کی وسیع و عریض عمارت درختوں کے سایہ میں کھڑی ہوئی ماضی کی عظمت کی داستان سنا رہی ہے۔ اس کے آگے حد نظر تک کھیتوں کے قطعات ہیں جن میں جگہ جگہ درخت ہری چھتری کی مانند کھڑے ہوئے ہیں۔

اس عظیم درگاہ کو دیکھ کر خیال آیا کہ یہ جگہ شاید اس دعوتی کام کو کرنے کے لئے موزوں ترین ہے جس کا خواب حضرت مدنیؒ نے اپنی زندگی کے آخری دور میں دیکھا تھا۔ آپ کا خیال تھا کہ اب ہمیں اسلامی دعوت کا کام پوری قوت کے ساتھ کرنا چاہئے۔ حضرت مدنی کی مدراس کی تقریر (۲۶ جولائی ۱۹۵۷ء) اس سے پہلے الجمعیۃ ویکلی ۱۰ اپریل ۱۹۷۰ میں شائع ہو چکی ہے اور آپ کے ان خیالات کی بخوبی نمائندگی کرتی ہے۔

دعوتی کام کی اہمیت کی بنا پر جمعیۃ علماء ہند کے نئے دستور میں باقاعدہ اس کو ایک دفعہ کے تحت اغراض و مقاصد میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اور حال میں جمعیۃ علمائے ہند نے ایک تجویز کے ذریعے یہ طے کیا کہ برادران وطن کے سامنے تعلیمات اسلامی کی نشر و اشاعت کے لئے خصوصی کوشش کی جائے اور اس کے لئے "مجلس تعارف اسلام" کے نام سے ایک باقاعدہ شعبہ بھی وجود میں آ چکا ہے۔

ان تمام چیزوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد جو انقلاب آیا، اس میں ہمارے رہنماؤں نے دیکھا کہ ماضی کی توقعات کے برعکس یہ ہوا ہے کہ ہم ہر اعتبار سے مکمل طور پر زد میں آ گئے ہیں۔ فریق ثانی نے اپنی عددی اکثریت اور تعلیم اور اقتصادیات میں اپنی برتری کی بنا پر

زندگی کے ہر شعبہ میں ہم کو دفاع کی پوزیشن میں ڈال دیا ہے۔ ایسی حالت میں تحفظ کی تدابیر اگرچہ ضروری ہیں لیکن صرف تحفظ کی تدابیر ہمارے لئے زندگی کی ضمانت نہیں بن سکتیں۔ ساری دنیا کے مسلمہ اصول کے مطابق ہمیں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اقدام کا کوئی گوشہ تلاش کرنا ہوگا، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ دفاع کے محاذ پر دباؤ کم ہو اور ہمیں زندگی کے میدان میں قرار واقعی جگہ حاصل ہو سکے۔

یہ اقدام کا گوشہ کونسا ہے۔ یہ نظریات کا گوشہ ہے۔ ہمارے لئے اقدام کی واحد ممکن صورت یہ ہے کہ ہم خدا کے دین کو لے کر اٹھیں جو ہمارے عقیدہ کے مطابق دین فطرت ہے اور جو ساری دنیا کے لئے نجات کا واحد راستہ ہے۔ دین حق کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کی جدوجہد از روئے عقیدہ ہمارے اوپر فرض ہے مگر موجودہ حالات میں تو وہی ہمارے لئے واحد راہ عمل بھی رہ گئی ہے۔ کیوں کہ یہی وہ گوشہ ہے، جہاں ہم اقدام کی پوزیشن حاصل کر سکتے ہیں۔ دینی اعتبار سے تو پہلے بھی یہی ہمارے لئے واحد راستہ تھا اور اب تو دنیوی اعتبار سے بھی اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ ہمارے لئے باقی نہیں رہا ہے۔

جدید تمدن نے انسان کے لئے جو مسائل پیدا کئے ہیں۔ ان میں سے ایک مسئلہ وہ ہے جس کو کثافت (Pollution) کا مسئلہ کہتے ہیں۔ مشینوں اور موٹروں کے چلنے سے جو دھواں اور گیس نکلتی ہیں انھوں نے بڑے شہروں کی فضا میں آکسیجن کا تناسب بری طرح مجروح کر دیا ہے۔ اور ہوا کو اس قدر آلودہ کر دیا ہے کہ لوگ گہرا سانس لیتے ہوئے ڈرتے ہیں اور چھٹیوں کے موقع پر شہر کے باہر نکل جاتے ہیں تاکہ قدرتی ہوا میں سانس لے سکیں۔

اس صورت حال نے ان مذاہب کی عبادت گاہوں میں ایک نئی کشش پیدا کر دی ہے جو قدیم روایت کے مطابق پہاڑوں اور جنگلوں میں بنائی جاتی رہی ہیں۔ شہری فضا سے دوران عبادت گاہوں میں جدید دنیا کے نوجوان کثرت سے پہنچ رہے ہیں اور وہاں کی قدرتی فضا میں کچھ وقت گزارنا اپنے لئے روحانی اور مادی نفع کا باعث سمجھتے ہیں۔

اس لحاظ سے حضرت موسیٰ کی درگاہ نہایت موزوں مقام پر واقع ہے۔ ایک طرف وہ دلّی (قرآن کے الفاظ میں ام القریٰ) سے قریب ہے۔ دوسرے وہ قدرتی مناظر اور پہاڑی مقامات میں واقع ہے۔ جہاں آدمی پہنچ کر کچھ دیر کے لئے اپنے آپ کو ایک پرسکون روحانی دنیا میں پاتا ہے۔

اگر قوم کا تعاون ملے تو یہاں ایک اعلیٰ درجہ کا اسلامی مرکز قائم ہو سکتا ہے۔ جو انشاء اللہ پورے ملک کے لئے روشنی کے منارہ کا کام دے گا۔ درگاہ کے کھنڈرات کی تعمیر اور اس کی زمین کی حد بندی کے بعد حسب وسائل، یہاں حسب ذیل کام کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ ان لوگوں کی ذہنی وعلمی تربیت کا انتظام جو اسلام کا پیغام لے کر قوموں میں نکلنے والے ہوں۔

۲۔ لسانی اسکول جس میں تعلیم یافتہ لوگوں کو غیر مسلم اقوام کی زبانیں سکھائی جائیں۔

۳۔ تقابلی مطالعۂ ادیان کا شعبہ تاکہ دعوتی کام کی علمی بنیاد فراہم ہو سکے۔

۴۔ دارالاشاعت جس سے مختلف زبانوں میں جرائد اور کتابیں شائع کی جائیں۔ یہ مطبوعات عام طور پر دو قسم کی ہوں گی۔ ایک وہ جن کا مقصد مسلمانوں کو دعوت الی اللہ کے کام پر ابھارنا ہو۔ اور دوسرا وہ جن کا مقصد غیر مسلموں کے لئے اسلام کا تعارفی لٹریچر فراہم کرنا ہو۔

۵۔ تبلیغی جماعت کے طرز پر غیر مسلموں میں دعوتی وفود بھیجنا جس کو اسلامی اصطلاح میں سریہ کہتے ہیں۔

۶۔ اسلام کی بنیادی کتابوں اور مذہب کے موافق اور مخالف لٹریچر پر کتب خانہ فراہم کرنا۔

۷۔ اسلامی میوزیم جس میں اسلام کی تاریخی یادگاریں، تاریخی چیزوں کی تصویریں اور ایسے چارٹ جمع کئے گئے ہوں کہ اسلام کی تعلیمات اور اس کی ڈیڑھ ہزار برس کی تاریخ سامنے آجائے۔

۸۔ پرنٹنگ پریس: یہ اپنے تمام متعلقات کے ساتھ موجودہ زمانہ کا نہایت اہم شعبہ ہے۔ اور اگر ادارہ کے پاس اپنے مواصلاتی ذرائع ہوں تو دہلی سے ربط رکھ کر اس کام کو اعلیٰ تجارتی پیمانہ پر کیا جا سکتا ہے۔

۹۔ بیت المال۔

۱۰۔ ایسی صنعتیں قائم کرنا جو کم از کم جزئی طور پر ادارہ کی کفالت کا ذریعہ بن سکتی ہوں۔ دیگر چیزوں کے علاوہ اس علاقہ میں پہاڑوں پر طرح طرح کی جڑی بوٹیاں اور درخت ہیں جن سے بڑے بڑے کاروبار کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً چوٹ اور خون بند کرنے کے لئے، سانپ کے لئے، اسی طرح شہد کا کاروبار وغیرہ۔

درگاہ حضرت موسیٰ پر کبھی پورا گاؤں وقف تھا تاہم اب بھی اس کے پاس کافی زمین ہے۔ بجلی

کی لائن اور سڑک بالکل قریب سے گزر رہی ہے۔ اس کی پھیلی ہوئی عمارتیں اگرچہ بظاہر کھنڈر سی دکھائی دیتی ہیں۔ مگر پہاڑ کے اوپر قائم شدہ اس کی دیواریں گویا وہ مضبوط بنیادیں ہیں جن پر ایک پوری کالونی تعمیر کی جاسکتی ہے۔ اس طرح تمدنی ہنگاموں سے دور ہونے کے باوجود یہ جگہ اپنے اندر وہ تمام امکانات لئے ہوئے ہے جو جدید طرز کا ایک بڑا مرکز بنانے کے لئے ضروری ہیں۔

اگر ضروری وسائل مہیا ہوں اور یہاں مذکورہ بالا طرز پر کام ہو سکے تو مختلف شعبوں اور سرگرمیوں کے ساتھ یہاں کی قدرتی فضا میں وہ اسلامی ماحول انشاءاللہ وجود میں آجائے گا جو اس قرآنی آیت کا مصداق بن سکے۔ وان احد من المشرکین استجارك فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ ثم ابلغہ مامنہ ذالك بانہم قوم لا یعلمون۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ ایک ایسا اسلامی مرکز اور دعوتی ماحول بنے جہاں غیر مسلمین آئیں اور مخصوص فضا میں خدا کی باتوں کو سنیں۔

مکی دور میں دار ارقم کی یہی حیثیت تھی۔ ہجرت کے بعد مدینہ اس قسم کا اسلامی مرکز بن گیا۔ آج بھی ضرورت ہے کہ اپنے حالات کے لحاظ سے ہم اس قسم کا ایک دارالاسلام فراہم کریں۔

ملت اسلامیہ اس وقت جن حالات میں گھری ہوئی ہے وہ احیائے نو کے لئے نہایت گہری منصوبہ بندی کا تقاضا کرتے ہیں۔ تنقید اور احتجاج اور مطالبہ کی جو مہم اس وقت تمام مسلم جماعتیں چلا رہی ہیں کافی نہیں۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ موجودہ حالات میں وہ تحفظ کی ضرورت بھی پوری نہیں کر رہی ہیں جب کہ ہمیں زندہ رہنے کے لئے اقدام کی راہیں تلاش کرنا چاہئیں۔ ہمارے اندر وہ مادی اور تنظیمی زور نہیں جو احتجاج اور مطالبہ کی کسی مہم کو موثر بنانے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہماری اس قسم کی تمام کوششیں عملاً بے اثر ہو کر رہ جاتی ہیں اور دل کا بخار نکالنے کے سوا اس کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

موجودہ حالات کا تقاضا ہے کہ موجودہ کوششوں کے ساتھ دو قسم کے منصوبے ملت کے اندر پوری قوت کے ساتھ چلائے جائیں۔

۱۔ اقتصادی اور تعلیمی اعتبار سے قوم کو مستحکم کیا جائے تاکہ وہ زمین تیار ہو سکے جس پر کوئی موثر عملی جد وجہد شروع کی جاسکتی ہے۔

۲۔ اسلامی تعارف کی مہم کو جدید معیار پر اس کے سارے آداب وشرائط کے ساتھ شروع کیا جائے۔ تاکہ ایک طرف افراد ملت میں حوصلہ پیدا ہو اور دوسری طرف ماحول کے اندر نظریاتی اہمیت وافادیت قائم ہو سکے جو بقیہ تمام پہلوؤں سے آج ہم کھو چکے ہیں۔

۱۸ اگست کی شام کو سفر سے دہلی واپسی ہوئی۔

تیرھواں سفر

دہلی سے الور اور جے پور جانے والی سڑک پر ۶۰ میل چلیں تو ایک چھوٹا گاؤں آتا ہے جس کا نام سانولے باس (گوڑ گاؤں) ہے۔ ۱۶ اگست ۷۳ ۱۹ کی صبح کو میں اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ یہاں پہنچا۔ اس کے بعد نصیر باس، فیروز پور جھرکا، نیلی، مراد باس، تجارہ، دھولی اور منا کا ہوتا ہوا الور آیا۔ یہاں دو دن گزارنے کے بعد ۲۲ اگست کو دہلی واپس پہنچا۔ اس سفر کے چند مشاہدات و تاثرات یہ ہیں۔

اس سفر میں ہریانہ اور راجستھان کے مسلمانوں (میوؤں) کے حالات دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ دینی اعتبار سے دونوں جگہ کی حالت تقریباً یکساں ہے۔ البتہ میں نے دیکھا کہ دیہاتوں کے مسلمان جن کے پاس بڑی بڑی کھیتیاں ہیں۔ ہریانہ (گوڑ گاؤں) میں زیادہ تر قدیم طرز کی زراعت پر قانع ہیں۔ البتہ راجستھان کے مسلمان جدید طریقوں سے کھیتی کر کے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ اس فرق کی بڑی وجہ راجستھان کا پنچائتی نظام ہے جس نے کسانوں کی ترقی کے لئے بہت کام کیا ہے۔

ایک گاؤں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس گاؤں کا رقبہ پانچ سو بیگہ ہے اور سب ایک ہی خاندان کے پاس ہے۔ سڑک کے دونوں طرف سبز کھیت لہلہا رہے تھے، جن کے پورب پچھم میں پہاڑ کی دیواریں چوکیدار کی طرح کھڑی ہوئی ہیں۔ یہ گاؤں ہریانہ میں واقع ہے۔ اور ریاست کے دوسرے گاؤں کی طرح یہاں بھی بجلی پہنچ چکی ہے۔ کشادہ سڑک پہلے سے اس کے کنارے موجود ہے۔ گاؤں کے رقبہ کا نصف حصہ حاجی شمع سنگھ (۷۰ سال) کے پاس ہے اور بقیہ نصف ان کے بھتیجے کے پاس۔

حاجی شمع سنگھ نے نام کی اس پرانی روایت کو اپنی اگلی نسل میں ختم کر دیا ہے اور اپنے لڑکوں کے نام دین محمد اور فتح محمد رکھے ہیں۔ ان کی شرعی داڑھی اور ان کی ایمان و یقین کی باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ وہ ایک پکے مسلمان ہیں۔ ۲۰ افراد کا کنبہ رکھنے کے باوجود وہ نہ صرف تمام مسافروں کے تنہا میزبان ہوتے ہیں، بلکہ گاؤں کا مدرسہ بھی اکیلے چلا رہے ہیں۔ "کیا آپ نے ٹیوب ویل لگایا ہے" میں نے حاجی صاحب سے پوچھا "نہیں جی" انھوں نے جواب دیا۔ بجلی کے تاروں کے سایہ میں بسے

ہوئے اس گاؤں کے پاس آب پاشی کا ذریعہ صرف آسمانی بارش ہے۔ جب پانی نہیں برستا اس وقت آپ آبپاشی کے لئے کیا کرتے ہیں۔ اس کا جواب حاجی صاحب کے پاس یہ تھا " بس جی خدا دیوے ہے" ان کے دین نے ان کو قناعت اور توکل علی اللہ کا جو سرمایہ دیا ہے اس کے بعد ان کو یہ بتانا انتہائی دشوار ہے کہ وہ ٹریکٹر اور ٹیوب ویل لگا کر اپنی زمینوں سے چوگنا زیادہ پیدا وار حاصل کرسکتے ہیں۔

"آپ کے پاس عین سڑک کے کنارے ڈھائی سو بیگہ کھیت ہیں۔ آپ ٹریکٹر کیوں نہیں لیتے۔" میں نے حاجی شمع سنگھ سے کہا۔

"روپیہ نہیں"

"سرکار سے قرض لیجئے۔"

"نہیں جی میں قرض نہیں لیتا۔ آپ تو دعا کرو کہ میرے پاس ہو جائے تو میں ٹریکٹر لے لوں۔"

اس جواب سے میں سمجھا کہ حاجی صاحب شاید اس علاقے کے ان چند خوش نصیبوں میں سے ہیں جو قرض سے محفوظ ہیں۔ مگر جلد ہی میری خوش فہمی دور ہوگئی۔ کیوں کہ مجھے معلوم ہوا کہ حاجی صاحب صرف موجودہ سال (۱۹۷۲) کے لئے بنئے کے ۳۶ ہزار روپے کے مقروض ہیں۔ اس کی ادائیگی کے لئے ۲۰۰ من سرسوں، ۲۰۰ من جو، ۵ من گھی اور کیا کیا دے چکے ہیں، پھر بھی دس ہزار روپے ابھی تک باقی ہیں۔ اس قسم کے قرضوں کا سلسلہ اس بنئے سے ۲۰ سال سے چل رہا ہے۔

حاجی صاحب کی زندگی تو انتہائی سادہ ہے۔ ان کا مکان بھی بالکل معمولی ہے، نہ انھوں نے ٹیوب ویل لگایا، نہ ٹریکٹر خریدا، آخر ہر سال اتنے بڑے قرضے ان کے ذمے کس طرح ہو جاتے ہیں۔

"اس کا راز سود ہے۔" ایک شخص نے بتایا " یہاں پانچ روپیہ سیکڑہ فی ماہ شرح سود ہے۔ حاجی صاحب اس بنئے سے کپڑا وغیرہ ادھار خریدتے ہیں مختلف ضرورتوں کے لئے نقد روپے لیتے ہیں۔ یہ قرضے سود در سود مل کر بڑی بڑی رقموں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔"

حاجی صاحب کو روایتی قرضے گوارا ہیں خواہ ان پر کتنا ہی سود دینا پڑے۔ مگر حکومت کا قرضہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کیوں کہ ان کی روایات نے انھیں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ان کے ماضی نے ان کو روایتی قناعت و توکل کا جو مزاج دیا ہے اس کے بعد ان کو یہ بتانا انتہائی دشوار ہے کہ موجودہ زمانہ میں ایک ایسے گاؤں کا مالک ہونا کیا معنے رکھتا ہے، جہاں بجلی پہنچ چکی ہو اور جو ایک قومی شاہراہ

کے کنارے واقع ہو۔ وہ ٹریکٹر رکھ کر اور ٹیوب ویل لگا کر اپنی زمینوں سے چوگنا زیادہ غلہ اگا سکتے ہیں اور اپنے اور اپنے دین کے لئے زیادہ نفع بخش ثابت ہو سکتے ہیں مگر ان کے ذہنی سانچہ میں کسی طرح یہ بات اتاری نہیں جا سکتی۔ وہ دین کے اس تصور سے ناآشنا ہیں کہ جدید اقتصادی امکانات سے اپنا حصہ وصول کر کے موجودہ زمانہ میں دین کی جڑیں مضبوط کریں۔ ان کے یہاں دین محض شخصی تسکین کا ذریعہ ہے۔ وہ زمانہ پر غلبہ حاصل کرنا انھیں نہیں سکھاتا۔

اس علاقہ کا یہ سب سے بڑا مسئلہ ہے، جہالت عام ہے۔ تجارتیں انھوں نے دوسروں کے لئے چھوڑ رکھی ہیں، صرف کھیتی پر انحصار ہے اور اس میں بھی جدید طریقے استعمال کرنا ان کے ذوق کے خلاف ہے۔ مویشیوں کی طرح محنت کر کے زمین سے غلہ اگاتے ہیں اور پھر ضروریات زندگی کی خریداری میں اسے بنئے کے یہاں دے آتے ہیں۔

"آپ کیا پڑھتے ہیں" میں نے ایک نوجوان سے پوچھا۔

"ہندی"

یہ جواب اولاً میری سمجھ میں نہ آیا۔ پھر جب کئی طالب علموں نے یہی جواب دیا تو میری سمجھ میں آیا کہ اس سے مراد وہی تعلیم ہے جس کے لئے آزادی سے پہلے کا طالب علم "انگریزی" کا لفظ بولتا تھا۔ اب اس کا مطلب ہندی ہے۔ یوں بھی راجستھان میں ہندی کا چلن دیگر ریاستوں سے غالباً کچھ زیادہ ہے الور کے مہاراجہ جے سنگھ (۱۹۳۷ - ۱۸۸۲) نے ریاست الور میں ۱۹۰۳ء میں ہندی کو سرکاری زبان بنا دیا تھا۔

یہ علاقہ جس میں میرا سفر ہوا، یہ مشہور علاقہ میوات کا ایک جزء ہے۔ اب اس کا بڑا حصہ ہریانہ اور راجستھان میں واقع ہے۔ ان کی پوری تعداد تقریباً ۸ لاکھ ہے جن کی بیشتر تعداد کسانوں پر مشتمل ہے۔ الور میں دو لاکھ اور بھرت پور میں ڈیڑھ لاکھ کی تعداد ہے۔

میو قوم محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کے زمانہ میں مسلمان ہوئی۔ مگر ان کا قبول اسلام چونکہ شعوری تبدیلی کے تحت نہیں ہوا تھا ان میں قدیم زمانہ کی بہت سی رسمیں باقی رہیں۔ اگرچہ اس علاقہ میں بے شمار درگاہوں کے نشانات ہیں۔ اور اب بھی اصلاح کا کام بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے مگر جہالت کی وجہ سے ابھی تک ان کے اندر کوئی گہری اصلاح نہ ہو سکی۔

پھر یہ وہ علاقہ ہے جو تقسیم کے ہنگامہ (۱۹۴۷ء) کا بری طرح شکار رہا۔ الور، جہاں کا راجہ اگرچہ ہندو تھا، مگر عملاً تجارت کے سوا سارے سرکاری اور غیر سرکاری شعبہ پر مسلمان چھائے ہوئے تھے، ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں سے بالکل خالی ہوگیا۔ ۱۵۲ مسجدیں مسمار کردی گئیں۔ معاشیات بالکل تباہ ہوگئیں۔ تاہم خوشی کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دوبارہ اس علاقہ میں دین کو زندہ کر رہا ہے۔

بعض علاقوں کی حالت کسی قدر بہتر ہے۔ مگر بعض علاقے ابھی تک بالکل غفلت کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ تحصیل راج گڑھ (ضلع الور) میں ایسے گاؤں ہیں جن کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا۔ ایک حاجی صاحب اس علاقہ کے ایک گاؤں میں گئے۔ نماز کا وقت ہوا تو انھوں نے نماز ادا کی، ان کو قبلہ رخ سجدہ کرتے دیکھ کر ایک مسلمان لڑکی نے کہا:

کائیں بھایا اپنے رام جی کو ڈھوک اِنکو ہی دیویں ہیں۔

(کیوں بھائی اپنے خدا کو سجدہ اس طرف کو کرتے ہیں)

اس نے ہندوؤں کو ڈنڈوت کرتے دیکھا تھا۔ مگر مسلمان کو خدا کے آگے جھکتے نہیں دیکھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ مسلمان لوگ کس سمت میں جھک کر عبادت کرتے ہیں۔ ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں خواجہ معین الدین اجمیری کے زمانہ کے حالات میں لکھا ہے:

نہ کس داند ہنجار قبلہ نہ کس شنیدہ اللہ اکبر

کیسی عجیب بات ہے کہ ۸۰۰ سال بعد بھی یہ صورت حال ابھی تک موجود ہے۔

اس کے باوجود اسلام سے عقیدت اتنی زیادہ ہے کہ آپ وہاں جائیں اور کسی میو سے کہیں کہ وضو کے لئے پانی چاہئے تو وہ اپنی لڑکی کو آواز دے کر کہے گا۔

"او چھوری! ای نماز پڑھے گو، یہ کو پانی مانج کے لاجیو"۔

(یہ نماز پڑھیں گے۔ ان کے لئے برتن مانجھ کر اس میں پانی لاؤ) اور جب آپ نماز کے لئے کھڑے ہوں گے تو وہ دور نہایت ادب سے زمین پر خاموش بیٹھ جائیں گے۔

الور کے پس منظر میں اونچے اونچے پہاڑوں پر ایک وسیع قلعہ ہے جو سات میل کے رقبہ میں پہاڑ کے اوپر پھیلا ہوا ہے۔ یہ بند رہتا ہے۔ البتہ وہاں ایک مختصر سا عملہ ہے جس سے رابطہ کا ذریعہ صرف وائرلیس ہے۔ ۱۹ اگست کو ایس پی کی اجازت سے ہم کو وہاں جانے کا موقع ملا۔ وائرلیس کی ہدایت

پر ۳ بجے اس کا بھاری گیٹ کھلا اور ہم اندر داخل ہوئے۔ الور شہر سے اوپر قلعہ تک ایک گھومتی ہوئی سڑک ہے جس پر صرف جیپ کے ذریعہ جایا جاسکتا ہے۔ چھ میل کا فاصلہ طے کر کے ہم دربار محل میں پہنچے، جہاں کئی منزلہ عمارتیں ہیں پرانے زمانے کی توپیں رکھی ہوتی ہیں۔ توپوں کے اوپر ان کی تفصیل کھدی ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب راج گڑھ کے کاریگر سیوا رام کی بنائی ہوئی ہیں جو مہاراجہ بختاور سنگھ اور مہاراجہ ونے سنگھ کے لئے بنائی گئی ہیں۔ ان پر سنہ ۱۸۶۳، ۱۸۶۶، ۱۸۷۲ بمعہ سمبت ہندی میں لکھا ہوا ہے۔ بعض توپوں پر ان کا نام "ارجن بان" لکھا ہوا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستانی جو بابر کے داخلہ ہندستان (۱۵۲۶ء) کے وقت توپوں سے بالکل ناواقف تھے ۱۹ ویں صدی کے وسط تک اس فن کو سیکھ کر اس کے ماہر بن چکے تھے۔

ایک جگہ سڑک ایک عمارت کو چھوڑتی ہوئی گزرتی ہے۔ یہ ایک مسجد ہے جو اپنے طرز تعمیر کے اعتبار سے مغلوں سے پہلے کی معلوم ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کو سلیم شاہ سوری نے بنوایا تھا۔ اس کے ساتھ "سلیم ساگر" بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اکبر سلیم سے ناراض ہوا تو اس کو یہاں قید کر دیا تھا۔

مسجد خستہ حالت میں ہے۔ وہاں میں نے اور میرے ساتھیوں نے عصر کی نماز پڑھی۔ غالباً سیکڑوں برس بعد یہاں نماز پڑھی گئی ہوگی۔ مسجد کے اندر محراب کے اوپر لاالٰہ الااللہ پتھر پر لکھا ہوا لگا ہے۔ باہر کی طرف تین دروازوں پر "یا اللہ" لکھا ہوا ہے۔

اراولی پہاڑوں کے دامن میں بسا ہوا الور شہر کس نے بنایا تھا۔ ایک شہرت یہ ہے کہ راجہ پرتاپ سنگھ نے اس کو بسایا تھا۔ میر حسن نے تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ خان زادہ علاول خاں (۱۵۲۵) اس کے بانی ہیں۔ اور الور کا لفظ "علاول" کی بدلی ہوئی شکل ہے جو خود علاؤالدین کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

الور سے ۹ کیلومیٹر کے فاصلہ پر جے سمند بند ہے اور ۲۲ کیلومیٹر کے فاصلہ پر سیلی سیڑھ۔ یہ دونوں مقامات یہاں کے دوسرے مقامات کی طرح سیاحی کے مراکز ہیں جو قدرت کی حسین گود میں واقع ہیں۔ پورا راستہ سبز پوش پہاڑوں اور ہرے بھرے درختوں کے درمیان طے ہوتا ہے۔ اس آفاقی حسن کے درمیان سفر کرتے ہوئے ہم وہاں پہنچے۔

جے سمند بند راجہ جے سنگھ (۱۹۳۷-۱۸۸۲) نے بنوایا تھا۔ یہ اس علاقہ میں آبپاشی کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ ریاستی حکومت نے یہاں ایک ریسٹ ہاؤس بنوایا ہے جس نے اس کے حسن میں کافی اضافہ کر دیا ہے۔

سیلی سیڈھ راجہ ونے سنگھ (۱۸۱۵ء - ۱۸۸۷) نے اپنی رانی کے لئے ۱۸۴۵ء میں بنوایا تھا۔ اب اس کا بند آبپاشی کا ذریعہ ہے اور اس کی عمارت مزید اضافہ کے ساتھ سیاحوں کے قیام کا مرکز ہے۔ اس میں ایک آرٹ گیلری ہے۔ اس میں مغل بادشاہوں کی تصویریں ہیں اور اس زمانہ کے آرٹ کے نمونے ہیں جن میں کئی ایسے ہیں جن کا کیپشن فارسی زبان میں لکھا ہوا ہے۔ ایک تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ شہنشاہ اکبر کا لڑکا سلیم ۳۱ اگست ۱۵۶۹ء کو پیدا ہوا ہے اور محل میں اس کی خوشی منائی جا رہی ہے۔ ایک تصویر میں بہادر شاہ ظفر کا عید کا جلوس بہت بڑی تصویر میں دکھایا گیا ہے۔ یہ عمارت ۷ منزلہ ہے۔

ونے سنگھ فارسی اور عربی کا قدرداں تھا۔ اس نے چالیس ہزار روپے کے خرچ سے قرآن کا ایک مطلا نسخہ تیار کرایا۔ اسی طرح گلستاں بوستاں کا نسخہ ایک لاکھ روپے خرچ کرکے بہت اعلیٰ شکل میں لکھایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے خود اپنے ہاتھ سے بھی قرآن لکھا تھا۔ آج سے پہلے اسلام کا پیغام پھیلانے کے کتنے مواقع تھے۔ ہمارے لیڈروں نے ان مواقع کو صرف برباد کیا اور نئے مواقع پیدا نہ کرسکے۔

الور کی موجودہ آبادی تقریباً سوا لاکھ ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے تقریباً ۲۵ ہزار تھی۔ تقسیم سے پہلے یہاں ۵۲ مسجدیں تھیں اور آبادی میں دو تہائی مسلمان تھے۔ یہاں کا پہلا ہندو راجہ پرتاپ سنگھ (۱۷۷۵ء) تھا۔

ڈاکٹر جے سنگھ نیرج (استاد راج رشی کالج الور) نے کالج میگزین (۱۹۶۹ء) میں اپنے ہندی مقالہ میں لکھا ہے کہ ابراہیم لودی جب ۱۵۱۷ء میں دلی کے تخت پر بیٹھا تو اس نے اپنے خالہ زاد بھائی حسن خاں میواتی کو الور اور میوات کا علاقہ دے دیا۔ یہ ایک لائق راجہ تھا۔ اس سے پہلے یہ علاقہ کسی منظم ریاست کی شکل میں نہ تھا۔ یہ اس علاقہ کی پہلی منظم ریاست تھی۔ الور کا "قلعہ جو پہاڑوں کے اوپر سات میل کے علاقہ میں پھیلا ہوا ہے اس کو ابتدائً چھوٹی سی شکل میں بڑگوجروں نے مٹی اور پتھر سے بنوایا تھا۔ اس کی بنیاد پر راجہ حسن خاں میواتی نے چونے اور پتھر کی کنگورہ دار دیواریں اور برجیاں بنوائیں جو اب بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ سڑکیں، باغ، سرائیں وغیرہ بنوائیں جن کے آثار ریٹوکرا، تاوڑو، فیروزپور، بھونڈسی، تجارہ، الور اور ڈھنڈیکہ وغیرہ میں اب بھی ملتے ہیں۔ وہ علم پسند تھا اور اہل علم کی بہت قدردانی کرتا تھا۔" ان سب کی اتر کت سودیش پریم اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اسلام دھرما ولمبی ہوتے ہوئے بھی پرن وہ پرتشٹھا کے لئے سودھرمی کے ساتھ یدھ کرنے

میں کبھی نہیں چوکتا تھا۔" اس کے بعد ڈاکٹر جے سنگھ نے اس تاریخی واقعہ کو لکھا ہے کہ بابر کے مقابلہ میں میواڑ کے رانا سانگا نے بیانہ کے میدان میں جو لڑائی لڑی تھی، اس میں راجہ حسن خاں میواتی بھی اپنی ۱۲ ہزار فوجوں کے ساتھ شریک تھا۔ دونوں راجہ اس جنگ میں مارے گئے۔ چنانچہ اس علاقہ کا ایک لوک گیت ہے:

یہ میواتی وہ میواڑی مل گئے دونوں سینانی
ہندو مسلم بھاؤ چھوڑ مل بیٹھے دو ہندستانی

الور شہر میں راجہ کا بہت بڑا محل ہے۔ اس کے ایک حصہ میں میوزیم بنا دیا گیا ہے۔ اس کے اندر بہت سی عبرت انگیز چیزیں ہیں۔ ایک بہت بڑا وکٹوریہ کراس ہے جو جنوری ۱۸۷۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے راجہ منگل سنگھ کو دیا گیا تھا۔ اس پر اردو زبان میں یہ الفاظ کڑھے ہوئے ہیں:

وکٹوریہ قیصر ہند کے حضور سے

یہ سو برس پہلے اردو زبان کی اہمیت کو بتاتا ہے۔ فارسی زبان کے کتبات اور پتھر کی تختیاں کثرت سے ہیں۔ تصویروں پر فارسی کے کیپشن ہیں۔ فارسی کی قلمی کتابیں کثرت سے ہیں مثلاً انوار سہیلی، تاریخ فرشتہ، تحفۃ العراقین، شاہنامہ، عجائب المخلوقات وغیرہ۔

مغل آرٹ پندرھویں صدی عیسوی میں سمرقند اور ہرات میں عروج پر تھا۔ سولھویں صدی میں مغل آرٹ یا فارسی آرٹ بابر کے ساتھ ہندستان آیا۔ اس کے نمونے کثرت سے موجود ہیں۔ قرآن کا نسخہ فارسی ترجمہ کے ساتھ نہایت عمدہ لکھا ہوا سونے کے کام کے ساتھ ہے۔ اس سے نہ صرف فارسی کی عمومی اہمیت ظاہر ہوتی ہے بلکہ اس زمانے میں اسلامی کتب کے ساتھ اعتنا کا ثبوت ملتا ہے اگرچہ اس اعتنا کو ہم نے بالکل استعمال نہیں کیا۔

مہاراجہ جے سنگھ (۱۸۸۲ - ۱۹۳۷ء) کی تصویر خصوصی اہتمام کے ساتھ ہے جو ۱۸۸۲ میں گدی پر بیٹھا تھا۔ یہ ایک آزادی پسند راجہ تھا اس کا انتقال پیرس میں ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ طبعی موت نہ تھی بلکہ اس کے پیچھے انگریزوں کا ہاتھ تھا۔

میوزیم میں الور کے تمام راجاؤں کی تلواریں ہیں۔ اکثر تلواروں پر فارسی میں لکھا ہوا ہے۔ مثلاً مہاراجہ ونے سنگھ کی تلوار پر "عمل حاجی نور محمد کابلی" ۱۹۰۴ء، راجہ شیودان سنگھ کی تلوار پر "عمل

محمد ابراہیم" ۱۹۲۶ء درج ہے۔ اسی طرح ہر قسم کی تلواروں پر مسلم صنعت کاروں کے نام ہیں، فولاد کے نام المانی فولاد، خراسانی فولاد لکھے ہوئے ہیں۔ ایک تلوار ۱۸۳۰ء کی بنی ہوئی ہے اور اس پر "عمل محمد صادق کابلی" درج ہے۔ مغل بادشاہوں کی تلواریں بھی ہیں۔ اکبر کی تلوار پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی ولی اللہ لکھا ہے۔ مزید یہ شعر درج ہے:

بہر جا کہ شمشیر من کار کرد

یکے را دو کرد و دو را چار کرد

اسی طرح فوجی چھریاں ہیں۔ کسی پر وما النصر الا من عند اللہ کسی پر وما توفیقی الا باللہ لکھا ہوا ہے۔ ایک ریوالور اور ایک بندوق پرنس آف ویلز کی طرف سے ۱۸۷۷ میں راجہ منگل سنگھ کو دیا گیا تھا۔

تلواروں سے گزر کر جب بندوقوں اور طپنچوں دریوالوروں کی الماریاں آتی ہیں تو وہاں نقشہ بدل جاتا ہے۔ اب بنانے والوں کے نام انگریزی زبان میں درج ہیں مثلاً کنگ، اسمتھ، ولس وغیرہ۔ یہ لندن یا کسی اور مغربی شہر کے کارخانے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک فوجی صنعت دستی ہتھیاروں (تلواروں) تک محدود تھی اس کے صانعین مسلمان تھے۔ مگر جب میکانکل طاقت کا زمانہ آیا اور دور مار ہتھیار بننے لگے تو فوجی صنعت یورپ کے ہاتھ جا چکی تھی۔

الور میرا پہلی بار آنا مولانا محمد ابراہیم صاحب مرحوم (۱۹۱۲-۱۹۷۰ء) کے آخری زمانہ میں ہوا تھا۔ مولانا ابراہیم صاحب جو کبھی اس علاقہ کے مسلم لیڈر رہتے تھے۔ ان دنوں ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر داؤد پور کی شکستہ مسجد کے پاس درخت کے نیچے بیٹھے رہتے تھے۔ ان کو جب پہلی بار میں نے دیکھا تو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ماضی کے کھنڈر کی چوکیداری کر رہے ہوں۔ یہ وہ علاقہ ہے جو ۱۹۴۷ء کی سیاسی قیامت میں سب سے زیادہ تباہ ہوا تھا ——— بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کا خیمہ یہاں سے اکھڑ چکا ہے۔ مگر موجودہ سفر میں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ قدیم کھنڈر کے اوپر دوبارہ نئی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ مسلمان دوبارہ آکر شہر میں بس رہے ہیں۔ الور اسٹیشن کے پاس کی مسجد از سر نو تعمیر کی گئی ہے۔ اور اسی کے ساتھ ایک مدرسہ کی بنیاد بھی رکھ دی گئی ہے۔ اگرچہ ابھی مسجد اور مدرسہ دونوں کی عمارت بڑی حد تک نامکمل ہے۔

الور سے ایک ہندی پندرہ روزہ بھی "میوات سماچار" کے نام سے ۱۵ اگست ۱۹۷۳ء سے

جاری ہوا ہے جس کے ایڈیٹر منشی خاں میواتی ہیں۔

مناکا میں میری ملاقات ایک ۸۰ سالہ خاتون سے ہوئی جن کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ وہ "عجائز مدینہ" کیسی ہوں گی جن کے دین پر مرنا دور عباسی کے متکلمین نے پسند کیا تھا۔ اس خاتون کو یہ معلوم ہوا کہ الور کی واحد زیر تعمیر مسجد کی چھت کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے۔ اس نے اپنے تین لڑکوں کو جمع کیا اور پوچھا "کیا تمہاری جائداد میں میرا کچھ حق ہے"۔ سب نے کہا ہاں "میرے مرنے کے بعد تم میرے لئے کچھ کروگے" سب نے جواب دیا ضرور کریں گے۔ خاتون بولیں "جو کچھ تم میرے اوپر خرچ کرنا چاہتے ہو، وہ سب مسجد کے لیے دے دو، اور جب میں مروں تو تم صرف یہ کرنا کہ ایک گڑھا کھودنا اور میں جس کپڑے میں ہوں اسی کپڑے کے ساتھ مجھ کو گڑھے میں دھکیل کر مٹی بھر دینا"۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے لڑکوں نے پورے شوق کے ساتھ مسجد کی تعمیر میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس کے بعد یہ خاتون نفلی حج کے لئے جا رہی تھیں۔ مولانا مفتی جمال الدین صاحب نے ان سے کہا کہ اس علاقہ میں مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ آپ کے لئے نفلی حج سے زیادہ ثواب یہ ہے کہ آپ حج کا روپیہ مدرسہ کی تعمیر کے لئے دے دیں"۔ انھوں نے فوراً سارا روپیہ مدرسہ کے لئے دے دیا۔ اور اپنے لڑکے سے کہا:

"بیٹے کم کھاؤ اور کم پہنو مگر مدرسہ ضرور بنا دو"۔ اس طرح متعدد لوگ ہیں جو مسجد اور مدرسہ کی شکل میں اس دینی مرکز کی تعمیر کے لئے لگ گئے ہیں۔ مثلاً حاجی مل خاں، شتناب خاں صاحب وکیل، چودھری باگھ سنگھ، مولانا عبدالرحمٰن صاحب وغیرہ۔ مگر ایک موثر دینی ادارہ کی تعمیر کے لئے جو وسائل درکار ہیں وہ ابھی بہت زیادہ تعاون کا تقاضا کر رہے ہیں۔

مدرسہ اشرف العلوم اگرچہ آباد ہو گیا ہے۔ مگر ابھی بہت کام باقی ہے۔ مسجد میں برآمدہ نہیں ہے پوری مسجد کا پلاسٹر باقی ہے۔ پنکھے وغیرہ بھی نہیں ہیں۔ مدرسہ کی تین کمروں پر مشتمل عمارت ایک شخص (حاجی مل خاں) کی ہمت سے بن گئی ہے۔ مگر اس کے آگے ابھی برآمدہ نہیں۔ اساتذہ کے رہنے کی کوئی جگہ نہیں۔ عشر کا جو غلہ آتا ہے اس کے لئے گدام کی ضرورت ہے۔ مدرسہ کی توسیع کے لئے قریب کی ۱½ بیگھ زمین مل سکتی ہے۔ مگر اس کے لئے بھی تقریباً ۲۰ ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ یہ زمین مل جائے تو کل رقبہ ۳½ بیگھ ہو جائے گا اور پھر باؤنڈری بنا کر ایک باقاعدہ ادارہ کی شکل بن سکتی ہے۔

ہماری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ بڑے بڑے کام تو ہم کو کام نظر آتے ہیں، مگر "چھوٹے کام"

کا کام ہونا ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ حالانکہ زندگی کی تعمیر حقیقۃً چھوٹے کاموں سے ہوتی ہے نہ کہ بڑے بڑے ہنگاموں سے۔

اس علاقہ میں اسلام اور مسلمانوں کی جو بے پناہ بربادی ہوئی ہے، اس کو دوبارہ تعمیر کی شکل دینے کے لئے کسی "عظیم الشان اجلاس" یا "تاریخ ساز ریزولیوشن" کی ضرورت نہیں صرف اس کی ضرورت ہے کہ اس کھنڈر کی جو اینٹیں باقی رہ گئی ہیں ان پر کچھ لوگ بیٹھ جائیں۔ اور خاموش عمل کے ذریعہ نئے مستقبل کی تعمیر شروع کر دیں۔ مولانا مفتی جمال الدین صاحب، مدرسہ اشرف العلوم (الور) اس کی واحد مسجد میں بیٹھ کر یہی کام کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں ہمت دے اور لوگوں کو ان کے تعاون کی طرف متوجہ کر دے۔ کیوں کہ آج اس قسم کے لوگوں کے ساتھ تعاون سے بڑا ثواب کا کام کوئی نہیں۔

الور میں "میو بورڈنگ" کے نام سے ایک عمارت ہے جس کا کل رقبہ چار بیگھ سے زیادہ ہے۔ یہ ایک شاہراہ پر واقع ہے۔ اس کے اندر ایک مسجد تھی جو ۱۹۴۷ء میں مکمل طور پر مسمار کر دی گئی تھی۔ الور کے کلکٹر جناب پرکاش چند صاحب نے اپنی خصوصی عنایت سے اس کی دوبارہ تعمیر کی اجازت دے دی۔ ۲۸ اگست کو ساڑھے بارہ بجے جب میں نے بنیاد کھودنے کے لیے پہلا پھاوڑا مارا، تو علاقہ کے کافی مسلمان جمع تھے۔ لوگوں میں اس قدر جوش و خروش تھا کہ ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ وہ بھی کچھ پھاوڑے مار کر اس سعادت میں شریک ہو جائے۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے امت محمدی اپنی تعمیر نو کے لئے بے تاب ہو اٹھی ہو۔ اور اس کا ہر فرد یہ چاہتا ہو کہ اس کام میں اپنا حصہ ادا کر کے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دے۔ الور سے چار میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں "دھولی دوب" ہے۔ یہ ایک تاریخی گاؤں ہے شہنشاہ اکبر (۱۶۰۵-۱۵۵۶ء) کے زمانے میں ایک بزرگ لال داس تھے جنھوں نے یہاں ایک درگاہ قائم کی تھی۔ سرکاری کاغذات میں اس کا نام "درگاہ شری لال داس" لکھا ہوا ہے۔ یہ ہندو مسلمان دونوں میں مقبول تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا اصل نام لال خاں تھا۔ مضبوط دیواروں کے اندر آٹھ بیگھ زمین اور درگاہ کی مستحکم عمارتیں ہیں۔ آج کل یہ ہندو صاحبان کے قبضہ میں ہے۔ انھوں نے اس کے اندر لیموں کے درخت لگا دئے ہیں۔ اور ٹیوب ویل لگا کر کھیتی کرتے ہیں۔ ایک سال میں صرف پپیتہ کی پیداوار چودہ ہزار میں فروخت ہوئی۔ ٹیوب ویل سے سینچائی کرنا خود بھی ایک مستقل آمدنی کا

ذریعہ ہے۔ اس قسم کی اور بھی متعدد درگاہیں اس علاقہ میں ہیں مگر وہ کسی آباد کرنے والے کے انتظار میں ویران پڑی ہوئی ہیں۔

پہاڑ کی بلندی پر انھوں نے ایک مسجد بنائی تھی۔ ہم لوگ چڑھ کر اوپر گئے۔ ہندو صاحبان نے اس کو بھی مرمت کر کے اچھی حالت میں بنا دیا ہے۔ اس طرح کی مسجدیں پہاڑوں پر بہت نظر آتی ہیں۔ اس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ قرآن نے جس "تبتل" کا حکم دیا تھا، وہ حقیقۃً نفسیاتی تبتل تھا۔ مگر دوسرے مذاہب کے اثر سے لوگوں نے اس کو جغرافی تبتل کے معنی میں لے لیا۔ وہ ذہن جس میں عبادت وریاضت قوت حاصل کرنے کے لئے تھی وہ گوشہ گیر ہونے کے ہم معنی بن گئی۔

لال داس یا لال خاں کے متعلق مسلمانوں میں بہت سی کرامتیں مشہور ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ جنگل سے لکڑی کاٹ کر اور شہر میں لے جاکر فروخت کرتے تھے اس کو ایک بنیا صرف دو ٹکے میں خریدتا تھا، وہ اس سے مالا مال ہو گیا۔ کیونکہ یہ جنگلی لکڑی بنیا کے پاس صندل کی ہو جاتی تھی۔ ایک بار جب لال خاں لکڑی کا گٹھا سر پر لئے ہوئے تھے، ان کی طرف ہاتھی چھوڑ دیا گیا مگر اس نے ان کے پاس آکر سر جھکا دیا۔ اس طرح کے بے شمار قصے اس علاقے میں سننے میں آتے ہیں۔ ایک مقام پر مجھے بتایا گیا کہ ایک بزرگ تھے۔ ان سے ایک مذہب والے نے مقابلہ کیا اس نے کہا کہ تمہارے مذہب میں چاند ۲۹، ۳۰ کو نکلتا ہے۔ میں اس کو ۲۸ تاریخ کو نکال سکتا ہوں۔ اور اس نے جادو کے زور سے آسمان پر چاند بھیج دیا۔ بزرگ نے اپنا جوتا اوپر پھینکا اور وہ اس کے چاند کو زمین پر اتار لایا۔ جس مسلمان سے ملئے اس کے پاس اس قسم کی کراماتی داستانوں کی الف لیلہ موجود ہوگی۔ مگر کوئی یہ نہیں سوچتا کہ ایسی کرامتوں کے بزرگ ملت اسلامیہ کی قسمت کو کیوں نہیں بدل سکے۔ ہماری لکڑی صندل نہ بن سکی۔ نہ ہمارے حریفوں کا چاند زمین پر گرایا جا سکا۔ اور نہ ہم کو کچلنے والے ہاتھی نے ہمارے آگے سر جھکایا۔

حقیقت یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کے احیاء ثانی میں کوئی بھی چیز اتنی بڑی رکاوٹ نہیں ہے جتنی بڑی رکاوٹ یہ فرضی اور قطعی گھڑی ہوئی داستانیں ہیں۔ یہ داستانیں قوم کے مزاج میں اس طرح رچ بس گئی ہیں کہ اب اس کے لئے ممکن نہیں رہا ہے کہ اس کی طلسماتی فضا سے باہر آکر سوچ سکے۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ اب شاید اس قوم کا احیائے ثانی ممکن ہی نہیں۔ طلسماتی افکار کے جس تاریخی بوجھ کو یہ قوم اٹھائے ہوئے ہے اس کو اتار پھینکنا اس کے بس میں نہیں ہے۔ اور جب تک یہ نہ ہو، قوم کا دوبارہ

اٹھنا ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ایک ایسی قوم درکار ہے جو آج کی دنیا میں اس کے دین کی حامل اور داعی بن سکے۔ اس کی صورت اب غالباً صرف یہ رہ گئی ہے کہ ایسی قوم میں کام کیا جائے جو سائنس کی بنیاد پر اٹھی ہو اور یہ کام خالص قرآنی انداز میں ہو۔ قرآنی دین کو سائنسی مزاج ہی زیادہ بہتر طور پر قبول کر سکتا ہے۔ ایسی کوئی قوم اگر اٹھ جائے تو اس کے اختلاط سے موجودہ ملّت میں بھی صحیح اسلامی مزاج پیدا ہو سکتا ہے۔ موجودہ حالات میں اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کیونکہ طلسماتی ذہن میں قرآن کا فکر کبھی اپنی جگہ نہیں بنا سکتا۔

قدیم زمانہ میں یہ مزاج تھا کہ پہاڑی علاقوں میں الگ تھلگ درگاہیں بناتے تھے۔ اس علاقہ میں اراولی کی پہاڑیاں پھیلی ہوئی ہیں اور ان کے اندر جگہ جگہ مسجدیں اور درگاہیں بنی ہوئی ہیں۔ یہ درگاہیں اکثر بہت بڑی بڑی ہیں۔ کتنوں کے ساتھ سیکڑوں بیگھہ زمینیں تھیں جو اب باقی نہ رہیں۔ دوسری قوموں میں بھی اس قسم کے مراکز تھے۔ ان کو انھوں نے ہر جگہ آباد کر رکھا ہے، اور ان سے خوب کام لے رہے ہیں، اسی کے ساتھ ان کو سرسبز بھی بنا رکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ خود مسلمانوں کی درگاہوں پر بھی قبضہ کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس صرف قدیم بزرگوں کی کرامات کی داستانیں ہیں۔ ان کو یہ نہیں معلوم کہ یہ درگاہیں جو قدیم زمانہ میں دینی مراکز تھیں ان کو دوبارہ اس دور کے دینی مراکز میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

چودھواں سفر

دہلی ـــــ احمد آباد لائن پر دہلی سے پانچ کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک اسٹیشن ہے "بیاور" یہ ضلع اجمیر میں واقع ہے۔ ۲۶ اگست ۱۹۷۳ کو مجھے دو دن کے لیے وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ راجستھان کے اس قدیم قصبہ میں تقریباً ۵ ہزار کی تعداد میں مسلمان آباد ہیں۔

بیاور سے جودھ پور کی طرف چلئے تو ایک طرف اونچے نیچے پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ دوسری طرف آفاق گیر قدرتی مناظر کے ساتھ ریلوے لائن اور پختہ سڑک بل کھاتی ہوئی احمد آباد کی طرف چلی جاتی ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد یہ سڑک کافی چوڑی اور عمدہ بنا دی گئی ہے۔

اس علاقہ کی بیشتر زمین پتھریلی چٹانوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ ان چٹانوں کے درمیان زرخیز زمین کے چھوٹے چھوٹے قطعات ہیں۔ ان قطعات کے گرد تقریباً ایک سو میل تک چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد ہیں۔ پتھر کی اس دنیا کے درمیان جگہ جگہ ہرے بھرے کھیتوں اور درختوں کا سلسلہ بڑا حسین معلوم ہوتا ہے۔ یہ سارا علاقہ تقریباً صدفی صد مسلم علاقہ ہے۔ صرف چند بازار ہیں جہاں دوسری قوموں کی آبادیاں ہیں جو تجارت کرتے ہیں۔ لیکن اگر ان مسلمانوں کو دیکھئے تو مشکل ہی سے ان کے درمیان کوئی مسلم نشان دکھائی دے گا۔ ان کی معاشرت، ان کے نام، ان کی رسمیں، ان کے لباس کسی میں بھی کوئی اسلامی انفرادیت نظر نہیں آتی۔ ان کی بستیوں میں مشکل سے چند بستیاں ہوں گی جہاں مسجد کے منارے دکھائی دیتے ہوں۔ ان کی اسلامیت اس کا نام ہے کہ وہ اپنے کو "مسلمان" سمجھتے ہیں۔ لڑکوں کے ختنے کراتے ہیں، ذبیحہ کھاتے ہیں اور نکاح کسی قاضی سے پڑھواتے ہیں (اگرچہ بعض ایسے بھی ہیں جو پھیرے کروا لیتے ہیں)

تقسیم کے بعد اس علاقہ میں جمعیۃ علمائے ہند نے کوئی ڈیڑھ درجن مکاتب قائم کئے تھے، جن میں بیشتر اب ختم ہو چکے ہیں۔ تبلیغ کے لوگ کبھی کبھی آتے ہیں جن کے ذریعہ اس علاقہ میں دین کی آواز پہنچتی رہتی ہے۔

یہ لوگ اپنے جد اعلیٰ (میرا) کے نام پر میراتی کہلاتے ہیں۔ پوری قوم جاہل ہے، زراعت کے سوا کوئی اور معاشی کام نہیں جانتی۔ کچھ لوگ مویشی بھی پال لیتے ہیں۔ باقی زندگی کے تمام سامان بنیوں کے یہاں سے خریدتے ہیں۔ ۹۰ فی صد لوگ بنیوں کے مقروض ہیں اور ان کی کمائی کا بڑا حصہ، یا خریداری میں، یا سودی قرض میں بنیوں کی جیب میں چلا جاتا ہے۔

۲۶ اگست کی شام کو جب میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ میرات کے ایک گاؤں لال پورہ پہنچا تو ہمارے میزبان کا بلند چٹان پر بنا ہوا مکان بالکل خالی تھا۔ معلوم ہوا کہ چھوٹے بڑے سب کھیتوں اور جنگلوں میں کام پر گئے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ساری قوم رات دن محنت ومشقت میں مصروف رہتی ہے۔ مگر ان کی زندگی ایک اندوہناک داستان ہے۔ پہاڑوں اور سرسبز قطعات کے درمیان بسی ہوئی قوم دینی اعتبار سے جہالت میں مبتلا ہے اور دنیاوی اعتبار سے استحصال کا شکار ہے۔

لال پورہ عین سڑک کے کنارے واقع ہے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ بجلی گزر رہی ہے۔ اس بستی میں "احمدجی" اس اعتبار سے نمایاں ہیں کہ وہ تعلیم یافتہ بھی ہیں اور دینی مزاج بھی ہے۔ تبلیغی جماعتیں جو یہاں آتی ہیں وہ زیادہ تر امام الدین میواتی (بیاور) اور احمدجی (لال پورہ) کے تعاون سے کام کرتی ہیں۔ احمدجی اپنی سڑک کے کنارے کی معقول زمین مسجد اور مدرسہ کے لئے وقف کرنے کو تیار ہیں۔ اگر ایک شخص اپنے کو اس علاقہ کی خدمت کے لئے وقف کرے، یہاں سڑک کے کنارے کی موجودہ زمین پر مسجد اور مدرسہ کی بنیاد رکھے تو دس پانچ سال میں بہت کچھ کام ہو سکتا ہے۔

ہم لوگ ایک گاؤں سے گزر رہے تھے۔ گاؤں کے کنارے کچھ بچے ایک چٹان کے اوپر کھیل رہے تھے۔ "نماز پڑھ بالا" (نماز پڑھنے والے لوگ ہیں یہ) ایک لڑکے نے کہا۔ ہماری داڑھی اور ہمارے لباس سے غالباً اس نے یہ خیال کیا کہ یہ مولوی لوگ ہیں۔ نماز پڑھتے ہوں گے۔ یہاں نماز وغیرہ اجنبی چیزیں ہیں۔ وہ اگرچہ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں اور مسلمان ہونے پر فخر بھی محسوس کرتے ہیں، مگر ان کے سروں پر چوٹیاں نظر آئیں گی، ان کے لباس میں کہیں سے کوئی "اسلامیت" دکھائی نہیں دیتی حتیٰ کہ جگہ جگہ بستیوں میں ان کے اپنے قومی بت بنے ہوئے ہیں، جن کی وہ پوجا کرتے ہیں۔ میں نے خود اس سفر میں ایسے کئی بُت دیکھے۔

اس علاقہ میں سڑک اور ریلوے لائن ہے۔ بجلی اور ٹیلیفون کے تار مسلسل گزر رہے ہیں۔ مگر

جہالت کی وجہ سے پوری آبادی نہایت پس ماندہ حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ ان کے کنوؤں پر جو "رہٹ" پانی کھینچنے کے لئے ہوتی ہے وہ نہایت عجیب وغریب چیز ہے۔ تمام تر لکڑی کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔ لوٹے مٹی کے ہوتے ہیں جو اس سے باندھ دئے جاتے ہیں اور بیل کے چلنے کے ساتھ چکر کے اوپر گھومتے رہتے ہیں۔ سینکڑوں برس پرانا یہ رہٹ کا طریقہ اس وقت نہایت عجیب معلوم ہوتا ہے جب آدمی دیکھتا ہے کہ جہاں لکڑی کی رہٹ کا یہ عجیب وغریب ڈھانچہ لگا ہوا ہے وہیں اس کے عین سر پر بجلی کے تار گزر رہے ہیں۔ وہ ابھی تک ایسا نہ کر سکے کہ بجلی حاصل کر کے اپنے کھیتوں میں پمپ لگاتے۔

میرات کا یہ علاقہ زیادہ تر اجمیر اور جودھ پور کے اضلاع میں پڑتا ہے۔ اونچی نیچی پتھریلی چٹانوں کے درمیان ہرے بھرے قطعات اور ان کے گرد چھوٹے چھوٹے مکانات کی اپنی ایک دنیا ہے جو تقریباً سو میل کے رقبہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ خوش قسمتی سے اس پہاڑی علاقہ میں ریلوے لائن، سڑک اور بجلی بھی موجود ہے۔ اس طرح یہ علاقہ کسی تعمیری پروگرام کو چلانے کے لئے نہایت موزوں ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک میو دہلی آیا۔ قضائے حاجت کا تقاضا ہوا تو اس کو بیت الخلاء کا راستہ بتایا گیا، مگر وہ جھانک کر باہر آگیا۔ کھیتوں اور جنگلوں میں رفع حاجت کرنے والے ایک میو کے لئے ناقابل برداشت تھا کہ وہ بند بیت الخلا میں اپنے کو مقید کر کے بیٹھے۔ میو کو اپنی ضرورت کے تحت تین دن تک دہلی میں رہنا پڑا۔ مگر وہ آخر تک یوں ہی پڑا رہا۔

تیسرے دن جب فطری تقاضے کو مسلسل روکنے کی وجہ سے اس کا برا حال ہو چکا تھا۔ اس کے سامنے سڑک سے ایک جنازہ گزرا۔ کسی نے کہا، فلاں شخص کا جنازہ ہے۔ کچھ لوگوں نے اس سوال پر گفتگو شروع کر دی کہ وہ کون سا مرض تھا جو اس کی موت کا سبب بنا۔ میو کے لئے موت کا سبب ایک معلوم بات تھی۔ وہ غضب ناک ہو کر بولا:

"اجی، ہنگا یو مرگیو ہوئگو"

(اجی ٹٹی سے مرا ہوگا) میو اس وقت جس اذیت میں مبتلا تھا، اس کے لئے ناقابل تصور تھا کہ کسی کے لئے موت کا سبب اس کے سوا بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

یہ صرف جاہل میو کی کہانی نہیں، بلکہ بیشتر انسانوں کی کہانی ہے۔ ہر شخص کا یہ حال ہے کہ اس نے اپنے ذوق کے مطابق کچھ مخصوص چیزوں کو اپنے اوپر غالب کر لیا ہے وہ اسی رنگ میں ساری چیزوں

کو دیکھتا ہے اور ہر چیز کی توجیہہ اسی کی روشنی میں کرتا ہے۔ اس کے لئے نا قابل تصور ہے کہ واقعات کا سبب اس کے سوا بھی کوئی ہو سکتا ہے جو اس کے اپنے دماغ پر طاری ہے۔ خواہ اس کا نقطہ نظر حقیقت واقعہ سے اتنا ہی دور ہو جتنا جاہل میو کا خیال۔

دہلی سے الور جانے والی سڑک پر ۵۰ میل کے فاصلہ پر فیروز پور جھرکا نام کا تاریخی قصبہ ہے۔ اس سے دو میل آگے ایک گاؤں ہے "بلونڈا"۔ اگر آپ بلونڈا جائیں تو گاؤں کے باہر چھپر کا ایک چھوٹا سا مکان ملے گا، جس کے اوپر بجلی کا بلب رات کے وقت بھی چھپر کو "روشنی کا بینار" بنائے ہوئے ہوتا ہے۔

یہ اشرف خاں صاحب کی قیام گاہ ہے ان کے پاس اتنے کھیت نہیں کہ وہ خود ٹیوب ویل لگا سکیں انھوں نے سات بھائیوں کے اشتراک سے پانچ ہارس پاور کا ایک ٹیوب ویل لگایا ہے۔

"میری ایک بسوہ کھیتی مجھے سال بھر کھانے کا غلہ دے دیتی ہے۔" وہ آپ کو بتائیں گے۔ چھپر سے متصل ان کی دو ایکڑ زمین ہے۔ اس کے ایک بسوہ رقبہ میں وہ بیگن اور دوسری سبزی بوتے ہیں یہ سبزی بستی کے لوگ خریدتے ہیں۔ اور یہاں کے رواج کے مطابق غلہ کی شکل میں اس کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ یہ غلہ اتنا کافی ہوتا ہے کہ ہمارے گھر کی سال بھر کی ضروریات اس سے پوری ہو جاتی ہے۔

زمین میں پیداوار کے بے پناہ امکانات ہیں۔ ایک بسوہ زمین میں سال بھر کی روزی کا امکان چھپا کر قدرت یہ سبق دے رہی ہے کہ اگر حالات تمہارے لئے زندگی کا دائرہ سمیٹ دیں حتی کہ وہ سمٹتے سمٹتے ایک "بسوہ" زمین تک پہنچ جائے تو اس وقت بھی مایوس نہ ہو۔ اگر تم نے محنت کی شرائط کو پورا کیا تو ایک بسوہ زمین میں ہم تمہارے لئے اتنا رزق اگائیں گے جو تمہاری ضروریات کے لئے کافی ہو۔

ہریانہ میں ایک نہر ہے جو راجستھان کی سرحد سے پنجاب کی سرحد تک چلی جاتی ہے۔ یہ نہر پوری کی پوری پختہ ہے۔ اس کی گہرائی بالکل انگریزی حرف (V) کی ہے جو دونوں طرف پختہ ڈھال دے کر بنائی گئی ہے۔

کچی نہروں میں انسان اور مویشی بآسانی داخل ہو جاتے ہیں اور اس میں نہاتے دھوتے ہیں۔ مگر اس پکی نہر میں داخل ہونا آسان نہیں۔ کوئی جانور اس میں داخل ہو تو اندر قدم رکھتے ہی وہ اس

طرح پھسلتا ہے کہ پھر کہیں اس کو پاؤں ٹکانے کی جگہ نہیں ملتی ۔ وہ فوراً اس کی تہ میں پہنچ جاتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اگر وہ دوبارہ چڑھ کر باہر آنا چاہے تو نہر کی سیدھی ڈھال اس کو قدم جمانے کی کوئی جگہ نہیں دیتی اور وہ چڑھ نہیں پاتا ۔

اسی بنا پر اس علاقہ کے عوام اس کو خونی نہر کہتے ہیں ۔ یہ نہر "خونی" اس لئے ہے کہ وہ نہروں کے روایتی تصور کے مطابق نہیں ۔ اگر چہ نہر ہونے کے اعتبار سے وہ انتہائی مکمل نہر ہے، کیونکہ وہ پانی کو زمین میں جذب ہونے سے بچاتی ہے اور سارے ذخیرۂ آب کو منزل تک لے جاتی ہے ۔

مگر یہ قیمتی نہر عوام کے لئے ایک "خونی" نہر ہے، کیونکہ ان کے روایتی تصور کے خانہ میں وہ پوری نہیں بیٹھتی ۔ عوام ہر چیز کو اپنے روایتی مزاج کے خانہ میں دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں ۔ کسی چیز کی قدر وقیمت ان کی سمجھ میں نہیں آتی جب تک وہ ان کے روایتی مزاج کے مطابق نہ ہو ۔ اسی لئے بعض مرتبہ قوموں کا حال یہ ہوتا ہے کہ ایک مخصوص نظام میں وہ غالب حیثیت کی مالک ہوتی ہیں ۔ مگر جب نظام بدلتا ہے اور نئے اقدار رائج ہوتی ہیں، تو وہ نئے حالات سے عدم مطابقت کی وجہ سے محروم ہو کر رہ جاتی ہیں ۔ وہ نئی نہر کو "خونی" سمجھنے لگتی ہیں ۔ خواہ نہر ہونے کے اعتبار سے وہ پہلے سے بھی زیادہ مواقع اپنے اندر کیوں نہ رکھتی ہو ۔

ضلع گوڑگاؤں میں ایک قصبہ ہے "پونا ہانہ" ۔ اگر آپ اس کے اندر سے گزریں تو دیواروں پر جگہ جگہ آپ کو یہ اشتہار لکھا ہوا ملے گا ۔

"قرآن مجید اور اسلامی کتابیں
گیتا بک ڈپو سے خریدیں "

اس علاقہ کے مسلمان تجارت میں اتنا پیچھے ہیں کہ یہاں قرآن مجید اور اسلامی کتابوں کا بیچنے والا بھی ایک "گیتا بک ڈپو" ہے ۔

یہ صرف اس علاقہ کی بات نہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ پورے ملک کے مسلمان بلکہ ساری اسلامی دنیا دور جدید کے تجارتی مواقع میں اتنا ہی پیچھے ہے جتنا "پونا ہانہ" کے علاقہ کے جاہل مسلمان ۔ حتیٰ کہ عرب ممالک میں تو گوشت اور سبزی اور دودھ بھی باہر کے ملکوں سے ڈبے میں بند ہو کر آتا ہے ۔

غیر منقسم ہندستان میں "قرآن مجید اور اسلامی کتابوں" کا سب سے بڑا ناشر نول کشور تھا ۔

اور جن لوگوں کو حالات کا علم ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ صورت حال کسی نہ کسی شکل میں آج بھی باقی ہے۔ مسلمانوں میں نام نہاد اڈیٹروں، شاعروں اور مصنفوں کی تعداد ہر قوم سے زیادہ ہوگی۔ مگر اس کے بعد پریس، کاغذ روشنائی اور اس سلسلہ کی ساری چیزوں کا کاروبار عملاً غیر مسلموں کے قبضہ میں ہے۔

سیاسی خطابت کا جھنڈا مسلمانوں نے، کم از کم اپنی خوش خیالی کے مطابق ایورسٹ کی چوٹی پر گاڑ دیا مگر اس فرضی ''ایورسٹ'' کے نیچے کی ساری دنیا کو دوسروں کے لئے چھوڑ دیا۔ تیسرے درجہ کے ایڈیٹروں اور شاعروں اور مصنفوں کی فوج کی فوج یہاں موجود ہے۔ مگر وہ تجارتی مقامات جہاں اس فوج کی تخلیقات نشر و اشاعت کا روپ حاصل کرتی ہیں، وہ سب دوسروں کے حصہ میں ہیں۔

یہ صورت حال اس درجہ افسوسناک ہے کہ کسی زبان نے ابھی تک وہ الفاظ وضع نہیں کئے جن میں اس کو بیان کیا جائے۔

''مجھے اپنی زندگی کے دو واقعات یاد آتے ہیں'' ایک میواتی عالم نے کہا ''۱۔ ۱۹۵۲ء میں جب کہ میں مدرسہ سبحانیہ دہلی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا میرے ساتھ یوپی کے ایک طالب علم، عبد القیوم صاحب تھے۔ وہ اپنے روپے میرے پاس امانتاً رکھتے تھے جن کو میں ان کی اجازت سے خود اپنی ضرورت کے لئے بھی استعمال کرتا تھا۔ ان سے کسی بات پر میری لڑائی ہوگئی طالب علم کے دوستوں نے ان کو اکسایا کہ ''عبد الرحیم نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے، تم ان سے اپنا روپیہ مانگ لو'' مگر طالب علم نے جواب دیا ''ایسا نہیں ہو سکتا لڑائی الگ چیز ہے اور روپیہ الگ چیز۔ میں لڑائی کی وجہ سے ان سے اپنے روپیہ کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔''

۲۔ ۱۹۵۹ء میں گلپاڑہ (ضلع بھرت پور) کے مدرسہ میں تعلیمی خدمت انجام دے رہا تھا۔ وہاں کے ایک میو حاجی دراب خاں سے میری اکثر لڑائی رہتی تھی۔ اسی دوران میں ایک بار مدرسہ کے لئے چندہ کی مہم چلی۔ کچھ لوگ گاؤں میں گھومے۔ کسی نے ۲۰ سیر اناج لکھوایا، کسی نے ۳۰ سیر۔ سب سے زیادہ جس نے لکھوایا وہ ایک من غلہ تھا۔ لوگ حاجی دراب کے یہاں پہنچے، میں بھی وفد میں موجود تھا۔ انھوں نے پوچھا کہ لوگوں نے کتنا کتنا لکھوایا ہے۔ ہر ایک کی مقدار بتائی گئی، تو وہ بولے۔ ''اچھا میری طرف سے سوا من لکھ لو'' اس کے بعد کہا ''اگرچہ میری اس مولوی سے لڑائی ہے۔ مگر مدرسہ سے میری کوئی لڑائی نہیں۔ مولوی سے لڑائی کے باوجود میں مدرسہ کی مدد کروں گا۔'' (روایت: مولانا عبد الرحیم بڈیڈوی)

یہ واقعات آن کی مثال ہیں حقیقت یہ ہے کہ انسانیت کے دو درجے ہیں۔ ایک ایمان، دوسرے

آن ۔ ایمان انسانیت کا سب سے اونچا درجہ ہے ۔ جب کہ آدمی خدا کے خوف اور آخرت کی حرص میں بلند اخلاق اور شریفانہ کردار کو اختیار کرتا ہے ۔

اس سے اتر کر آن کا درجہ ہے ۔ اگر کسی کو ایمان کا اعلیٰ مقام حاصل نہ ہو تو انسانیت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس کے اندر " آن " باقی ہو ۔ اگر آن بھی نہ رہے تو اس کے بعد انسانیت کا کوئی درجہ نہیں ۔ اس کے بعد وہ مقام ہے جہاں انسان اور حیوان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا ۔

حکومت نے میوات کے علاقہ میں جدید طرز کے چار اسپتال بنانے کا فیصلہ کیا ہے ۔ ہریانہ کی وزیر صحت مسز شاردارانی نے مارچ کے تیسرے ہفتہ میں فیروز پور جھرکا میں اس سلسلے کے پہلے اسپتال کا افتتاح کیا ۔ یہ میوات کے علاقہ میں بننے والا پہلا سیول اسپتال ہے ۔

۲۵ بستروں کا یہ اسپتال ۹ لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر ہوا ہے ۔ اس کے علاوہ اس میں ایک لاکھ روپے کی قیمت کے سرجیکل اور کلینیکل اوزار ہیں ۔ چیف میڈیکل افسر ڈاکٹر ایس ۔ ایس منوچا نے بتایا کہ میوات کے اسپتال کو اپنی کامیابی کے لئے دہرا کام کرنا پڑے گا ۔ ایک علاج کا انتظام ۔ دوسرے لوگوں کو علاج کے لئے آمادہ کرنا ۔ کیونکہ یہ میوؤں کا علاقہ ہے اور میو لوگ نئی چیزوں سے ابھی تک مانوس نہیں ہوئے ہیں ۔

میو ایک انتہائی بہادر قوم ہیں ۔ ان کے اندر بہت سے جوہری اوصاف ابھی تک زندہ ہیں ۔ وہ آج بھی اس پر فخر کرتے ہیں کہ دہلی کے سلاطین اور انگریزوں کی اطاعت کبھی انھوں نے قبول نہیں کی ۔ مگر ان کی تعلیم میں پس ماندگی نے موجودہ زمانہ میں ان کو بہت پیچھے کر دیا ۔

ان کی پس ماندگی کا یہی ایک پہلو نہیں ہے کہ بیسویں صدی میں بھی ان کے یہاں پہلا سول اسپتال ۱۹۷۰ء میں بن رہا ہے اس سے بھی زیادہ سنگین بات یہ ہے کہ وہ اس قابل نہیں کہ جب حکومت اسپتال کا منصوبہ بنائے تو وہ اس کا ٹھیکہ لے سکیں ، اس کی تعمیر کے لئے اینٹ سیمنٹ ، لوہا سپلائی کر کے تجارتی نفع کمائیں ۔ اس کے اسٹاف میں وہ ڈاکٹر اور میڈیکل افسر بن کر اپنے لئے روزگار حاصل کریں ۔ پورے منصوبہ میں ان کا حصہ صرف اتنا ہے کہ وہ وقتی طور پر اس میں مزدوری کر لیں جس کے متعلق انھیں یہ بھی معلوم نہ ہو کہ ٹھیکہ دار نے ان کو ان کی محنت کی پوری مزدوری دی یا اس کا ایک حصہ کاٹ کر اپنی جیب میں رکھ لیا ۔

پندرھواں سفر

۱۹۴۷ء سے پہلے الور کی آبادی میں نصف سے زیادہ مسلمان تھے۔ آزاد پیشوں میں اور فوج اور انتظامیہ میں مسلمانوں کا غلبہ تھا۔ مگر تقسیم کے طوفان نے انتہائی بے دردی کے ساتھ سب کچھ برباد کر دیا۔ یہاں ایک بزرگ مولانا رکن الدین صاحب تھے۔ ۱۹۳۵ء میں ان کا انتقال ہوا تو ان کے معتقدین نے شہر کے باہر ایک کھیت میں ان کا مزار بنایا اور وہیں ایک مسجد اور مدرسہ بھی تعمیر کیا۔ مگر ۱۹۴۷ء میں دیگر تمام اسلامی آثار کے ساتھ یہ ادارہ بھی مسمار کر دیا گیا۔

اس موقع پر جمعیۃ علماء آگے بڑھی۔ دہلی میں اور پاکستان کی سرحد سے ملی ہوئی ریاستوں میں مسلمانوں کی جو بربادی ہوئی تھی، وہاں مسلمانوں کے دوبارہ جمانے میں جمعیۃ علماء کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اسی سلسلہ میں الور، بھرت پور میں امدادی کام کا نظام بھی بنا۔ اس کام کا مرکز الور تھا۔ مرحوم مولانا محمد ابراہیم صاحب (۱۹۷۰-۱۹۱۲) اور مولانا مفتی جمال الدین صاحب قاسمی (پیدائش ۱۹۲۸ء) اس کام کے ذمہ دار بنائے گئے۔ الور سے مسلمانوں کے تخلیہ اور اس کی ڈیڑھ سو مساجد کی بربادی کے بعد مذکورہ بالا مسجد کے کھنڈرات وہ واحد جگہ تھی جہاں تعمیر نو کا یہ قافلہ اپنا کیمپ قائم کر سکتا تھا، چنانچہ اس مسجد کے کھنڈرات پر چھپر ڈال کر کام شروع کر دیا گیا۔

اس کام پر اب ۲۰ سال ہو چکے ہیں۔ اب یہاں قدیم بنیادوں پر دوبارہ ایک مسجد بن کر کھڑی ہو گئی ہے۔ اگرچہ ابھی اس میں بہت کچھ کام باقی ہے۔ اسی کے ساتھ ایک باقاعدہ مدرسہ بھی قائم ہو گیا ہے جس کی بڑھتی ہوئی آبادی اور ابھرتی ہوئی تعمیرات زبان حال سے کہہ رہی ہیں کہ اسلام وہ دین ہے جس کو مالک کائنات نے ابدیت کی نسبت دے دی ہے۔ وہ دب دب کر دوبارہ ابھرتا ہے اس کو مٹایا نہیں جا سکتا۔

۲۴ جنوری ۷۴ء کو میں اس علاقے میں آیا۔ اس سلسلے میں ضلع کے مندرجہ ذیل مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا۔

الور

خان پور

کشن گڑھ

کوٹ قاسم

راج گڑھ

آندھ واڑی

منا کا

دھولی دوب

شیر پور

نوگاؤں

رس گھن

اس علاقے میں نبوت محمدی کے دو زندہ معجزے ہیں۔ ایک حاجی مل خاں (۵۰ سال) کی والدہ۔ یہ بوڑھی خاتون (اماں جی) جو اپنی ظاہری ہیئت کے اعتبار سے بالکل ناقابل التفات معلوم ہوتی ہیں۔ جب میں نے ان کی باتیں سنیں اور ان کے حالات معلوم کئے تو میرے دل نے کہا کہ بلاشبہ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو اولیاء اللہ کہا گیا ہے۔ اپنے لائق فرزند کے اندر انھوں نے حیرت انگیز طور پر خدمت دین کی ایسی روح بھری ہے کہ وہ اس علاقے میں مسلمانوں کی دوبارہ اصلاح و تعمیر کے کام کا دست و بازو بن گئے ہیں۔

دوسرا زندہ معجزہ چودھری نثار احمد خاں (پیدائش ۱۹۰۹) ہیں۔ الور سے ۳۵ میل کے فاصلہ پر واقع ایک قصبہ "کوٹ قاسم" میں وہ تنہا اپنے خاندان کے ساتھ مقیم ہیں۔ اس قصبہ میں پہلے مسلمان نصف سے زیادہ آباد تھے۔ مذکورہ چودھری صاحب کے ایک خاندان کے سوا سارے خاندان ۱۹۴۷ کے انقلاب میں اس قصبہ کو چھوڑ کر چلے گئے، مگر چودھری صاحب نے انتہائی جرأت کے ساتھ یہاں کی پانچ مساجد کو سارے حوادث کا مقابلہ کرتے ہوئے محفوظ رکھا ہے۔ قبرستان تک جو کہ سڑک کی زد میں آ رہی تھی اس کے لئے ایمانی جرأت کے ساتھ ڈٹ گئے۔ اور اس کو بچانے میں کامیاب رہے۔ قصبہ کی جامع مسجد عین چوک پر ہے۔ پاس کی زمینیں اس مسجد پر وقف تھیں۔ تمام زمینوں کو انھوں نے محفوظ کر لیا اور دکانیں بنا کر مسجد کے لیے آمدنی کی شکل پیدا کر دی۔ کسی کو یہ دیکھنا ہو کہ وہ لوگ کیسے ہوتے ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (اللہ نے اہل ایمان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے"۔ تو وہ مناکا (الور) جاکر" اماں جی کو دیکھے اور اگر کوئی یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کون سی خدائی نصرت ہے جس کے متعلق قرآن میں کہا گیا ہے وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً (وہ اپنے بندوں کے اوپر بالادست ہے اور تمہارے اوپر نگراں بھیجتا ہے) تو وہ کوٹ قاسم جائے اور وہاں دیکھے کہ جب ایک اکیلے خاندان نے جرأت ایمانی سے کام لے کر اسلامی آثار کی حفاظت کا ارادہ کیا تو کس طرح اس کو خدا کی مدد حاصل ہوئی۔ چودھری نثار خاں میں اسلامی حمیت کمال درجہ پر ہے، اسی کے ساتھ غیر مسلموں سے محبت کمال درجہ پر۔

خان پور میں اب بھی نصف سے زیادہ آبادی مسلمانوں کی ہے اور سب خوش حال حالت میں ہیں۔ کشن گڑھ میں پہلے مسلمان کافی تھے۔ اب یہ خالی ہو چکا ہے تاہم دوبارہ کچھ مسلمان یہاں آکر بسنا شروع ہوئے ہیں۔ راج گڑھ پہلے ریاست الور کا صدر مقام تھا۔ یہاں مسلمانوں کی کافی آبادی تھی تقریباً ۱۰ مسجدیں تھیں مگر آج صرف ایک مسجد کے معمولی نشانات باقی ہیں۔

آندھ واڑی ایک گاؤں ہے جو ایک پہاڑی کے کنارے آباد ہے۔ آبادی تقریباً ۶۰ گھروں کی ہے جن میں پندرہ گھر مسلمان ہیں۔ یہاں کسی قسم کا کوئی تعصب نہیں۔ ہندو اور مسلمان بہت اچھی طرح مل کر رہتے ہیں۔ مگر جہالت کی وجہ سے مسلمان دین سے بھی بے خبر ہیں اور دنیا سے بھی۔ ساری بستی میں کوئی ایک مسلمان اردو جاننے والا یا قرآن پڑھنے والا نہیں۔ کوئی مرتا ہے تو نماز جنازہ پڑھانے کے لئے ۶ میل دور سے "ملاجی" کو بلا کر لاتے ہیں۔ لوگوں کے نام کچھ مسلمانوں جیسے ہیں۔ اور کچھ اندر، روپلا، دلموڑ جیسے ہیں۔ مردوں کے کانوں میں مرکیاں نظر آتی ہیں۔ ہم لوگ رات کو یہاں ٹھہرے اور نماز قائم کی۔ لوگوں سے کہہ سن کر سات لڑکوں کو تیار کیا کہ وہ ہمارے ساتھ چلیں اور الور کے مدرسہ میں داخل ہو کر پڑھیں۔ مولانا جمال الدین صاحب نے لڑکوں کے نام میں معمولی تغیر کر کے ان کو بامعنی بنا دیا۔ مثلاً جس کا نام اندر تھا اس کو "سکندر" کر دیا۔ جس کا نام امراؤ تھا اس کو "عمر" کر دیا۔ وغیرہ۔ صبح کو ہمارا قافلہ وہاں سے روانہ ہوا تو ادھیڑ عمر کے ایک شخص نے کہا "آپ لوگوں کی برکت سے آج میں نے زندگی میں پہلی بار سجدہ کیا ہے"۔ اس علاقے میں جماعتیں اور دینی شخصیتیں آئیں تو ان کی اصلاح و تعلیم کا کام شروع ہو جائے۔

اس قسم کے گاؤں اس علاقے میں بہت ہیں۔ مگر یہاں کوئی اصلاحی کام نہیں ہو رہا ہے۔

تقسیم سے پہلے الور میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ یہاں کی پولیس، انتظامیہ، صنعت، حرفت، زراعت ہر چیز پر مسلمان چھائے ہوئے تھے۔ تقسیم کے طوفان نے اگرچہ اس ماضی کو ملیا میٹ کر دیا، تاہم اس کے بچے کھچے آثار اب بھی جگہ جگہ باقی ہیں۔ اکثر جگہ بڑی بڑی درگاہیں اور مسجدیں موجود ہیں جن کو اس علاقہ کی تعمیر نو کے مرکز کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ خان پور میں ایک بڑی مستحکم اور چاروں طرف سے محصور درگاہ ہے جس میں کچھ لوگ لڑکیوں کا مدرسہ قائم کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ کوٹ قاسم میں بڑی بڑی مسجدیں ہیں۔ اور مقامی طور پر اتنے ذرائع ہیں کہ ایک اچھا مدرسہ قائم کر کے چلایا جا سکتا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ ان درگاہوں کو دور جدید کی درگاہ بنا دیا جائے۔ یہاں اسلام کی تعلیم و تربیت کے ادارے قائم کئے جائیں اور خاموشی کے ساتھ لوگوں کی اصلاح کی جائے۔ متعدد جگہوں پر مدرسہ کے قیام کے امکانات ہیں۔ اگر ایسے لوگ ملیں جو علم دین کے ساتھ خدمت دین کا بھی جذبہ رکھتے ہوں تو یہاں ان کے لئے کام کا بہترین میدان ہے، یہاں وہ مدرسہ کے مدرس کی حیثیت سے قیام کریں، لڑائی جھگڑے سے دور رہیں۔ اسلامی اخلاق کو اپنا طریقہ بنائیں اور بے غرضی کے ساتھ خاموش کام کریں تو نہ صرف انہیں احیائے دین کا ثواب ملے گا بلکہ یہاں انھیں ہر قسم کے معاشی مواقع بھی ملیں گے اور بفراغت زندگی گزارتے ہوئے وہ دینی خدمت کر سکیں گے۔

الور میں ایک درگاہ تھی، مشہور ہے کہ اس درگاہ کا اتنا رعب و جلال تھا کہ چڑیاں اس کے پاس سے گزرتیں تو وہ راستہ بدل دیتیں اور اس کے اوپر سے اڑنے کی ہمت نہ کرتیں۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں یہ درگاہ ختم ہو گئی۔ عجیب بات ہے کہ وہ لوگ جن کے رعب و جلال کا یہ عالم تھا کہ جانور ان کے اوپر سے گزرنے کی ہمت نہ کرتے تھے۔ انقلاب کا رولر بے خوف و خطر ان کے اوپر سے گزر گیا اور وہ اس کو روک نہ سکے۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس قسم کی کہانیوں کو اب بھی لوگ اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

شبیر پور میں لال خاں کی بہت بڑی درگاہ ہے۔ یہ اکبر کے زمانے کے بزرگ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ "دین الٰہی" کے مبلغ تھے۔ ان کے تین خاص اصول تھے :

تمباکو نہ استعمال کرنا۔

گوشت نہ کھانا۔

شراب نہ پینا۔

یہ درگاہ بہت بڑے رقبہ میں ہے۔ اور اس پر کافی زمینیں وقف ہیں۔ اگر یہاں ایک مدرسہ قائم کیا جائے، تو نہایت کامیابی کے ساتھ چل سکتا ہے۔ مگر اس درگاہ کے چاروں طرف ہزاروں مسلمان جہالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور درگاہ کے امکانات برباد ہو رہے ہیں۔

نوگاؤں میں کئی مسجدیں تھیں جو ۱۹۴۷ کے ہنگامے میں ختم کر دی گئیں۔ اب ایک مسجد کے کھنڈر پر دوبارہ مسجد بن گئی ہے اور اس میں جماعت قائم ہے۔

یہ جنوری ۱۹۷۴ء کی ۲۶ تاریخ ہے اور شام ۴ بجے کا وقت۔ میں ایک غار کے اندر بیٹھ کر یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔ مقامی طور پر اس کو ''چوڑ سِدھ کی گپھا'' کہتے ہیں۔

خان پور (ضلع الور) میں پہاڑوں اور چشموں کے درمیان یہ غار تقریباً آٹھ میٹر لمبا اور ایک میٹر سے کچھ کم چوڑا ہے۔ اونچائی صرف اتنی ہے کہ آدمی بیٹھ سکے۔ ''چوڑ سدھ'' خواجہ معین الدین چشتی (۱۲۳۶-۱۱۴۲) کے زمانے کے ایک میواتی بزرگ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس غار میں بیٹھ کر چلّہ کیا تھا۔ اس کے بعد یہیں ایک چشمہ کے کنارے انھوں نے اپنا ذکر و شغل شروع کیا، جہاں ان کے کسی معتقد نے کچھ تعمیرات کر دی ہیں جو اب بھی سنسان حالت میں موجود ہیں۔ اور ان کو ''چوڑ سدھ کی بیٹھک'' کہا جاتا ہے۔ اس (تبارہ) کی چھت پر ہم نے عصر کی نماز پڑھی۔

مشہور ہے کہ چوڑ سدھ میواتی ساہوڑی (الور) کے کسی گوجر کی گائے چراتے تھے۔ ایک روز ایک بزرگ مدار شاہ (مکن پور۔ یوپی) ان کی گایوں کے پاس آئے اور کہا کہ ''بچے فلاں گائے کا دودھ لاؤ ہم کھیر کھائیں گے۔'' انھوں نے جواب دیا ''بابا یہ گائے تو دودھ نہیں دیتی۔'' وہ گائے ابھی بچہ تھی، نہ گابھن ہوئی تھی، نہ اس سے بچہ ہوا تھا۔ بزرگ نے کہا ''تم جاکر دودھ نکالو، وہ دودھ دے گی۔'' بزرگ کے اصرار پر چوڑ سدھ گئے۔ جب انھوں نے تھن میں ہاتھ لگایا تو اس میں سے دودھ نکلنے لگا۔ اس کی کھیر پکائی گئی اور دونوں نے کھائی۔

اس واقعہ کے بعد چوڑ سدھ نے گائے چرانے کا کام چھوڑ دیا، عبادت و ریاضت میں لگ گئے، اور گوجر سے کہا:

یہ لے لاٹھی لوگڑی یہ لے اپنی گائے
ہم پہ مہر مدار کی ہم کس کی گھیریں گائے

اس کے بعد وہ مدار شاہ کے مرید ہو گئے، غار میں چلہ دیا اور اپنی درگاہ بنائی۔ ان کی بڑی درگاہ ڈیرا (الور) کے پاس ہے جو چوڑ سِدھ کے نام سے مشہور ہے۔

مسلمانوں کی جدید تاریخ کا یہ سب سے زیادہ حیرت انگیز عجوبہ ہے کہ ان کے درمیان ایسے بے شمار "بزرگ" پیدا ہوئے جو جانور کے سوکھے تھن سے دودھ نکال سکتے تھے اور پتھر میں نور پیدا کرنے کا کرتب دکھا سکتے تھے، مگر ہم وہ بزرگ پیدا نہ کر سکے جو انسانوں میں حقیقی اسلامی روح پھونکتا اور اسلام کا نور دنیا میں پھیلاتا۔ مزید حیرت انگیز بات ہے کہ اس عجیب و غریب کرامت کی کہانیاں سب سے زیادہ انھیں علاقوں میں مشہور ہیں جو دین دنیا دونوں میں سب سے زیادہ پیچھے ہیں۔

اس سفر میں تقریباً دس دن تک بعض ایسے لوگوں کا ساتھ رہا جو ہفت روزہ الجمعیۃ کے قدرداں ہیں اور اس کو شروع سے پڑھتے رہے ہیں مگر بات چیت اور تقریروں میں جو باتیں میں نے کہیں وہ اکثر انھیں "نئی" معلوم ہوئیں۔ حالاں کہ بنیادی طور پر یہ سب وہی باتیں تھیں جو میں الجمعیۃ کے صفحات میں مسلسل لکھتا رہا ہوں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اخبار کا ذریعہ ذہنوں کی تعمیر کے لئے سب سے کم کامیاب ہے۔ اس کے مقابلہ میں کتاب نسبتاً زیادہ مفید ہے۔ کیوں کہ کتاب میں آدمی اپنے خیالات کو یکجا طور پر جامعیت اور تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ مگر غالباً سب سے زیادہ مفید اور کارگر طریقہ شخصی ربط، گفتگوؤں و رتقریروں کا ہے۔ شخصی طور پر اپنی زبان سے آدمی جب اپنے نقطہ نظر کو بیان کرتا ہے تو اس میں بیک وقت دو باتیں شامل ہو جاتی ہیں۔ ایک سننے والے کی پوری رعایت، دوسرے سنانے والے کی پوری شخصیت۔ یہ دونوں چیزیں مل کر شخصی اور زبانی طریقہ تبلیغ کو زیادہ موثر اور کارگر بنا دیتی ہیں۔ یہ دونوں چیزیں وہ ہیں جو اخبار اور کتاب میں شامل نہیں کی جا سکتیں۔ کسی کے اندر خصوصی قوت تحریر ہو تو وہ کسی درجہ میں اپنی شخصیت کو اپنی تحریروں میں منعکس کر سکتا ہے مگر پورے طور پر شخصیت کو تحریر کے اندر سمونا شاید ممکن نہیں۔

اس سفر میں میرے ساتھ حسب ذیل افراد تھے:

۱۔ مولانا مفتی جمال الدین قاسمی (۴۵ سال)

۲- حاجی مل خاں (۵۰ سال)

۳- حاجی باگھ سنگھ (۵۰ سال)

۴- چودھری دھندل (۴۸ سال)

سفر کا آغاز ۲۴ جنوری کو ہوا اور ۳ فروری ۱۹۷۴ کو ختم ہوا۔

چند سفر

دسمبر ۱۹۷۶ء کے آخری ہفتہ میں میوات (ہریانہ) کے چند مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا:
بھادس، برکلی، پنگواں، نیم کھیڑا، بڈیڈ اور فیروز پور جھرکا۔ ۲۰ دسمبر کی شب نیم کھیڑا (ضلع گوڑ گاؤں) میں گزری۔ یہاں گاؤں کے کنارے اونچائی پر ایک مسجد ہے، جس کے شمالی جانب کشادہ، صاف ستھرا کمرہ بنا ہوا ہے۔ یہاں مسجد میں نماز عشار کے بعد ایک تذکیری مجلس ہوئی جس میں راقم الحروف نے بعض احادیث کی روشنی میں بتایا کہ اسلامی زندگی یہ ہے کہ آدمی تقویٰ کی رسّی میں بندھ جائے۔ وہ ہر معاملہ میں بس وہیں تک جائے جہاں تک حدود اللہ اس کو اجازت دیتے ہوں۔ اس کے آگے اس کا ایمان اور خوف آخرت اس کو روک لے۔

مولانا عبدالرحیم بڈیڈ دی اس مسجد میں امام اور مدرس کی حیثیت سے مقیم ہیں۔ گاؤں کے بچّے قرآن اور دینی تعلیم کے لیے یہاں جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کے مل کر پڑھنے سے ایک قسم کا تعلیمی نغمہ مسجد کی فضا میں گونجتا رہتا ہے۔ گاؤں کے لوگ ملنے کے لیے کمرہ میں آتے رہے اور اس طرح گاؤں کے لوگوں سے دینی ربط جاری رہا۔ خاص طور پر جناب شمس الدین صاحب اور ان کے اہل خاندان سے جن کا مکان مسجد سے بالکل ملا ہوا ہے۔

کمرہ کا جائے وقوع ایسا ہے کہ صبح کو سورج نکلتے ہی دھوپ کمرے کے اندر آگئی۔ سردی کے موسم میں صبح صبح چمکتا ہوا سورج جب اپنی سنہری کرنوں کے ساتھ ہماری قیام گاہ کے اندر داخل ہوا تو ایسا محسوس ہوا گویا زمین والوں کے ساتھ ہم "آسمان والوں سے" بھی مربوط ہو گئے ہیں۔ مسجد کے باہر پھیلے ہوئے ہرے ہرے کھیت، ان میں جگہ جگہ کھڑے ہوئے درخت، دور آسمان کو چھوتی ہوئی پہاڑ کی دیواریں، ان قدرتی مناظر کے درمیان چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں، اس ماحول میں بیٹھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے خالق اپنی مخلوقات کے پورے کارخانے کے ساتھ ہماری پشت پر آکر کھڑا ہو گیا ہے۔

شہری زندگی میں آدمی تمدّن کی مصنوعی حد بندیوں میں گم رہتا ہے، مگر شہروں کے باہر قدرت کی جو پھیلی ہوئی دنیا ہے، وہاں اپنے کو پہنچا دیجیے تو زندگی اپنی تمام تنگیوں کے

باوجود وسیع معلوم ہونے لگتی ہے ۔ آدمی اپنے کو ایک آفاقی مملکت کا شہری سمجھنے لگتا ہے ۔

شہر کے تمدّنی بندھنوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایک ایسے جال میں پھنسا ہوا ہے جس سے رہائی ممکن نہیں ۔ مگر دیہات کی کھلی فضا جہاں ہریالی ، میدان ، چڑیوں کے چہچہے ، پہاڑوں کی بلندیاں انسان کا استقبال کر رہی ہوں ، جہاں آسمان کی وسعتیں خدا کی قدرت کو یاد دلاتی ہوں ، وہاں زندگی کے معنی بالکل بدل جاتے ہیں ۔

یہاں تنگیاں وسعتوں میں تحلیل ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں ۔ انسانوں کے پیدا کیے ہوئے مسائل خدائی عظمتوں کے آگے حقیر ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ زندگی کی تاریکیاں کائنات کی تابناکیوں میں غائب ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ۔ مختصر یہ ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آدمی ، انسان کے بنائے ہوئے وحشت کدہ سے نکل کر خدا کی پُرسکون دنیا میں پہنچ گیا ہے ۔ یہاں آکر زندگی کے معنی بالکل بدل جاتے ہیں ۔

مگر کیسی عجیب بدقسمتی ہے کہ لوگوں کو ان حقائق کا شعور نہیں ۔ وہ خدا کے پڑوس میں ہوکر بھی انسان کی بنائی ہوئی دنیاؤں میں گم رہتے ہیں ۔ آسمان کی فضاؤں سے انہیں اپنی غذا نہیں ملتی ۔ چڑیوں کے زمزمے میں انہیں کوئی پیغام سنائی نہیں دیتا ۔ درختوں کی ہریالی میں انھیں زندگی کا کوئی سبق نہیں ملتا ۔ پہاڑوں کی بلندی میں ان کے لیے نصیحت کا کوئی سامان نہیں ہے ۔ وہ صرف انسانوں کی آواز سُن سکتے ہیں ۔ خدا اور فرشتوں کی آواز سننے کے لیے ان کے کان بہرے ہیں ۔

خدا اپنی پوری کائنات کے ساتھ ان کے سامنے کھڑا ہوا ہے ، مگر اُن کی آنکھیں صرف انسانی مصنوعات کو دیکھ سکتی ہیں ۔ خدائی کارخانہ کو دیکھنے کی صلاحیت ان کے اندر نہیں ۔ خدا یہاں پہاڑ کی بلندیوں اور آسمان کی وسعتوں سے اعلان کر رہا ہے کہ : "میرے سایہ میں آجاؤ ۔ میرا جوا نرم ہے اور میرا بوجھ ہلکا" ۔ مگر کوئی نہیں جو اس ربّانی پیغام سے آشنا ہو ۔

مسجد اور گاؤں میں کچھ لمحات گزارنے کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ قرآن کی آیت واجعلوا بیوتکم قبلۃ واقیموا الصلوٰۃ کا مطلب کیا ہے ۔ یعنی حالات جب اہل ایمان کو اتنا پیچھے دھکیل دیں کہ عملاً ان کے لیے گھر اور مسجد کے سوا کوئی اور میدان کار باقی نہ رہے تو انہیں

چاہیے کہ اسی ملے ہوئے دائرے کو اپنے عمل کے لیے خاص کرلیں۔ خارجی دنیا کے خلاف شکایت اور احتجاج کا میمورنڈم مرتب کرنے میں وہ اپنا وقت ضائع نہ کریں، بلکہ گھروں اور مسجدوں کو مرکز بناکر ایک طرف اپنے رب کے ساتھ اور دوسری طرف اپنے قریبی لوگوں کے ساتھ جڑ جائیں اور جو دائرہ بھی ان کے لیے باقی رہ گیا ہے، اس کے اندر دینی بیداری کی کوشش جاری رکھیں۔

"میوات" کا لفظ باہر کے لوگوں کے لیے ایک افسانوی نام بن گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میو قوم، جس کے نام سے یہ علاقہ منسوب ہے، اس ملک کی سب سے زیادہ پچھڑی ہوئی قوم ہے۔ جگہ جگہ قدیم طرز کی درگاہوں کی بڑی بڑی عمارتیں بتاتی ہیں کہ یہ علاقہ سینکڑوں برس سے بزرگوں کی توجہات کا مرکز رہا ہے۔ ایک میو سلام کے بعد مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ آپ کی طرف بڑھائے گا تو اس کے ہاتھ میں لٹکی ہوئی تسبیح بتائے گی کہ ان اصلاحی کاموں کے اثرات بھی اس قوم نے قبول کیے ہیں۔ مگر اوراد و نوافل سے اوپر حقیقی دینی تبدیلیاں شاذ و نادر ہی کہیں نظر آتی ہیں۔

ہم گاؤں کے باہر نکلے تو حد نظر تک ہرے بھرے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ایک کھیت میں گیہوں کی فصل نہایت عمدہ کھڑی ہوئی تھی "یہ کس کا کھیت ہے" میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا "یہ رہن کا کھیت ہے جو ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان سے لیا ہے" یہ سنتے ہی میری خوشی ختم ہوگئی۔ مجھے حدیث یاد آئی: کل لحم نبت من السحت فالنار اولی بہ (ہر جسم جو حرام سے پلے اس کے لیے آگ ہی بہتر ہے) تاہم اس علاقہ کے لیے یہ کوئی انوکھی مثال نہیں "داڑھی اور تسبیح" والے اسلام کی کثرت کے باوجود یہاں اس قسم کی بے شمار خرابیاں عمومیت کے ساتھ جاری ہیں۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ دنیوی عقل، جو آدمی کے گرد و پیش کے حالات خود اپنے زور پر اس کو سکھا دیتے ہیں، اس سے بھی یہ قوم ابھی تک خالی ہے۔

میو قوم ایک انتہائی برباد قوم ہے۔ اس کی بربادی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کو زمانہ کا شعور نہیں۔ میووں کے درمیان ایک مثل مشہور ہے:

جاٹ کہے سن جاٹنی یائی گاؤں میں رہنا   اونٹ بلیا لے گئی، ہاں جی ہاں جی کہنا

اس شعر میں جس مفاہمت اور حقیقت پسندی کا ذکر ہے، وہ میووں کے روایتی تصور میں دبی ہوئی قوموں کا طریقہ تھا۔ میووں کا خیال اپنے بارہ میں یہ رہا ہے کہ ہمیں دوسروں سے مفاہمت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، ان کی لاٹھی، ان کے نزدیک، اس قسم کی "بزدلی" کا بہترین بدل تھی۔ آج زندگی کے معنی بالکل بدل گئے مگر میو اب بھی انھیں روایتی تصورات اور رومانی خیالات میں جی رہے ہیں۔ آج بھی اگر کوئی معاملہ پیش آجائے تو وہ فوراً لڑنے بھڑنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں، خواہ اس کا نتیجہ یہ کیوں نہ نکلے کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ برے حال کو پہنچا دیے جائیں ـــــ دین اپنی حقیقی شکل میں، دنیا کا بھی شعور بیدار کرتا ہے اور آخرت کا بھی۔ مگر اس قابل رحم قوم کے حصہ میں ایک ایسا دین آیا ہے جس نے اس کو نہ دنیا کا صحیح شعور دیا اور نہ آخرت کا۔

دوسرا سفر

گنگاپور، راجستھان کا ایک شہر ہے جو دہلی سے ۳۰۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ۸ اگست ۱۹۷۷ء کو ہم دہلی سے پتھروں کے اس شہر کے لیے روانہ ہوئے جہاں چھپر بھی پتھر کے ہوتے ہیں۔ راستہ میں مسلسل سرسبز و شاداب مناظر آنکھوں کے لیے "جنت نظارہ" بن رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف ساری زمین سبز چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ جگہ جگہ ابھرے ہوئے درخت قدرتی گل بوٹے کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ کھلے آسمان کا منظر اور اس میں بادلوں کی حسین ٹکڑیاں آفاقی حسن کا منظر پیش کر رہی تھیں۔

"یہ شاداب حسن کس قدر لذت بخش ہے" میں نے سوچا۔ "مگر وہ اپنے اندر تلخیاں بھی لیے ہوئے ہے۔ ہر سال جب بارش ہوتی ہے تو زمین پر سرسبزی اور شادابی کا ایک اتھاہ حسن اُگ آتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ کیچڑ اور سیلاب بھی لاتا ہے۔ مکانات گرتے ہیں۔ فصلیں تباہ ہوتی ہیں۔ بارش میں بھیگنے سے کتنی چیزیں خراب ہو جاتی ہیں۔ مچھر، مکھی، کیڑے مکوڑے وغیرہ طرح طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔"

سرسبز درخت قدرت کی اتنی حسین نعمت ہیں کہ آخرت میں بننے والی بے پایاں نعمتوں کی دنیا کا نام ہی جنت (باغ) رکھ دیا گیا۔ انسان کی حسین ترین تمنا ہمیشہ یہ رہی ہے کہ سرسبز

درختوں کے جھرمٹ میں عمدہ رہائش گاہ (مساکن طیبۃ فی جنات عدن) اسے حاصل ہو۔ زمین پر سرسبزی کا انحصار زیر زمین آبی اہتمام کے ساتھ، بڑی حد تک فضائی بارش پر ہے۔ بارش کے فضائی انتظام کی وجہ سے یہ تمام مسائل پیدا ہوتے ہیں اور اس کی مصلحت یہ ہے کہ انسان ایک نعمت کو پاکر اس میں مگن نہ ہو جائے۔ بلکہ اس کی تلخیوں کو بھی بھگتے۔ تاکہ خدا کی یاد اس کے ذہن میں تازہ رہے۔ آخرت میں اس کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس لیے وہاں سرسبزی کو قائم رکھنے کے لیے غالباً فضائی بارشوں کا انتظام ختم یا محدود کر دیا جائے گا۔ اور زیر زمین آبی اہتمام کو زیادہ کامل بنا دیا جائے گا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جگہ جگہ کہا گیا ہے کہ جنت میں سرسبز باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (جنت تجری من تحتہا الانہار) گویا جنت میں آب رسانی کا نظام تحت زمینی ہوگا نہ کہ بالائے زمینی۔

گنگاپور میں تقریباً چھ ہزار مسلمان ہیں اور آٹھ مسجدیں ہیں۔ یہاں ایک رات گزری۔ تیلیوں والی مسجد میں فجر کی نماز کے بعد چند احادیث کی روشنی میں آخرت کی طرف توجہ دلائی گئی۔ انسان اپنے دنیا کے "گھر" کو بہتر بنانے میں مصروف رہتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ وہ زندگی سے زیادہ موت سے قریب ہے۔ کسی بھی وقت خدا کا فیصلہ آکر اس کے گھروندے کو منتشر کر سکتا ہے۔ اس کے بعد نہ وہ ہوگا نہ اس کی بنائی ہوئی دنیا جس کے بل پر وہ گھمنڈ کرتا تھا۔

۹ اگست کی صبح کو ہم اگلے سفر کے لیے گنگاپور اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے ٹھیک وقت پر گاڑی شور مچاتی ہوئی پلیٹ فارم میں داخل ہوگئی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ موت بھی اسی قسم کی ایک سواری ہے جو اپنے مقررہ وقت پر خدا کی طرف سے آتی ہے۔ کسی کے لیے وہ "مخصوص سواری" ہوگی جس پر آرام سے بٹھا کر اعزاز و اکرام کے ساتھ اس کو رب العالمین کی مہمانی کے لیے لے جایا جائے گا۔ کسی کے لیے وہ پولیس کی "کالی گاڑی" ہوگی جس کے تنگ و تاریک خول میں اس کو دھکا دے کر ڈال دیا جائے گا۔ اور کشاں کشاں خدا کی عدالت میں پہنچایا جائے گا تاکہ اس کے کبر اور سرکشی کی دردناک سزا اسے دی جائے۔

۱۰ بجے ہم ملارنا پہنچے ۔ یہاں پہنچتے ہی جو پہلی خبر ملی وہ یہ کہ دو مسلم خاندان آپس میں لڑ گئے۔ راستہ بھر قدرتی مناظر سے گزرتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا یہ کتاب الٰہی کے بکھرے ہوئے اوراق ہیں جن کو پڑھتا ہوا میں ان کے درمیان سے گزر رہا ہوں ۔ یہ ایک آفاقی نشر گاہ تھی جو خدائی پیغامات کو اس کی حسین ترین شکل میں نشر کر رہی تھی ۔ لوگ حقیقت سے اتنے بے خبر کیوں ہیں جب کہ زمین و آسمان سے مسلسل حقیقت کا اعلان ہو رہا ہے " میں نے سوچا۔ "خدائی پیغام رسانی کا یہ کام اتنے حسین، اتنے ابدی اور اتنے آفاقی انداز میں ہو رہا ہے کہ کوئی کان اس کو سننے سے محروم نہ رہے ۔ کوئی آنکھ اس کے مشاہدہ سے خالی نہ رہے۔ پھر بھی کیوں ایسا ہے کہ لوگ اس کے سننے کے لیے بہرے ہیں اور آنکھیں اس کو دیکھنے کے لیے اندھی ہو رہی ہیں "۔

درخت کہہ رہے ہیں کہ لوگوں کے لیے سایہ اور پھل کی مانند بنو ۔ پھول کہہ رہے ہیں کہ ایسے بنو کہ تم کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور لوگوں کو تم سے خوشبو ملے ۔ چڑیاں کہہ رہی ہیں کہ خدا کی حمد کے نغمے گاؤ ۔ ہوائیں کہہ رہی ہیں کہ لوگوں کے بیچ سے اس طرح گزر جاؤ کہ تمھارا سفر بھی جاری رہے اور کسی کو تم سے تکلیف نہ پہنچے ۔ پہاڑ کہہ رہے ہیں کہ لوگوں کے درمیان صبر اور تحمل کی چٹان بن کر رہو ۔ آسمان کہہ رہا ہے کہ اپنے آپ کو اتنا اوپر اٹھا لو کہ نفرت اور شکایت کی باتیں تم کو حقیر نظر آنے لگیں ـــــ اس قسم کی بے شمار آوازیں کائنات میں ہر آن ابل رہی ہیں مگر وہ کسی کو سنائی نہیں دیتیں ۔

خیال کا قافلہ یوں ہی چلتا رہا۔ یہاں تک کہ مجھے ایک حدیث یاد آئی ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے شب قدر کا علم دیا گیا اور میں مسجد سے نکلا کہ لوگوں کو بتادوں ۔ اتنے میں دو مسلمان لڑ گئے ۔ اس لیے وہ علم اٹھا لیا گیا۔ (فتلاحی الرجلان فرفعت) گویا جب لوگ باہمی لڑائی جھگڑے کی سطح پر ہوں تو علم الٰہی کی روشنی ان سے دور ہو جاتی ہے ۔ خدائی کلام کو سننے کے لیے ان کے کان بہرے ہو جاتے ہیں۔ معرفتِ خداوندی کا فیضان اسی قلب پر اترتا ہے جس کا دل دوسروں کے خلاف بغض و حسد سے خالی ہو ۔ جس کا سینہ دوسروں کے خلاف نفرت کا کوڑا خانہ بنا ہوا ہو، اس میں علم خداوندی کو لے کر

چلنے والے پاک فرشتے قدم نہیں رکھتے۔

۹ر اگست کی شام کو ہم بہتیڑ (ضلع سوائی مادھوپور) پہنچے۔ یہ بستی دہلی سے تقریباً ۳۵۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ بہتیڑ اور ملارنا دونوں قریب قریب بستیاں ہیں جن کو صرف ایک پہاڑی راستہ جدا کرتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا بازو معلوم ہوتی ہیں۔ دونوں بستیوں میں کئی تقریریں ہوئیں۔ ان تقریروں کا موضوع مختلف پہلوؤں سے، خوفِ خدا اور فکر آخرت تھا۔

یہ پورا علاقہ پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ سب سے اونچی چوٹی وہ ہے جو بہتیڑ اور ملارنا کے درمیان واقع ہے۔ اس کے اوپر شاہ محمد اسماعیل مکی کا مزار ہے۔ ہر جمعرات کے روز یہاں دیے جلائے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے کئی دیواریں بالکل کالی ہو گئی ہیں۔ قبر پر دیا جلانا خود ناقابل فہم ہے۔ مگر یہ اور بھی زیادہ ناقابل فہم ہے کہ ایسا عمل کیا جائے جو "بزرگ" کی درودیوار کو کالک لگانے کے ہم معنی بن جائے۔ تاہم ایک توہم پرست ذہن کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ کیونکہ توہم پرستی نام ہی ہے متضاد چیزوں کو ذہن میں جمع کرنے کا۔

اس پہاڑی کے اوپر دوسرا عجیب منظر بجلی کے کھمبے ہیں۔ بہتیڑ میں ابھی تک بجلی نہیں پہنچی۔ مگر اس غیر آباد بلند چوٹی پر، ملارنا سے، بجلی کے کھمبے پہنچا دیے گئے ہیں۔ یہ پچھلے الکشن (مارچ ۱۹۷۷ء) کی برکت ہے۔ تاہم تاروں کا بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے یہ بجلی کے کھمبے ابھی تک قمقموں کے بوجھ سے خالی ہیں۔ ہم تقریباً دو درجن آدمیوں کے قافلے نے پہاڑ کی اس چوٹی پر عصر کی نماز ادا کی اور دو گھنٹے تک یہاں رہے۔ کھلا آسمان، تازہ ہوا، سرسبز میدان، پہاڑی سلسلے، ڈبڈبائی ہوئی ندیاں، چڑیوں کے چہچہے، غرض قدرت کے ماحول میں گزرنے والے یہ لمحات بڑے پُرکیف تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ہم زندگی کی ایسی بلند سطح پر پہنچ گئے ہیں، جہاں تمام پستیاں تحلیل ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ وہ مسائل جو زمین پر انسان کو الجھائے رہتے ہیں، یہاں بے حقیقت ہوتے ہوئے دکھائی دیے۔ آخر میں یہاں ایک نشست ہوئی جس میں دعوتی کام کی اہمیت اور موجودہ زمانہ میں اس کے امکانات پر اظہار خیال کیا گیا۔

۱۱ر اگست کو ہم گنگاپور ہوتے ہوئے دوبارہ دہلی واپس آگئے۔

تیسرا سفر

مارچ ۱۹۷۸ء کا تیسرا ہفتہ میوات میں گزرا۔ اس سفر کا اصل مقصد یہ تھا کہ چند دن شہر سے دور کھلی فضا میں گزارے جائیں شہروں کی دنیا بڑی حد تک مصنوعی دنیا ہوتی ہے مگر جب آدمی آبادیوں سے دور کھلی فضا میں ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ قدرت کے قریب پہنچ گیا ہے ۔ وہ ایک ایسے آفاقی آئینہ کے سامنے ہے جہاں وہ خدا کو براہِ راست دیکھ سکتا ہے ۔

میں نیم کھیڑا (ضلع گوڑگاؤں) کے باہر اوجینا ڈرین کے ٹیلے پر کھڑا تھا۔ آسمان کی وسعتیں، پہاڑوں کی بلندیاں، زمین کے قدرتی مناظر میری آنکھوں کے سامنے تھے " انسانوں کی دنیا سے دور خدا کی دنیا کتنی حسین ہے " میری زبان سے نکلا۔ خدا نے دو چیزوں میں اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے۔ ایک، عالم کائنات (یدبر الامر) کی سطح پر ۔ دوسرے، الہامی شریعت (یفصل الآیات) کی سطح پر۔ اول الذکر مقام پر وہ براہِ راست اپنی مرضی کو نافذ کر رہا ہے ۔ ثانی الذکر مقام پر وہ چاہتا ہے کہ انسان خدا کی مرضی کو جانے اور بطور خود اس کو اپنی زندگی میں نافذ کرے ۔

" کیا خدا کی دونوں دنیاؤں میں تضاد ہے ،، میرے دل نے کہا " کیا تدبیر امر کی سطح پر خدا کچھ اور ہے اور تفصیل آیات کی سطح پر کچھ اور ۔ بقیہ کائنات کو خدا انتہائی محکم قوانین کی بنیادوں پر چلا رہا ہے ۔ مگر انسانوں سے اس کو مطلوب ہے کہ وہ خوابوں اور کرامتوں کی ایک پراسرار دنیا بنا کر اس کی طلسماتی فضا میں زندگی گزاریں ۔ خدا کو شیشم یا چنار کا ایک درخت اُگانا ہو تو وہ سو سال کا خاموش منصوبہ بناتا ہے ۔ مگر اپنے بندوں سے وہ چاہتا ہے کہ نعروں اور تقریروں کا طوفان اُٹھا کر آناً فاناً اپنے مستقبل کو بدل ڈالیں ۔ ستاروں اور کہکشاؤں کی دنیا میں وہ ہر آن متحرک ہے ۔ مگر مدرسوں اور خانقاہوں میں وہ جمود اور تقلید پر راضی ہو گیا ہے ۔ پھولوں اور پتیوں میں وہ خوش ذوقی کا دریا بہا رہا ہے ۔ ہوا کے جھونکوں اور پانی کے جھرنوں میں وہ لطافت کا خزانہ بکھیر رہا ہے ۔

آسمانوں کی وسعت اور پہاڑوں کی بلندی میں وہ خاموش عظمتوں کا مظاہرہ کر رہا ہے ۔ مگر انسانوں سے وہ چاہتا ہے کہ وہ گدھے اور کوے کی طرح چیخیں اور احتجاج اور مطالبات کی غوغا آرائی کریں ۔ چہچہاتی ہوئی چڑیوں سے لے کر روشن ستاروں تک ، ہری بھری گھاس

سے لے کر نیلے آسمان تک ہر طرف اتھاہ حکمت و معنویت نظر آتی ہے۔ ہر جگہ انتہائی بامعنی سرگرمیاں جاری ہیں، مگر اپنے بندوں سے خدا ایسی عبادات پر راضی ہے جس میں کچھ رٹے ہوئے الفاظ کو زبان سے دہرا لینے سے بڑے بڑے مقامات طے ہوتے ہیں اور عالی شان جنتیں حاصل ہوجاتی ہیں"۔

حقیقت یہ ہے کہ جو دین آج مقررین اسلام اور مفکرین ملت ہر طرف تقسیم کر رہے ہیں، اس کو دین کہنا اس قرآن پر اتہام ہے جس کی عظمت کا یہ حال ہے کہ ویسا قرآن سارے جن وانس مل کر بھی تصنیف نہ کرسکیں۔ ایسا دین خدا کی اس عظیم وحسین کائنات کے اندر ایک مسخرہ پن کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ کائنات کی سطح پر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ خدا کی دنیا رنگ اور خوشبو بکھیرنے والے پھولوں اور پیار اور بے نفسی کا سبق دینے والی چڑیوں کے لیے ہے۔ مگر دین کے ٹھیکیدار آج جس دین کا مظاہرہ کر رہے ہیں، اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا خدا کی جنت نکمے لوگوں کا کباڑ خانہ ہے یا مسخروں کی نمائش گاہ۔ یہ بات آج لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر جب صور پھونکا جائے گا اور ساری حقیقتیں کھل جائیں گی، اس وقت لوگ اس کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیں گے۔ اگرچہ اس وقت کا دیکھنا کسی کے کام نہ آئے گا۔

یہاں چند مجلسوں میں وعظ ونصیحت کا موقع بھی ملا۔ زیادہ تر حدیثیں اور صحابہ کے واقعات سنائے گئے۔ ایک تقریر کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

جب مجھ کو کہیں تقریر کرنی ہوتی ہے تو ہمیشہ ایک سوال میرا پیچھا کرتا ہے "کیا بات ہے جو میں کہوں"۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی بات ایسی نہیں جو کہی نہ جاچکی ہو۔ عربی شاعر عنترہ کا ایک شعر ہے:

هل غادر الشعراء من متردم

کہ کیا پچھلے شعراء نے کوئی پیوند لگانے کی جگہ باقی چھوڑی ہے جس کو ہم پورا کریں۔

دینی اور اخلاقی لحاظ سے یہ بات اور زیادہ صحیح ہے حقیقت یہ ہے کہ کہنے والے ساری بات کہہ چکے ہیں۔ پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ سننے والوں کا قافلہ سننے سے پہلے جس راستہ پر چل رہا تھا، اسی راہ پر سننے کے بعد بھی چلا جا رہا ہے۔ گویا اصل مسئلہ کہنے کا نہیں ہے۔ اصل مسئلہ کہنے کو پکڑنے کا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کے لیے کوئی تیار نہیں۔

میوات میں تین سو سال پہلے ایک صوفی شاعر گزرے ہیں۔ ان کے اشعار اکثر میواتیوں

کو یاد ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے۔

پی پیارے کے دیس کی بڑی کٹھن ہے گیل   کوئی کوئی جائیگو بھیک جی سلجھا سلجھا بیل

میں سمجھتا ہوں کہ آدمی اگر پکڑ لے تو یہی ایک شعر اس کی اصلاح کے لیے کافی ہے۔ بھیک جی کہہ رہے ہیں کہ آخرت کا راستہ بڑا کٹھن ہے۔ یہ جھاڑیوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہی شخص منزل پر پہنچے گا جو جھاڑیوں سے بچ بچ کر چلے۔ جو اس قسم کا اہتمام نہیں کرے گا وہ راستہ میں الجھ کر رہ جائے گا۔

میو لوگ کس حد تک اس پر عمل کر رہے ہیں، اس کے لیے میں یہیں کا ایک واقعہ سناتا ہوں، کل (۱۸ مارچ ۱۹۷۸) صبح دس بجے ہم گاؤں کے باہر تھے۔ وہاں سرکار کی طرف سے بند بنایا جا رہا ہے۔ سینکڑوں مرد، عورتیں مٹی ڈھونے میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک عورت جو مٹی کا ٹوکرا اٹھائے ہوئے تھی، ایک مرد نے اس سے کہا کہ "یہاں مٹی ڈال" اس پر عورت بگڑ گئی "تو کون ہوتا ہے بتانے والا" اس نے کہا۔ پہلے لفظی تکرار ہوئی۔ اس کے بعد دونوں طرف سے لاٹھیاں آگئیں۔ کچھ لوگ مرد کی طرف سے اور کچھ عورت کی طرف سے جمع ہو گئے اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن کر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔

یہ سارے کے سارے مسلمان تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ ایک مسلمان کے لیے دوسرے مسلمان کی جان، مال، آبرو حرام ہے۔ مگر جب ایک "جھاڑی" آگئی تو اس سے بچ کر نکلنے کے لیے وہ تیار نہ ہوئے۔ وہ جھاڑی سے الجھ گئے۔ وہ بھول گئے کہ اس طرح وہ اپنی آخرت کی منزل کو کھوٹا کر رہے ہیں۔

آپ لوگ داڑھی بھی رکھتے ہیں نماز اور تسبیح بھی پڑھتے ہیں۔ مگر جہاں کوئی جھاڑی آئی، اس میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ خدا کا فکر دلوں میں پیدا نہیں ہوا۔ ہم نے آخرت کو اپنی منزل نہیں بنایا۔ ہاتھ میں تسبیح کیوں نہ ہو۔ عملاً سارے لوگ دنیا کی منزل کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ صرف یہ ہے کہ کوئی "بے داڑھی" ہو کر اس طرف بھاگ رہا ہے، کوئی داڑھی اور تسبیح لیے ہوئے اس مقدس سفر میں مشغول ہے۔

مومن کا ہر مسئلہ آخرت کا مسئلہ ہے۔ مگر ہماری زندگی میں جب کوئی صورت پیش آتی ہے تو ہم فوراً اس کو دنیا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ مثلاً لڑکی کی شادی کو لیجیے۔ ایک میو کے گھر میں

شادی کا معاملہ ہو تو خواہ کتنا ہی قرآن و حدیث سنایا جائے، وہ اسی طرح شادی کرے گا جس طرح عام دنیا پرست کرتا ہے۔ خواہ اس کی قیمت سودی قرض اور کھیت کا رہن ہی کیوں نہ ہو۔

کوئی شخص آپ کو سخت بات کہہ دے۔ کسی سے آپ کو تکلیف پہنچ جائے تو آپ چاہتے ہیں کہ اس کو مٹا ڈالیں۔ اس کی معاشیات کو تباہ کردیں۔ اس کی عزت کو خاک میں ملادیں۔ یہ سب اس لیے ہے کہ آدمی بھول جاتا ہے کہ اس کے اور اس کے فریق کے درمیان خدا کھڑا ہوا ہے جو سارے طاقت وروں سے زیادہ طاقت ور ہے۔ اگر معاملہ کا یہ پہلو ذہن میں ہو تو اپنے کسی بھائی کو ذلیل کرنے کا خیال مضحکہ خیز حد تک بےمعنی معلوم ہو۔ کیوں کہ عزت اس کے لیے ہے جس کو خدا عزت دے اور ذلیل وہ ہے جو خدا کی نظر میں ذلیل قرار پائے۔

ہر کسان جانتا ہے کہ ٹونے ٹوٹکے سے کوئی کھیت اپنی فصل نہیں اگاتا۔ مگر خدا کی جنت جو تمام قیمتی چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے، اس کے متعلق فرض کرلیا گیا ہے کہ وہ کچھ الفاظ زبان سے دہرا کر یا کچھ رسمی اعمال ادا کرکے مل جائے گی۔ یہ عظیم الشان بھول ہے۔ خدا کی پوری کتاب نطق کی زبان میں اور خدا کی ساری کائنات خاموشی کی زبان میں اس کا انکار کر رہی ہے۔

مومن وہ ہے جو ہر مسئلہ کو آخرت کا مسئلہ سمجھے، جو آخرت کی عزت و ذلت کو اہمیت دے نہ کہ دنیا کی عزت و ذلت کو۔

میوات کا سفر

۱۹۶۷ میں جب میں دہلی آیا تو "میوات" کا ایک افسانوی تصور میرے ذہن میں تھا۔ یہ خواہش تھی کہ وہاں چل کر خود اپنی آنکھ سے دیکھا جائے کہ میوات کیا ہے۔ پہلی بار میں ۱۹۶۹ء میں میوات گیا اور وہاں ۲۴ گھنٹے گزارے۔ اس کے بعد اگلے دس سال کے عرصہ میں بار بار میوات کا سفر ہوتا رہا۔

اب کچھ لوگوں کا مشورہ ہوا کہ ان پچھلے سفرناموں کو اکٹھا کر کے انھیں ایک کتاب کی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ ان سفرناموں کو دوبارہ مرتب کرتے ہوئے خیال آیا کہ یہ اسفار پندرہ سال پہلے کے زمانہ میں پیش آئے تھے۔ ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک بار اور میوات کے علاقہ کا سفر کر لیا جائے تاکہ میرا مشاہدہ مطابق حال ہو جائے۔ اس کے مطابق میوات کا زیر تذکرہ سفر ہوا۔ یہ سفر میں نے بالقصد بذریعہ بس کیا تاکہ میں عام میواتیوں کو ان کے اپنے ماحول میں دیکھ سکوں اور زیادہ قریب سے میوات کا مشاہدہ کر سکوں۔

اس سفر میں مولانا عبدالرحیم بڈیڈوی میرے ساتھ تھے۔ ان سے میں نے مقصدِ سفر کا ذکر کیا تو انھوں نے مسکرا کر کہا: "میوات میں ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ پندرہ سال پہلے آپ نے میوؤں کو جس حال میں دیکھا تھا، وہیں آج بھی وہ پڑے ہوئے ہیں۔" سفر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ واقعی ان کا بیان صحیح تھا۔ میوات کے دوسرے فرقوں کے لیے زمین حرکت میں ہے مگر میوؤں کے لیے زمین بدستور رکی ہوئی ہے، میوؤں کے لیے وہ حرکت نہیں کرتی۔

ایک صاحب نے بس کا تازہ لطیفہ بتایا۔ ایک عمر رسیدہ میونی بس میں داخل ہوئی۔ وہ بس کے اندر اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ کہاں بیٹھے۔ ایک مسافر نے ازراہ تفریح ڈرائیور کی سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ دیکھ وہ سیٹ خالی ہے، اس پر بیٹھ جاؤ۔ میونی اپنی گٹھری لیے ہوئے وہاں پہنچی اور "خالی سیٹ" پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر میں ڈرائیور اندر داخل ہوا۔ "عورت تو یہاں کہاں بیٹھ گئی۔ یہاں سے تو میں بیٹھ کر گاڑی چلاؤں گا۔" ڈرائیور نے کہا۔ میونی نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی گٹھری سنبھالتے ہوئے جواب دیا: میں تو چوکھی بیٹھی ہوں، تو کہیں اور سے چلالے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ میواتی مرد یا عورتیں خدانخواستہ پیدائشی طور پر کم سمجھ ہوتے ہیں۔ وہ بھی یقیناً وہی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں جو دوسرے انسان لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ یہ در اصل تعلیم کی کمی ہے جس کی بنا پر میوؤں کا شعور ارتقاء نہیں کر پاتا۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ ایک بوڑھی میونی بازار گئی۔ اور پچاس روپے میں ایک زنانہ جوتا خرید کرلے آئی۔ گاؤں کی عورتوں نے دیکھ کر پوچھا کہ یہ جوتا تم نے کتنے میں خریدا۔ میونی نے کہا کہ "آٹھ آنے میں" عورتوں نے کہا کہ کیوں مذاق کر رہی ہو، صحیح دام بتاؤ۔ میونی نے کہا کہ میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ بات یہی ہے۔ عورتوں کو یقین نہیں آیا کہ ایسا جوتا آٹھ آنے میں مل سکتا ہے، چنانچہ وہ اصل قیمت جاننے کے لیے اصرار کرتی رہیں۔ آخر میونی نے کہا کہ بات یہ ہے کہ پہلے میں ایک سیر گھی بازار لے جاتی تھی اور آٹھ آنے میں بیچتی تھی۔ پھر آٹھ آنے کا جوتا خرید کر لاتی تھی۔ اب میں ایک سیر گھی لے کر بازار گئی تو میرا گھی پچاس روپے میں بکا اور جوتا بھی پچاس روپے میں ملا۔ تو میرے لیے تو جیسا پچاس روپیہ ویسا آٹھ آنہ۔

مذکورہ میونی نے اقتصادیات کے ایک اصول کو نہایت کامیابی کے ساتھ سادہ لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ یعنی قیمت کے تعین کے اصول کو۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۸۷ کی صبح کو ساڑھے چھ بجے دہلی سے بذریعہ بس روانگی ہوئی۔ شاہ جہاں آباد کی فصیلوں اور لال قلعہ کی دیواروں کو پیچھے چھوڑتے ہوتے ہماری بس آگے بڑھتی رہی۔ فرید آباد، بلب گڑھ، پلول، ہوڈل، کوسی ہوتے ہوئے ہم کاما (ضلع بھرت پور) پہونچے۔ کاما ایک تاریخی قصبہ ہے۔ قدیم راجہ کے محل اب بھی یہاں ٹوٹی ہوئی حالت میں موجود ہیں۔

۱۹۴۷ سے پہلے محلہ قاضی پاڑہ میں مسلمانوں کی آبادی تھی۔ تقسیم کے بعد صاحب حیثیت لوگ زیادہ تر پاکستان چلے گیے۔ اس وقت یہاں ایک جامع مسجد زیر تعمیر تھی۔ عین اسی زمانہ میں تقسیم کا ہنگامہ پیش آیا اور مسجد اس حال میں پڑی رہ گئی کہ دیواریں کھڑی ہوئی تھیں مگر چھت غائب تھی۔ صحن اور فرش کی جگہ گڑھے تھے۔ ویران مسجد جانوروں کی آماج گاہ بن گئی۔

۳۰ سال سے زیادہ عرصے کے بعد حاجی رحیم بخش کو خیال آیا کہ اس کی تعمیر کریں اور اس کو باقاعدہ آباد کریں۔ انھوں نے "آسمان کے سایہ کے نیچے" اور صرف اللہ کے بھروسہ پر کام شروع

کردیا۔ انھوں نے مسجد کی تعمیر مکمل کی اور یہاں حفظِ قرآن کا مدرسہ قائم کیا۔ اب ماشاء اللہ یہ ایک آباد مسجد ہے۔ یہاں تقریباً ۵۰ طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ حافظہ کے علاوہ دوسرے علوم بھی بقدر ضرورت پڑھائے جا رہے ہیں۔ قاری عبدالرحمٰن ہزاروی اس کے روحِ رواں ہیں۔

میری فرمائش پر چند بچوں نے قرآن کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے۔ بچے جب قرأت کے ساتھ قرآن کی آیتیں پڑھ رہے تھے تو مجھے یاد آیا کہ نزولِ قرآن سے لے کر اب تک مسلسل ہر دور میں اور رات دن کے ہر لمحہ میں امت اسی طرح قرآن کو پڑھتی اور سناتی رہی ہے۔ اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے حال کا رشتہ ماضی سے مل گیا ہے، جیسے آج کے قاری قرآن کے الفاظ دورِ اول کے قاری قرآن سے ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ جیسے کہ یہ وہی پیغمبرِ عربی کی بلند کی ہوئی قدیم آواز ہے جو مجھ کو جدید نسل کی زبان سے سنائی دے رہی ہے۔

یہ وہ علاقہ ہے جہاں ۱۹۴۷ میں کافی مارکاٹ ہوئی تھی۔ یہاں کے مسلمان سب اِدھر اُدھر چلے گئے تھے۔ مسجد کو آباد کرنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مسلمان دوبارہ آکر بسنا شروع ہو گئے چنانچہ اب کافی مسلمان دوبارہ واپس آکر یہاں آباد ہو گئے ہیں۔ اسی طرح دوسری قوموں کے لوگوں کی آبادی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

کاماکی اس مسجد کے قریب ایک گوردوارہ ہے اور اس سے بالکل ملا ہوا مندر بھی ہے۔ یہاں جو باباجی ہیں وہ روزانہ صبح کو فجر سے پہلے اپنی مذہبی ریکارڈنگ کرتے ہیں۔ مگر مسجد والوں نے بتایا کہ باباجی ہماری عبادت کا اتنا احترام کرتے ہیں کہ جیسے ہی ہمارا موذن فجر کی اذان شروع کرتا ہے، وہ فوراً اپنی ریکارڈنگ بند کر دیتے ہیں۔

باباجی ایسا کسی مطالبہ یا احتجاج کی بنا پر نہیں کرتے۔ بلکہ محض اپنے مذہبی جذبہ کے تحت کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک دوسرے کی اچھی بات کا احترام کرنا ایک فطری جذبہ ہے جو خود خدا نے ہر آدمی کے اندر پیدا کر رکھا ہے۔ اگر انسان کو چھیڑا نہ جائے تو یہ فطری جذبہ کام کرے گا اور اپنے آپ دوسروں کے اچھے کام کے احترام کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ مگر جب ایک فریق دوسرے فریق کی انا کو جگا دے تو یہ پیدائشی جذبہ دب جاتا ہے۔ اس کے بعد انسان کی بھڑکی ہوئی انا کام کرنے لگتی ہے نہ کہ خدا کا پیدا کیا ہوا فطری جذبہ ـــــــ حقیقت یہ ہے کہ

ہر آدمی کے حصہ میں اس کے اپنے عمل کا انجام آتا ہے۔ اگرچہ وہ اس کو نادانی کی بنا پر فریق ثانی کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔

اس مسجد اور مدرسہ کو خوش قسمتی سے ایسے کارکن ملے ہیں جو نہایت سیدھے ہیں۔ جھگڑا لڑائی تو درکنار، وہ احتجاج کی زبانی مہم بھی چلانا نہیں جانتے۔ وہ ماحول کے ہر خوش گوار یا ناخوش گوار واقعہ سے بے خبر رہ کر بس "قرآن کی خدمت" میں مشغول رہتے ہیں۔ اس سادہ مزاجی کا انھیں زبردست فائدہ ملا ہے۔

مجھے یہاں بیت الخلاء جانے کا اتفاق ہوا۔ خلافِ توقع میں نے دیکھا کہ دو نہایت صاف ستھرے بیت الخلاء "فلش" کے اصول پر بنے ہوئے ہیں۔ یہ میوات میں میرے لیے نئی چیز تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ دونوں حکومت کی مدد سے بنے ہیں۔ حکومت کی طرف سے دیہات کے سرکاری اسکولوں کے لیے اس قسم کی سہولت کا اعلان کیا گیا تھا۔ مدرسہ والوں نے بھی اپنے لیے دو بیت الخلاء کی درخواست دے دی۔ درخواست منظور ہو گئی، اور یہ مسئلہ نہایت عمدہ طریقہ پر حل ہو گیا۔ اسی طرح مدرسہ والوں کی درخواست پر حکومت کے محکمہ نے یہاں بجلی اور پانی بھی پہونچا دیا ہے۔

مسجد اور مدرسہ کے کارکنوں کو دیکھئے تو وہ تقریباً بے زبان معلوم ہوں گے۔ مگر بعض حالات میں بے زبانی اس سے بھی زیادہ بڑی طاقت بن جاتی ہے جتنی کہ زبان دانی۔

کاماسے دوبارہ بذریعہ بس روانہ ہوئے۔ اور پہاڑی، گوپال گڑھ، سیکری وغیرہ ہوتے ہوئے گلپاڑہ پہنچے۔ راستہ میں بس چند منٹ کے لیے میل کھیڑلا کے مدرسہ پر رکی۔ یہاں میں نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک شاندار مسجد اور مدرسہ وسیع رقبہ میں بنایا گیا ہے اور اس پر اسلامی مدرسہ کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ میں نے سوچا کہ جو لوگ "تعمیر" کے ان امکانات کو نہیں دیکھتے، اور صرف "تخریب" کی خبر بس سناتے رہتے ہیں وہ خود سب سے بڑے تخریب کار ہیں، خواہ بطور خود وہ اپنے آپ کو معمار قوم کیوں نہ سمجھ رہے ہوں۔

گلپاڑہ میں بھی سڑک کے کنارے ایک بڑی جامع مسجد کھڑی ہوئی نظر آئی۔ یہ مسجد بالکل نئی جگہ پر بنائی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ یہاں ایک مدرسہ بھی زیر تعمیر ہے۔ اس مسجد میں ہم

نے ظہر کی نماز ادا کی۔ میں نے سوچا کہ اس ملک میں اگر مسلمانوں نے کچھ کھویا ہے تو اس سے بہت زیادہ اب بھی ان کے لیے یہاں موجود ہے۔ مگر اس ملک میں مسلمانوں کی قیادت ماضی کے قائدین سے لے کر حال کے قائدین تک ایک ہی غلطی کر رہی ہے۔ اور وہ ہے بعض ناموافق حالات کی تعمیم (جنرلائزیشن)۔ ہماری قیادت کا حال یہ ہے کہ ۹۹ اچھی باتیں اس کو نظر نہیں آتیں۔ البتہ ایک خراب بات اس کو انتہائی باریک بینی کے ساتھ نظر آجاتی ہے۔ اور اس کے نام پر دھوم مچا کر عام مسلمانوں کا ذہن اس طرح خراب کر دیتی ہے کہ اب مسلمانوں میں شاید وہ لوگ باقی ہی نہیں رہے جو مثبت اور حقیقت پسندانہ انداز پر سوچ سکیں۔

گلپاڑہ میں مفتی عبدالشکور مظاہری (پیدائش ۱۹۴۷) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۳۹۰ھ میں وہ ایک جماعت کے ساتھ پٹن (گجرات) گیے۔ یہاں مولانا محمد طاہر پٹنی (مصنف مجمع بحار الانوار) کے خاندان کے ایک صاحب ان کو اپنے گھر لے گیے۔ ان کے پاس مخطوطات (ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابوں) کا ایک بڑا ذخیرہ تھا۔ وہ اس کو فروخت کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنا یہ ذخیرہ مختلف لوگوں کو دکھایا، مگر کوئی شخص اس کو خریدنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر کتابوں کے سرورق غائب تھے اور بظاہر یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ کون سی کتاب ہے۔

مفتی عبدالشکور صاحب نے ایک کتاب اٹھائی۔ یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں تھی۔ مگر کسی جلد پر بھی سرورق موجود نہ تھا۔ میں نے دیکھا تو چاروں نہایت عمدہ خط میں اس طرح یکساں انداز میں لکھی ہوئی تھیں جیسے کہ وہ ٹائپ میں چھاپی گئی ہوں۔

مفتی عبدالشکور صاحب نے ایک جلد اٹھائی اور کھول کر اس کا ابتدائی صفحہ پڑھنا شروع کیا۔ اس میں چند سطروں کے بعد مصنف نے اپنے اس مجموعۂ کتب کے بارے میں یہ الفاظ لکھے تھے:

وَسَمَّیْتُهَا فتح الله المعين على شرح العلّامة مُلّا مسكين

وہ چوں کہ "ملا مسکین" سے واقف تھے، انھوں نے اس جملہ سے پوری بات پالی ———— "کنز الدقائق کی شرح ملا مسکین، اور ملا مسکین کی شرح فتح اللہ المعین"۔ یہ کتاب اب

بھی نہایت عمدہ حالت میں ہے اور اس کے مصنف سید محمد ابو السعود ہیں۔ اسی طرح انھوں نے دوسری کتابوں کے بارہ میں پتہ کرلیا اور خریدنے کے لیے آمادگی ظاہر کردی۔ مالک نے اولاً سب کی قیمت تین ہزار روپے بتائی۔ مگر مفتی عبدالشکور صاحب کے الفاظ میں " اس وقت تین ہزار میرے لیے کالا پہاڑ کی طرح تھا "۔ آخر کار مالک نے صرف ۳۵۰ روپے میں سارا قیمتی ذخیرہ انھیں دیدیا۔ یہ کل ۶۰۰ کتابیں ہیں۔ ان میں فتاوی تاتارخانیہ جیسی تاریخی کتابیں بھی شامل ہیں۔

کسی حقیقت کو پانے کے لیے پیشگی طور پر اس سے آشنا ہونا ضروری ہے۔ جو لوگ پیشگی طور پر آشنا نہ ہوں، وہ حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھیں گے مگر وہ اس کو پہچان نہ سکیں گے۔

گلپاڑہ کی ملاقاتوں میں ایک یادگار ملاقات حاجی دراب خاں (عمر ۸۰ سال) کی تھی۔ وہ بالکل ان پڑھ ہیں۔ اپنا نام بھی نہیں لکھ سکتے۔ مگر ان کے اندر ایک ایسی خصوصیت ہے جو اپنی معلومات کے مطابق اب تک میں نے کسی عالم کے اندر بھی نہیں پائی، وہ ہے ——— اختلاف کے باوجود قدردانی۔

مولانا عبدالرحیم صاحب (بڈیڈیہ، ضلع گوڑگاؤں) اس سے پہلے گلپاڑہ کے مدرسہ میں استاد تھے۔ وہ یہاں ساڑھے تین سال تک امام اور مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۹ء میں وہ یہاں سے چھوڑ کر چلے گئے۔ دیہات کے لوگوں کو اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں میں اماموں اور مدرسوں سے شکایت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ گلپاڑہ کے لوگوں کو بھی ہوئی۔ انھیں میں سے ایک حاجی دراب خاں بھی تھے۔ ان کے الفاظ میں ان کی " اس مولوی سے لڑائی رہنے لگی "۔

لڑائی کس بات پر ہوتی تھی۔ معمولی معمولی باتوں پر۔ مثلاً حاجی دراب خاں نے اپنا ایک درخت کٹوایا اور اس کی لکڑی مسجد کے صحن میں رکھوادی۔ اس کی وجہ سے مسجد کا صحن تنگ ہوگیا۔ مولانا عبدالرحیم صاحب نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ اس لکڑی کو یہاں سے ہٹاؤ۔ مگر حاجی دراب خاں نے نہیں ہٹوایا۔ آخر مولانا عبدالرحیم صاحب نے ایک روز اپنے مدرسہ کے لڑکوں کے ذریعہ تمام لکڑی کو وہاں سے نکلوا کر باہر رکھوادیا۔ اس پر حاجی دراب خاں کافی غصہ ہوئے۔ وغیرہ

یہ مسجد حاجی دراب خاں کے خاندان نے بنوائی تھی۔ مدرسہ بھی ان ہی لوگوں نے قائم کیا تھا۔ مولانا عبدالرحیم صاحب وہاں گویا ان کے ایک "ملازم" تھے۔ ایسی حالت میں ان کی یہ جسارت بالکل ناقابل برداشت تھی۔ اس قسم کی اور بہت سی باتیں تھیں جن کی وجہ حاجی دراب کی "اس مولوی سے لڑائی رہتی تھی" مگر مولانا عبدالرحیم نے بتایا کہ اس کے باوجود کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حاجی دراب ان کے بارہ میں مخالفانہ رول ادا کریں۔

مولانا عبدالرحیم ایک بااصول آدمی ہیں اور اسی کے ساتھ صاف گو ہیں۔ چنانچہ گاؤں کے لوگوں سے کسی نہ کسی بات پر ان کی تکرار ہو جاتی تھی۔ مثلاً وہ یہاں مسجد کے امام بھی تھے۔ مقرر وقت پر وہ ٹھیک گھڑی کے لحاظ سے جماعت شروع کر دیتے تھے، خواہ کوئی آیا ہو یا نہ آیا ہو۔ بعض لوگوں کو یہ بات بہت ناگوار ہوتی تھی۔ اس طرح کی باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی لوگ ان کے خلاف ہو گیے۔ حتیٰ کہ انھوں نے گاؤں کی اکثریت کو اپنے موافق بنالیا اور عام رائے یہ ہو گئی کہ ان کو مدرسہ سے نکال دیا جائے اور ان کی جگہ دوسرے آدمی کو لایا جائے۔

مگر حاجی دراب اس تحریک کے سخت مخالف ہو گیے۔ انھوں نے کہا کہ "اگرچہ اس مولوی سے میری ذاتی لڑائی ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ مدرسہ کے کام کے لیے وہ نہایت موزوں ہے، اس کو ہٹانے کے بعد ایسا لائق معلم ہم کو نہیں مل سکتا۔ اس لیے انھوں نے اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے مولوی عبدالرحیم صاحب کی بھرپور حمایت کی —— ذاتی شکایت کے باوجود اعتراف اور قدر دانی کی یہ صفت اتنی کم یاب ہے کہ کم از کم میں نے اپنے تجربہ میں اب تک کوئی دوسرا حاجی دراب نہیں دیکھا۔

"حاجی دراب خاں" بظاہر ایک معمولی آدمی ہیں مگر میرے نزدیک وہ آنے والے عظیم میوات کی علامت ہیں۔ وہ میوؤں کے تاریک حال میں اس کے روشن مستقبل کو بنا رہے ہیں۔

میو قوم اگرچہ اپنی جہالت اور اپنی بے شعوری کی وجہ سے ہندستان کی ایک پچھڑی ہوئی قوم بنی ہوئی ہے۔ مگر فطری امکانات کے اعتبار سے وہ ایک جاندار قوم ہے۔ باعتبار واقعہ اگرچہ یہ دوسروں سے پیچھے ہیں۔ مگر باعتبار امکان آج بھی وہ دوسروں سے آگے ہیں۔ ذاتی شکایتوں کو نظر انداز کر کے کسی کی خوبیوں کا اعتراف کرنا۔ اعلیٰ ترین انسانی صفت ہے۔ حاجی دراب کی مثال

بتاتی ہے کہ یہ اعلیٰ انسانی صفت میووں کے اندر موجود ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں میوؤں کے لیے ایک عظیم مستقبل کا امکان چھپا ہوا ہے۔

حاجی دراب خاں نے بتایا کہ انھوں نے مولانا محمد الیاس صاحبؒ کو کئی بار دیکھا ہے اور ان کی تقریریں اور گفتگوئیں سنی ہیں۔ میں نے کہا کہ مولانا الیاس صاحب کی کوئی بات جو آپ کو یاد ہو بتائیے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا جب یہاں آئے تو انھوں نے میووں سے کہا کہ ——— سلوک سے رہو، نماز پڑھو اور جماعتوں میں جاؤ۔

میں مسجد میں تھا کہ ایک میو نے دوسرے میو سے سوال کے انداز میں کہا: کر لیے اُجوّ (کر لیا وضو) میواتی زبان دراصل بگڑی ہوئی اردو کا دوسرا نام ہے۔ دنیا کی تقریباً تمام زبانوں کا حال یہی ہے۔ ہر ایک کی ایک ادبی اور تحریری زبان ہوتی ہے اور دوسری وہ ہے جس کو عوامی بولی کہا جاتا ہے۔ اسی فرق کی وجہ سے ایک زبان جانتے ہوئے بھی آدمی اس ملک کے باشندوں کی باہمی گفتگو کو سمجھ نہیں پاتا۔ کیوں کہ غیر شخص کتابی زبان جانتا ہے اور مقامی لوگ عوامی بولی میں باہم گفتگو کرتے ہیں۔ یہ ثنویت عربی اور انگریزی جیسی زبانوں میں بھی ہے اور اردو اور ہندی جیسی زبانوں میں بھی۔

ایک نوجوان میو سے ملاقات ہوئی۔ اس کا ایک ہاتھ کہنی کے پاس سے کٹا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ تھریشر (Thresher) میں کٹ گیا ہے۔ جب سے تھریشر (دانہ کو بھوسہ سے الگ کرنے والی مشین) کا رواج ہوا ہے، اس طرح کے حادثے زرعی علاقوں میں بہت زیادہ پیش آرہے ہیں۔ بیل کا رواج کم ہو جانے کی وجہ سے لوگ تھریشر کا استعمال کرنے پر مجبور ہیں، اور موجودہ تھریشر کا حال یہ ہے کہ ذرا سی غفلت سے وہ ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور پھر اس کو کچلے بغیر نہیں رہتا۔

ترقی یافتہ ملکوں میں اب تھریشر کی جگہ کمبائن (Combine) مشین رائج ہو گئی ہے۔ یہ دوسری مشین بہ یک وقت دو کام کرتی ہے۔ وہ فصل کاٹتے ہوئے عین اسی وقت اس کا دانہ بھی الگ کر دیتی ہے۔

تاہم تھریشر بجائے خود کوئی مہلک چیز نہیں، یہ ہندستانی صنعت ہے جس نے اس کو مہلک بنا دیا ہے۔ ہندستان میں جو تھریشر بنائے جاتے ہیں وہ ایسی وضع کے ہوتے ہیں کہ ان

میں ڈالنے والی چیز کنارے سے ڈالی جاتی ہے اور اس کو ہاتھ سے دھکیلنا پڑتا ہے۔ اس بنا پر یہ خطرہ رہتا ہے کہ ہاتھ اس کے اندر چلا جائے۔ مگر یہ پرانا طریقہ ہے۔ باہر کے ملکوں میں اب ایسے تھریشر بنائے گیے ہیں جن میں کٹی ہوئی فصل کے گھٹے بنا کر اوپر سے ڈال دیتے ہیں، ٹھیک ویسے ہی جیسے آٹا پیسنے والی مشین میں غلہ اوپر سے ڈال دیا جاتا ہے۔ اس دوسری قسم کے تھریشر میں یہ امکان ہی نہیں کہ ہاتھ کو مشین پکڑلے۔

ہر سال اخباروں میں تھریشر سے ہاتھ کٹنے کی خبریں چھپتی ہیں۔ مگر تعجب ہے کہ ہندستانی مشینوں کا طرز ابھی تک بدلا نہیں گیا۔

ہم لوگ بستی میں چل رہے تھے کہ ایک عورت گود میں ایک بچہ لیے ہوئے سامنے آئی۔ اس نے مولانا عبدالرحیم صاحب بڈیڈوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: میری بہن کو خون کٹ رہو ہے، اس کو نکّس بنا دے (میری لڑکی کو خون کی پیچش ہو رہی ہے، اس کے لیے تعویذ لکھ دو)

میوات کا سب سے بڑا مسئلہ اس کی جہالت ہے۔ یہاں کے بیشتر لوگ ناخواندہ یا نیم خواندہ ہیں۔ اس کی وجہ سے یہاں کی زندگی میں رسوم اور توہمات کا اتنا غلبہ ہے کہ اس کے نیچے میوؤں کی پوری زندگی دب کر رہ گئی ہے۔ خاص طور پر عورتیں تو بالکل ہی ان پڑھ ہیں۔ شاذونادر ہی ایسی عورتیں ملیں گی جو ایک خط بھی لکھ سکتی ہوں۔ علم کی اہمیت زندگی میں جتنی زیادہ ہے، میوؤں کے یہاں اس کی اہمیت اتنی ہی کم نظر آتی ہے۔

گلپاڑہ قصبہ کی تقریباً تمام دوکانیں دوسری اقوام کی ہیں۔ مسلمانوں کی کوئی ایک بھی قابل ذکر دوکان نہیں۔ صبح کے وقت میں قصبہ کے اندر سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ دکاندار اپنی دکان کے سامنے بیٹھے ہوئے ہندی اخبار پڑھ رہے ہیں۔ جب کہ میوؤں کے لیے اخبار پڑھنا ابھی تک ایسا ہی ہے جیسے چاند پر سفر کرنا۔ اسی بے علمی کی وجہ سے میو تجارتوں میں داخل نہ ہو سکے اور زراعت (زمینداره) جس میں ان کے تمام مرد و عورت اور چھوٹے بڑے لگے رہتے ہیں، ان میں بھی وہ زیادہ ترقی نہ کر سکے۔ تاہم پچھلے اسفار کے مقابلہ میں اس بار مجھے کئی میو زمیندار کے یہاں ٹریکٹر اور ٹیوب ویل نظر آیا جو کہ پہلے نایاب تھا۔ میو ترقی کر رہے ہیں۔ مگر اس کی رفتار اتنی کم ہے کہ خورد بینی مشاہدہ کے ذریعہ ہی اس کو

دیکھا جاسکتا ہے ۔

پورے میوات میں سڑک اور بجلی کی وجہ سے کام کی نئی صورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ بہت سے مقامات جہاں پہلے ویرانہ تھا۔ لوگ ان کو بھوت کی جگہ سمجھتے تھے، وہاں اب پر رونق بازار بن گیے ہیں ۔ مگر ان میں میووں کا کوئی قابل مشاہدہ حصہ نہیں ۔

میوات کے دیہاتوں کا نقشہ اب بھی تقریباً وہی ہے جو ۲۰ سال پہلے تھا۔ اونچے نیچے راستے، مٹی کی دیواروں کے اوپر چھپر۔ ہم ایک میو کے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک طرف سرسوں کے ڈنٹھل سے کھانا پک رہا ہے۔ دوسری طرف بیل بندھے ہوئے بول و براز کر رہے ہیں۔ ایک کنارے دو عورتیں "مشین" چلا کر چارہ کاٹ رہی ہیں۔ غرض رہائش سے لے کر گھرہستی تک جتنے لوازم ہیں، سب ایک غیر منصوبہ بند احاطہ کے اندر موجود تھے۔ اور اس کا نام مکان تھا۔ آپ کو ایسے میو ملیں گے جن کے گھروں میں بجلی کے بلب لٹک رہے ہوں گے۔ مگر بلب روشن ہو کر جب چاروں طرف کے ماحول کو دکھائے گا تو آپ سوچیں گے کہ وہ یہاں شاید اس لیے روشن ہوا ہے کہ آپ کو بتائے کہ میو لوگ دور جدید کے عین وسط میں بھی دور قدیم کی زندگی گزار رہے ہیں ۔

میوات میں آپ سنیں گے کہ فلاں مسلمان عورت کا نام "بسکر" ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی میو کے یہاں جب مسلسل کئی لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں تو وہ اپنی آخری لڑکی کا نام بسکر رکھ دیتا ہے۔ یعنی اے خدا، اب بس کر، اور مزید لڑکی نہ پیدا کر۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر لڑکی کا نام "بس کر" رکھ دیا تو اس کے بعد یہ سلسلہ بس ہو جائے گا اور پھر جو اولاد پیدا ہوگی وہ نرینہ اولاد ہوگی ــــــ یہ وہی ذہن ہے جس کے تحت مہذب قسم کے لوگ اپنی لڑکی کا نام بشریٰ رکھ دیتے ہیں ۔

قریبی مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ ایک شخص نے پوچھا: کون صاحب اذان دے رہے ہیں۔ جواب دینے والے نے کہا "پلٹو"۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں کثرت سے اس طرح کے عجیب و غریب نام ہوتے ہیں ۔ اس کی وجہ تسمیہ مجھے یہ بتائی گئی کہ میووں میں یہ رواج ہے کہ ایک لڑکا مر جائے، اس کے بعد ولادت ہو اور دوبارہ لڑکا پیدا ہو تو ایسے لڑکے کا نام

پلٹا یا پلٹو رکھ دیتے ہیں۔ یعنی بدلہ۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا نے دوسرا لڑکا بدلہ میں دیدیا۔ اسی طرح اور بھی بہت سے عجیب عجیب نام سنائی دیئے۔ مثلاً یہاں تین بھائی ہیں جن کے نام یہ ہیں: سکاری، لنکاری، بیکاری۔ وغیرہ

ایک مقام پر ہماری بس میں میواتی عورتوں کا ایک جھنڈ سوار ہوا۔ بتانے والے نے بتایا کہ یہ لوگ "فاتحہ خوانی" میں شرکت کرکے آرہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میوات میں رسموں کا رواج بہت ہے اور اب اس میں ایک مادی پہلو بھی شامل ہوگیا ہے۔ اس نے پرانی رسموں میں نئی طاقت عطا کر دی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مثلاً موت کے بعد فاتحہ کرنا۔ کچھ "دیوبندی" حضرات نے فاتحہ کو ختم کرنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ میو لوگ کہتے ہیں کہ ہم کیا کریں۔ ہم خود ان رسوم کو پسند نہیں کرتے۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ جب ایک موت ہو جاتی ہے تو مہینوں تک رشتہ دار لوگ تعزیت کے لیے آتے رہتے ہیں اور مہمان داری اور خاطر تواضع کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ فاتحہ کرنے میں یہ فائدہ ہے کہ ایک تاریخ کو سب لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور ایک ہی دن دے کر یا کھلا پلا کر چھٹی ہو جاتی ہے۔

تعزیت اور پرسہ کی موجودہ رسم خود قابلِ ترک ہے۔ مگر ایک قابلِ ترک کو ترک نہ کرنے کے لیے ایک اور قابلِ ترک کو اختیار کرنا پڑا۔

میوات میں کافی ذہین لوگ پیدا ہوئے ہیں، اگرچہ بے علمی کی وجہ سے ان کی ذہانت اپنے لیے کوئی بڑا استعمال نہ پاسکی۔ اس کا اندازہ یہاں کی کہاوتوں اور اشعاروں سے ہوتا ہے جو کسی نے کہے تھے اور اب وہ عوام میں رائج ہیں۔ مثلاً کسی قدیم میو شاعر کا ایک شعر یہ ہے:

دھنمت کے کانٹو لگے سبھی لگاواں ہات　　نردھن کے کانٹو لگے کوئی نہ پوچھے بات

یعنی دولت مند کو کانٹا چبھ جائے تو ہر ایک اس کا حال پوچھتا ہے، غریب آدمی کو کانٹا چبھ جائے تو کوئی اس کا حال دریافت نہیں کرتا۔ ایک صاحب نے یہ شعر بتاتے ہوئے کہا: آج یہ حال ہے کہ بڑا آدمی ہے تو اس کے کھلانے پلانے میں زبردست اہتمام ہوگا، اور غریب آدمی کو صرف معمولی کھانا کھلایا جائے گا۔ لڑکی امیر کے گھر جارہی ہے تو بہت زیادہ جہیز دیا جائے گا۔ اور اگر لڑکی غریب کے گھر جارہی ہے تو معمولی جہیز دے کر رخصت کردیا جائے گا۔ حتی کہ کسی مدرسہ میں شاندار

عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں تو اس کو خوب چندہ ملے گا، اور کوئی مدرسہ چھپروں میں ہو تو اس کو کوئی چندہ دینے والا نہیں۔ یہی حال زندگی کے تمام معاملات کا ہے۔

میوات میں ایک مثل ہے کہ دو آدمیوں نے طے کیا کہ وہ مل کر گنا بوئیں گے اور جب گنا تیار ہو جائے گا تو اس کو توڑیں گے۔ اب ایک شخص نے کہا کہ "میں گنا توڑوں گا کڑاک سے۔" دوسرے شخص نے کہا: "میں بھی توڑوں گا کڑم کڑاک سے۔" یہ سن کر پہلے شخص نے کہا کہ میں نے تو ایک گنا توڑا تھا، تم نے دو توڑ لیے۔ اس پر تکرار ہوئی، یہاں تک کہ دونوں آپس میں لڑ گیے۔

یہ مثل میووں کی کہانی بھی ہے اور عام مسلمانوں کی کہانی بھی۔ اس وقت تمام مسلمانوں کا حال یہی ہے کہ کرنے کا کام تو کوئی نہیں کرتا۔ البتہ کیا کام کرنا ہے، اس پر خوب بحثیں ہو رہی ہیں۔ گویا گنے کی فصل تو اگائی نہیں گئی، اور گنے کی حصہ داری پر لڑائیاں جاری ہیں۔ بحث میں ہر آدمی آگے ہے، مگر عمل میں ہر آدمی پیچھے۔

گلپاڑہ میں ایک میو حاجی مُل خاں نام کے تھے۔ ۱۹۷۸ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس سے پہلے ان سے میری ملاقات ہو چکی ہے۔ وہ نہایت سنجیدہ اور نیک آدمی تھے۔ موجودہ سفر میں ان کے صاحبزادے فیروز خاں سے ملاقات ہوئی۔ اسی کے ساتھ حاجی صاحب مرحوم کے بھتیجے (ملھو) کے لڑکے فجر الدین عرف فجرو بھی ملے۔ یہ لوگ اپنی سادگی، خاموش طبعی اور دینی مزاج کے معاملہ میں حاجی مُل خاں مرحوم کی تصویر ہیں۔

گلپاڑہ سے رسول پور تقریباً تین کیلومیٹر کے فاصلہ پر اندر کی طرف ہے۔ یہاں سڑک نہیں۔ میں اندرون میوات کا نقشہ دیکھنے کے لیے یہاں جانا چاہتا تھا۔ یہ فاصلہ ٹریکٹر کے ذریعہ طے کیا۔ چونکہ اس موسم میں بارشیں بہت کم ہوتی ہیں۔ اس لیے سارا راستہ گرد کی دلدل بنا ہوا تھا۔ ٹریکٹر کو فیروز خاں اور فجر الدین چلا رہے تھے۔ وہ ایک پرشور مشین کے خاموش ڈرائیور تھے۔ یہ سفر اس طرح طے ہوا کہ کپڑے گرد میں اَٹ رہے تھے۔ گدی کے بجائے لوہے پر نشست تھی اور مسلسل ہچکولے اس کے علاوہ تھے۔

میرا خیال ہے کہ ہر وہ شخص جس نے کار کی سواری کی ہے اس کو ٹریکٹر کی سواری بھی کرنا چاہیے۔ اسی طرح ہر شخص جو ٹریکٹر پر بیٹھا ہے اس کو کار پر بیٹھنا چاہیے۔ ان دونوں سفروں کا

تقابل ایک عظیم دینی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اتنا موثر ہے کہ اس سے زیادہ موثر میرے علم میں کوئی دوسری چیز نہیں۔

جس آدمی نے بھی دونوں چیزوں کی سواری کی ہے، وہ جانتا ہے کہ ٹریکٹر کے ذریعہ اگر سفر کیا جائے تو منزل پر آدمی اس طرح پہونچتا ہے کہ وہ تھک چکا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس آدمی جب ایک اچھی کار پر سفر کرتا ہے تو وہ اپنی منزل پر بالکل تر و تازہ اترتا ہے۔ اس فرق کا سبب یہ ہے کہ کار کے پہیوں کے ساتھ جھٹکے کو سہنے والا پرزہ (Shock absorber) لگا ہوا ہوتا ہے، جب کہ ٹریکٹر کے اندر ایسا پرزہ نہیں ہوتا۔ گویا ٹریکٹر وہ سواری ہے جو اپنے اوپر آنے والے جھٹکوں کو مسافر تک پہنچاتی رہتی ہے، جب کہ کار وہ سواری ہے جو جھٹکوں کو خود اپنے آپ پر سہہ لیتی ہے، وہ ان کو مسافر تک پہنچنے نہیں دیتی۔

لوگوں کے درمیان زندگی گزارتے ہوئے اکثر غصہ اور انتقام کے جذبات دل کے اندر پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں مومن کو کیا کرنا چاہیے۔ مومن کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ اس قسم کے تمام نفسیاتی جھٹکوں کو خود اپنے اوپر سہے، وہ ان کو دوسرے شخص تک نہ جانے دے۔ وہ لوگوں کے درمیان کار کی طرح رہے نہ کہ ٹریکٹر کی طرح۔

رسول پور میں مختلف لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ عبدالرشید عرف دھنوتالی اور عبدالرحیم عرف خردل سیدھے سادے میواتیوں کا مکمل نمونہ نظر آئے۔ کار اور ٹریکٹر کے مذکورہ فرق کو شاید وہ شعوری طور پر نہ جانتے ہوں۔ مگر فطرت کے زور پر عملاً وہ اسی قسم کی زندگی گزار رہے ہیں۔ حدیث کے الفاظ میں، ان کے طریق زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ دوسروں کو نفع پہنچاؤ اور اگر نفع نہ پہنچا سکو تو ان کو اپنے نقصان سے بچاؤ۔

دہلی جیسے شہر میں مشکل ہی سے کبھی آسمان اپنے قدرتی نیلے رنگ میں دکھائی دیتا ہے۔ یہاں کی کھلی فضا میں آسمان اپنے اصل نیلے رنگ میں دکھائی دیا۔ آسمان کا یہ رنگ جو مختلف طبیعی اسباب سے پیدا ہوتا ہے، اتنا زیادہ جاذب نظر ہے کہ آسمان کے لیے اس سے زیادہ جاذب نظر رنگ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز اپنے آخری معیاری نمونہ پر ہے۔ خواہ ایک گھاس ہو یا ایک شیر یا اور کوئی چیز۔ کسی بھی چیز کا کوئی دوسرا اس

سے بہتر ماڈل تجویز نہیں کیا جا سکتا۔ مخلوقات کا معیار کمال پر ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کا خالق بھی آخری معیار کمال پر ہے۔ کامل خالق کے بغیر کامل تخلیق کا وجود ممکن نہیں۔

نیلے آسمان کے نیچے ابھری ہوئی پہاڑیاں، ہرے بھرے درخت، آکسیجن سے بھری ہوئی خالص ہوا فطرت کے اس حسین ماحول میں انسان اپنے آپ کو خدا کے بالمقابل محسوس کرنے لگتا ہے آج کل شہروں کے لوگ اپنے فرصت کے اوقات کو سینما اور ٹیلی ویزن کے ماحول میں گزارتے ہیں۔ اس کے برعکس انھیں اپنے فرصت کے اوقات کو شہر سے باہر فطرت کے ماحول میں گزارنا چاہیے۔ ”ٹیلی وژن“ آدمی کو دوبارہ مصنوعاتِ انسانی کی اسی دنیا میں گم کر دیتا ہے جس میں وہ اس سے پہلے گم تھا۔ اس کے برعکس کھلے ہوئے جغرافیہ کا ماحول آدمی کو مصنوعاتِ خداوندی کی دنیا میں پہنچا دیتا ہے، وہ دنیا جہاں انسان اور خدا آمنے سامنے ہو جاتے ہیں۔ جہاں آدمی اپنے رب سے ملاقات کرتا ہے۔ جہاں آدمی اپنے رب سے سرگوشیاں کرتا ہے۔ جہاں وہ ظواہر سے گزر کر حقیقت اعلیٰ کو پا لیتا ہے۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۸۷ کی صبح کو واپسی ہوئی۔ گلپاڑہ سے دوبارہ میں بذریعہ بس روانہ ہوا اور پہاڑی، بیواں، فیروزپور، نوح، سوہنا، گوڑگاؤں ہوتے ہوئے ۱۲ بجے دن میں دہلی واپس پہونچا۔

مذہب اور سائنس
مولانا وحید الدین خاں

ڈائری
1991-1993
مولانا وحید الدین خاں

تعمیرِ حیات

تعمیرِ انسانیت
انسانیت کی تعمیر میں اسلام کا حصہ
مولانا وحید الدین خاں

مطالعۂ قرآن
مولانا وحید الدین خاں

اسفارِ ہند
مولانا وحید الدین خاں

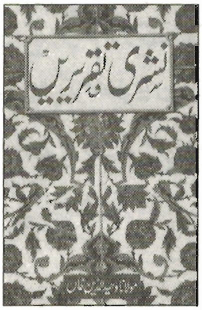
نشری تقریریں
مولانا وحید الدین خاں

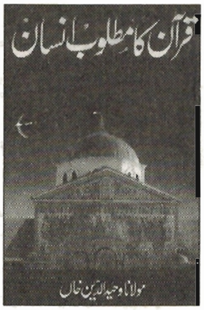
قرآن کا مطلوب انسان
مولانا وحید الدین خاں

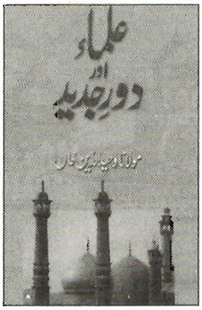
علماء اور دورِ جدید
مولانا وحید الدین خاں

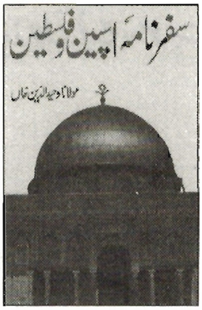
سفرنامہ اسپین و فلسطین
مولانا وحید الدین خاں

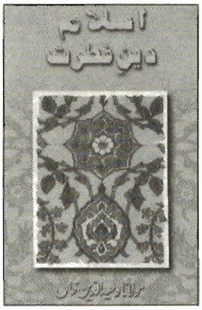
اسلام دینِ فطرت
مولانا وحید الدین خاں

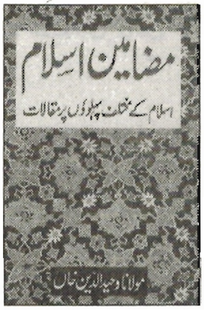
مضامینِ اسلام
اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مقالات
مولانا وحید الدین خاں

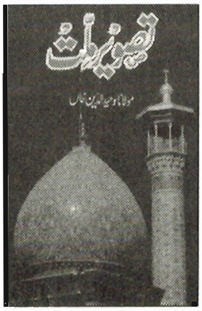
تصویرِ ملت
مولانا وحید الدین خاں

عظمت قرآن
مولانا وحید الدین خاں

ڈائری
جلد اول
1983-84
مولانا وحید الدین خاں

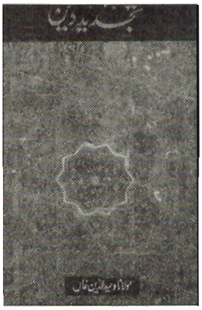
تجدیدِ دین
مولانا وحید الدین خاں

دعوتِ اسلام
مولانا وحیدالدین خاں

دین انسانیت
اسلام کا فکری اور علمی اور تاریخی مطالعہ
مولانا وحیدالدین خاں

اللہ اکبر
مولانا وحیدالدین خاں

اسلامی تعلیمات
مولانا وحیدالدین خاں
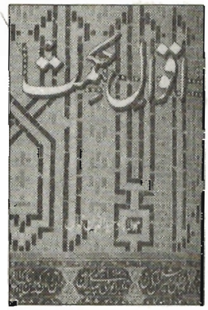
اقوالِ حکمت

قال اللہ
وقال الرسول
مولانا وحیدالدین خاں

اسلام
دورِ جدید کا خالق
مولانا وحیدالدین خاں
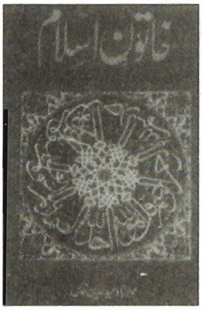
خاتونِ اسلام

سبق آموز واقعات
مولانا وحیدالدین خاں
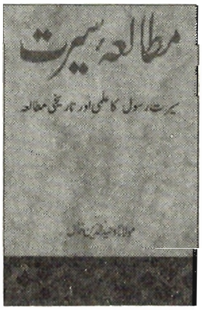
مطالعہ سیرت
سیرت رسول کا علمی اور تاریخی مطالعہ
مولانا وحیدالدین خاں

شتمِ رسول کا مسئلہ
قرآن و حدیث اور فقہ و تاریخ کی روشنی میں
مولانا وحیدالدین خاں
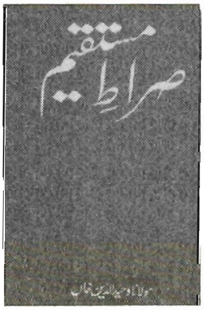
صراطِ مستقیم
مولانا وحیدالدین خاں
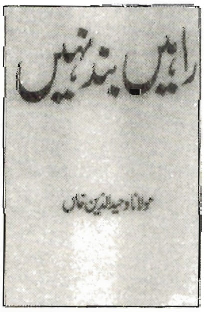
راہیں بند نہیں
مولانا وحیدالدین خاں

پیغمبرِ اسلام
مولانا وحیدالدین خاں

مذہب اور جدید چیلنج

اسلامی زندگی
احادیث اور آثار کی روشنی میں
مولانا وحیدالدین خاں

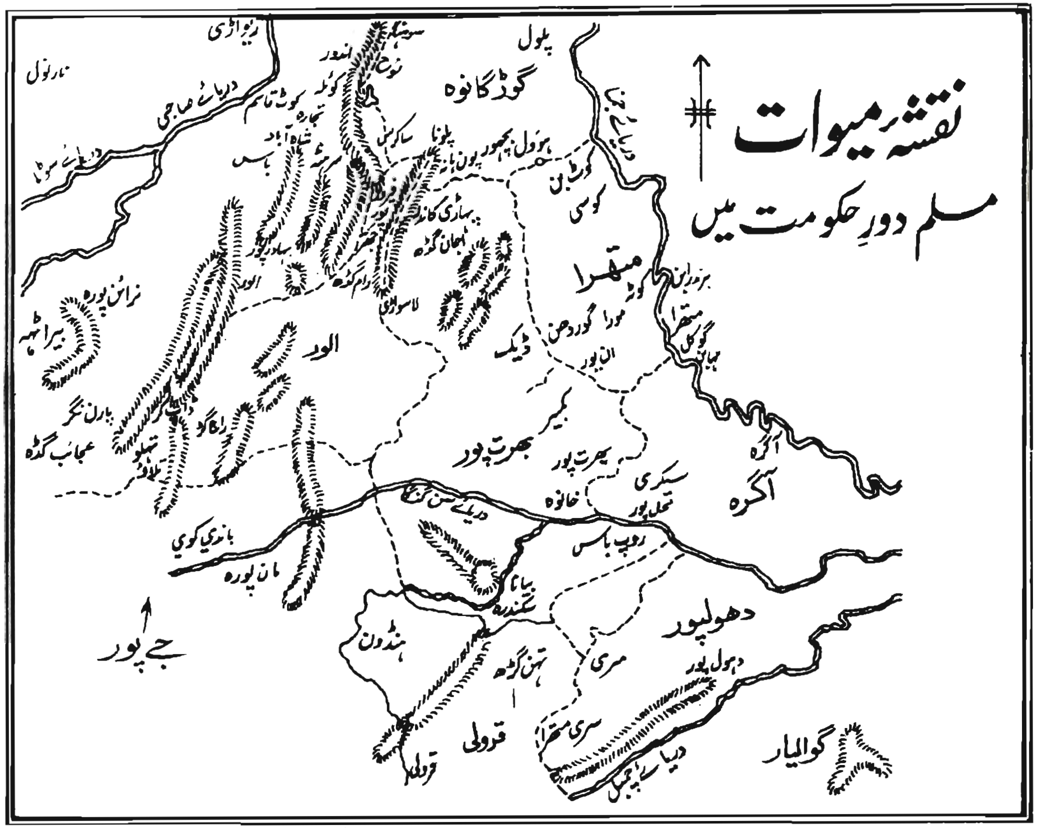

نقشہ میوات
مسلم دورِ حکومت میں
گوڑگانوہ
پلول
دریائے جمنا
کوسی
متھرا
آگرہ
بھرت پور
ڈیگ
الور
دھولپور
گوالیار
قرولی
ہنڈون
جے پور
نارنول
دریائے صاحبی
دریائے چمبل
بیانہ
خانوہ
روپ باس